فکشن ہاؤس کا کتابی سلسلہ (20)

پنجاب نمبر

ایڈیٹر: ڈاکٹر مبارک علی

مشاورتی بورڈ

قاضی جاوید

ڈاکٹر سید جعفر احمد

سعود الحسن خان

مجلّہ ''تاریخ'' کی سال میں چار اشاعتیں ہوں گی

خط و کتابت (برائے مضامین)

بلاک 1، اپارٹمنٹ ایف۔ برج کالونی، لاہور کینٹ

فون: 6665997

ای میل: .lena@brain.net.pk

خط و کتابت (برائے سرکولیشن)

پبلشرز	☜	فکشن ہاؤس
	☜	18-مزنگ روڈ لاہور
فون	☜	7249218-7237430
قیمت فی شمارہ	☜	100 روپے
سالانہ	☜	400 روپے
قیمت مجلد شمارہ	☜	150 روپے
بیرون ممالک	☜	2000 روپے (سالانہ معہ ڈاک خرچ)
		رقم بذریعہ بنک ڈرافٹ بنام فکشن ہاؤس لاہور، پاکستان
اہتمام	☜	ظہور احمد خاں
کمپوزنگ	☜	فکشن کمپوزنگ اینڈ گرافکس سنٹر لاہور
پرنٹرز	☜	حاجی حنیف پرنٹرز لاہور
سرورق	☜	عباس
تاریخ اشاعت	☜	جنوری 2004ء

فہرست

مضامین

تحقیق کے نئے زاویئے

نقطہ نظر

تاریخ کے بنیادی مآخذ

سفرنامہ بَن گڑھ

مصنف: رائے رایان آنند رام مخلص

ترجمہ وحواشی: سعود الحسن خان روہیلہ

ایک روشن دماغ تھا نہ رہا

حمزہ علوی کی یاد میں

حمزہ علوی

(1921-2003)

پروفیسر حمزہ علوی 10- اپریل 1921ء کو کراچی میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم سندھ مدرسہ اور ڈی۔ جے کالج میں حاصل کی۔ اس کے بعد واڈیہ کالج پونہ اور علی گڑھ یونیورسٹی میں اعلیٰ تعلیم کے لئے گئے (علی گڑھ یونیورسٹی سے اکنامکس میں ایم۔ اے کی ڈگری حاصل کی)۔

ملازمت کی ابتداء ریزروبنک آف انڈیا، بمبئی سے کی، تقسیم کے بعد پاکستان چلے آئے اور یہاں اسٹیٹ بنک آف پاکستان میں ملازمت کی۔ 1953ء میں اسٹیٹ بنک کی ملازمت چھوڑ کر تنزانیہ چلے گئے جہاں کچھ عرصہ کاشتکاری کی۔ لیکن اس میں دل نہ لگا، اور مزید تعلیم حاصل کرنے کے لئے لندن چلے گئے جہاں وہ سیاسی سرگرمیوں میں حصہ لینے لگے مگر ساتھ ہی میں انہوں نے معیشت، سوشیولوجی اور انتھراپولوجی میں تحقیق کی اور اکیڈمی سرکل میں اپنے خیالات کی وجہ سے شہرت حاصل کی۔ انہوں نے بحیثیت استاد کے، سے سِکس، لیڈز، مانچسٹر، کیلی فورنیا، ڈینور اور مشی گن یونیورسٹیوں میں پڑھایا۔

وہ جنرل آف کن ٹم پوریری ایشیا (Journal of Contemporary Asia) اور جنرل آف پے زینٹ اسٹڈیز (Journal of Peasant Studies) کے بانی رکن تھے۔

اردو میں ان کے مضامین کے تراجم سہ ماہی تاریخ میں شائع ہوتے رہے۔ ادارہ فکشن ہاؤس نے ان کی دو کتابیں ''جاگیرداری اور سامراج'' اور ''پاکستان: ریاست اور اس کا بحران'' شائع کی ہیں۔

وہ سہ ماہی تاریخ کے ایڈوائزری بورڈ کے رکن تھے۔ ان کی وفات یکم دسمبر 2003ء کو کراچی میں ہوئی۔

تاریخ کانفرنس

سہ ماہی تاریخ اور فکشن ہاؤس کی جانب سے پانچویں تاریخ کانفرنس 12-اکتوبر 2003ء کو نیشنل کالج آف آرٹس کے آڈیٹوریم میں منعقد ہوئی۔ اس شمارے میں وہ مقالات شامل ہیں کہ جو اس کانفرنس میں پڑھے گئے۔ مقالہ نگاروں میں زبیر شفیع غوری، اشفاق سلیم مرزا، قاضی جاوید، غافر شہزاد، ندیم عمر، پرویز وندل، طاہر کامران اور رضوان عظیم شامل تھے۔

ڈاکٹر مبارک علی
جنوری 2004ء
لاہور

سٹیج پر افضل مسعود، ڈاکٹر مبارک علی، حیدر جاوید سید، اشفاق سلیم مرزا اپنا مقالہ پڑھتے ہوئے

مضامین

خطبہء استقبالیہ

ڈاکٹر مبارک علی

ماضی کے بارے میں جاننے کا تجسس اور شوق تقریباً ہر ایک ہی کو ہوتا ہے۔ اس لئے تاریخ یہ فریضہ سرانجام دیتی ہے کہ وہ ماضی کی تشکیل کرے اور اس کی معلومات فراہم کرے۔ اگر کسی معاشرے میں طاقت و اقتدار چند گروہوں اور جماعتوں کے پاس ہوتا ہے تو اس صورت میں تاریخ ان کی نمائندگی کرتے ہوئے خود کو محدود کر لیتی ہے۔ لیکن اگر اختیارات معاشرے کے اداروں میں پھیل جاتے ہیں اور طاقت کسی ایک فرد یا ادارے میں سمٹ کر نہیں رہتی ہے تو اس صورت میں تاریخ کا دائرہ کار بھی بڑھ جاتا ہے اور وہ معاشرے کی اکثریت کی نمائندگی کرنے لگتی ہے۔ اس ضمن میں اگر ہم اپنے معاشرے کا جائزہ لیں تو اندازہ ہوتا ہے کہ ہمارے ہاں تاریخ اس لئے ایک محدود اور پابند دائرے میں ہے کیونکہ طاقت و اقتدار بھی چند طبقوں اور اداروں کے پاس ہے۔ اب ہم بادشاہوں اور حکمرانوں کے بجائے فوج، جاگیرداروں، اور بیوروکریسی کی تاریخ لکھتے اور پڑھتے ہیں۔ اس تاریخ سے عوام اور ان کے رول کو نظر انداز کر دیا جاتا ہے۔

اس کے بعد دوسرا اہم سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ہمارے پاس وہ کون سے ذرائع ہیں کہ جو ہمیں تاریخی معلومات فراہم کرتے ہیں۔ ان میں اولین طور پر ہم داستانوں کا ذکر کرتے ہیں کہ جن میں نیم تاریخی قصے و واقعات کو خوبصورت اور دلنواز انداز میں بیان کیا جاتا ہے۔ الف لیلیٰ اگرچہ ایک داستان ہے، مگر اس میں عہد عباسیہ کی سماجی اور ثقافتی تاریخ جھلکتی ہے۔ راجہ بکر ماجیت کی کہانیاں، گپت خاندان کے اس حکمراں کے عدل و انصاف سے بھرپور ہیں۔ داستانوں کے

ذریعہ لوگوں میں ماضی سے آگہی تو ہوتی ہے، مگر یہ آگہی حقائق پر مبنی واقعات پر نہیں ہوتی ہے، بلکہ اس میں تفریح کا پہلو ہوتا ہے، اور ساتھ ہی ان خواہشات کی عکاسی کہ لوگ خوش حال اور امن و آشتی کی زندگی گزارنا چاہتے ہیں۔

انہیں داستانوں نے آگے چل کر تاریخی ناولوں کی شکل اختیار کر لی۔ اردو میں اس صنف کو مقبولیت دینے میں عبدالحلیم شرر کا بڑا حصہ ہے۔ ان ناولوں کے لئے انہوں نے ایک فارمولا وضع کیا تھا کہ جس میں مسلمانوں اور کافروں میں جنگ ہوتی تھی، مسلمان ہیرو، عیسائی حسینہ سے آخر میں شادی کر کے ناول کا طربیہ کے انداز میں اختتام کرتا تھا۔ ان کے ناولوں کے پس منظر کو دیکھا جائے تو اندازہ ہوتا ہے کہ یہ وہ زمانہ ہے کہ جب ہندوستانی مسلمان اپنی سیاسی طاقت و اقتدار عیسائیوں کے مقابلہ میں کھو چکے تھے۔ اب اس فتح کو ناولوں کے اندر اور ماضی میں ہی حاصل کیا جا سکتا تھا۔ ان ناولوں کی مقبولیت سے اندازہ ہوتا ہے کہ اس عہد کے مسلمان تعلیم یافتہ طبقہ کو انہوں نے کافی ذہنی سکون مہیا کیا تھا۔

شرر کے اس اسلوب کو آگے چل کر صادق صدیقی سردھنوی نے اختیار کیا اور تقریباً 150 ناول لکھ کر اپنے زمانہ میں مقبولیت حاصل کی۔ یہ اسلوب آج بھی مختلف تاریخی ناول اور افسانے لکھنے والوں میں پسندیدہ ہے اور ان کی تحریریں ڈائجسٹوں اور رسالوں میں چھپ کر بڑی تعداد میں پڑھی جاتی ہیں۔

تاریخی ناول نگاری میں اس اسلوب سے ہٹ کر جنہوں نے ایک نئے انداز کو اختیار کیا وہ نسیم حجازی تھے۔ ان کے ناولوں میں جہاں ایک طرف فتوحات و کامیابیاں ہیں، اس کے ساتھ ساتھ ہی اسلامی معاشرے کے زوال کا المیہ بھی ہے۔ اس کے علاوہ انہوں نے تقسیم ہند کے اثرات پر بھی لکھا اور مسلمانوں اور عیسائیوں کے ساتھ ساتھ ہندو دشمنی کو بھی اجاگر کیا۔

ان تاریخی ناولوں سے جو تاریخی شعور حاصل ہوتا ہے، وہ یہ کہ قوموں کی کامیابی و فتح مندی کے لئے فوجی قوت و طاقت کا ہونا لازمی ہے۔ اس کے ساتھ اگر دینی حمیت و غیرت ہو تو مسلمانوں کے آگے کوئی نہیں ٹھہر سکتا۔ مسلمان معاشرے کا زوال اس لئے ہوا کہ وہ دین سے دور ہوئے، آپس میں فرقہ بندی کے ذریعہ اتحاد کو کھویا، جس کی وجہ سے بالآخر عیسائیوں، یہودیوں، اور ہندوؤں کی سازشوں میں گھر کر تباہ ہو گئے۔ یہ وہ تاریخی شعور ہے کہ جو معاشرے کے اکثر لوگوں

کے ذہن میں سرایت کئے ہوئے ہے۔

تاریخی معلومات کا ایک اور ذریعہ فلم اور ڈرامہ ہے۔ اب تک جو تاریخی فلمیں بنائی گئی ہیں، ان میں سوائے چند کے جن میں سہراب مودی کی سکندر اور جھانسی کی رانی قابل ذکر ہیں، باقی فلموں کی کہانیوں کا تعلق تاریخی حقائق سے نہیں ہے بلکہ زیب داستاں کے لئے کہانی نویس نے واقعات کو بھی مسخ کیا اور حقائق سے بھی روپوشی کی۔ اس کی ایک مثال انارکلی کا ڈرامہ ہے، جس کی تاریخی حیثیت تو کوئی نہیں، مگر عوام میں اس کی مقبولیت کے کئی اسباب ہیں۔ کیونکہ اس میں ایک کنیز کی بغاوت اور ایک حکمراں کا جبر ہے۔ اکبر جو کہ تاریخی حیثیت میں ایک روشن خیال حکمراں تھا اس میں ایک تنگ نظر اور ظالم کے روپ میں اُبھرتا ہے۔ شاید اس کے کردار عوام کے جذبات کی نمائندگی کرتے ہیں، اسی لئے وہ انہیں پسند کرتے ہیں۔ یہ تاریخی شعور، اس فرضی تاریخ پر ہوتا ہے کہ جو تخیل کی پیداوار ہوتی ہے اور جس میں جذبات و احساسات کو اُبھار کر اس سے کمرشل فوائد حاصل کئے جاتے ہیں۔

تاریخی شعور پیدا کرنے میں شاعری کا بھی بڑا دخل ہے۔ اردو میں الطاف حسین حالی کی ''مد وجذر اسلام'' اس کی ایک عمدہ مثال ہے۔ اس میں مسلمانوں کے عروج کی داستان بھی ہے تو ان کے زوال کا المیہ بھی۔ شبلی نے کچھ نظموں کے ذریعہ مسلمانوں کے دورِ حکومت کی شان و شوکت کو اجاگر کیا، تو اقبال کے ہاں ماضی کی عظمت جگہ جگہ ان کے اشعار میں دلوں کو گرماتی نظر آتی ہے۔ حفیظ جالندھری کی ''شاہنامہ اسلام'' کو بھی اسی زمرے میں شامل کیا جا سکتا ہے۔ شاعری کے ذریعہ جس تاریخ کی تشکیل کی گئی، اور اس سے جو تاریخی شعور اُبھرا، اس میں دورِ عروج کی عظمت سے فخر کے جذبات پیدا ہوتے ہیں، تو زوال ایک المیہ کی شکل میں اُبھر کر آتا ہے جو بے بسی اور مجبوری کو ظاہر کرتا ہے۔ لیکن یہ تاریخی شعور کوئی ایسا راستہ نہیں نکالتا کہ جس کے ذریعہ زوال کے چکر سے آزاد ہوا جائے۔ یہ یا تو دعاؤں پر ختم ہوتا ہے، یا خدا سے شکایتوں پر۔

تاریخ نویسی میں اس وقت تبدیلی آئی کہ جب مغربی تعلیم کے ذریعہ تحقیق کے فن کو سیکھا

گیا۔ یورپی تعلیم یافتہ مورخوں نے تو انگریزی کو اظہار کا ذریعہ بنایا، اور اردو میں مولوی ذکاء اللہ نے تاریخ ہند تو لکھی، مگر اس میں پرانے اسلوب کو برقرار رکھا، یعنی قدیم ماخذوں سے مواد کو اکٹھا کر دیا مگر اس کا تجزیہ نہیں کیا۔ محمد حسین آزاد، مولوی چراغ علی، اور شبلی، ان چند مورخوں میں سے ہیں، جنہوں نے اردو میں تاریخی موضوعات پر لکھا۔ اردو میں لکھنے والے اکثر مورخوں نے جب اسلامی تاریخ لکھی تو اسے عقیدت کے ساتھ، ثواب کی غرض سے لکھا۔ اس لئے ان کے ہاں تجزیہ اور تنقید کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔ حال ہی میں شائع ہونے والی کتاب ''تاریخ اسلام کا سفر'' مصنف سید علی اکبر رضوی کی کتاب کے بارے میں ایک ریویو میں کہا گیا ہے کہ

''سید علی اکبر رضوی کی کتاب بڑی عقیدتمندی سے لکھی گئی ہے۔'' لہٰذا جو تاریخ عقیدت مندی اور ثواب کی غرض سے لکھی جائے گی، اس سے پیدا ہونے والے تاریخی شعور کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔

لہٰذا صحیح تاریخی شعور کو پیدا کرنے، اور اسے اُبھارنے کے لئے ایسی تاریخ نویسی کی ضرورت ہے کہ جو تجزیاتی اور تنقید سے بھرپور ہو۔ ایک ایسی تاریخ کہ جو اہل اقتدار تک محدود نہ ہو، بلکہ اس کے دائرے میں پورا معاشرہ اور اس کے طبقے ہوں۔

تاریخ نویسی میں یہ بات بھی یاد رکھنے کے قابل ہے کہ اسے نئے مواد اور نئے خیالات و افکار کی روشنی میں بار بار لکھا جائے۔ اسکالرشپ کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ اسے برابر متحرک رہتے ہوئے آگے بڑھتے رہنا چاہئے۔ اگر تحقیق ایک جگہ ٹھہر کر رہ جائے گی تو اس کے ساتھ ہی تاریخی شعور بھی ٹھٹھر کر جامد ہو جائے گا۔ ہر نسل کو اپنے وقت اور تقاضوں کے تحت تاریخ کی نئی تعبیر اور تفسیر چاہئے ہوتی ہے۔ اس لئے تاریخ کو وقت اور زمانہ کے مطابق نئے انداز اور اسلوب میں ڈھالتے رہنا چاہئے۔

اسی کا احساس کرتے ہوئے کہ تاریخ نہ صرف معاشرے کی نفسیاتی ضرورتوں کو پورا کرتی ہے، بلکہ یہ سماجی داستاں اور معاشی مسائل کے بارے میں ادراک بھی دیتی ہے۔ 1998ء میں چند دوستوں نے مل کر یہ فیصلہ کیا کہ تاریخ پر ایک سہ ماہی جرنل شائع کیا جائے جس میں تاریخ اور

تاریخ نویسی کے بارے میں اپنے مضامین و مقالات شائع کئے جائیں کہ جن سے اس مضمون کی اہمیت کا احساس ہو۔ چنانچہ اس کا پہلا شمارہ فروری 1999ء میں شائع کیا۔ اس کے بعد سے اب تک پابندی سے اس کی اشاعت ہو رہی ہے، اور ہم اب تک اس کے 19 شمارے شائع کر چکے ہیں۔ اس کی اشاعت میں جن دوستوں نے تعاون کیا ان میں سعود الحسن خان، طاہر کامران، چوہدری ظہور، غافر شہزاد، ظفر علی خاں، پرویز وندل، قاضی جاوید، اور طارق عزیز سندھو قابل ذکر ہیں۔

تاریخ کے ان ہی شماروں میں پہلی مرتبہ حمزہ علوی کے مضامین کے تراجم شائع ہوئے، جو بعد میں ''جاگیرداری و سامراج'' اور ''پاکستان: ایک ریاست کا بحران'' میں کتابی شکل میں منظر عام پر آئے۔

اس کے ساتھ ہی یہ فیصلہ کیا کہ تاریخ کانفرنسوں کا سلسلہ شروع کیا جائے۔ چنانچہ پہلی تاریخ کانفرنس 15- اکتوبر 2000ء میں لاہور میں منعقد ہوئی۔ جس کا موضوع تھا ''پاکستان میں تاریخ نویسی کے مسائل''۔ اس کی صدارت حمزہ علوی نے کی۔ مقالات پڑھنے والوں میں عطیہ خان، قاضی جاوید، طاہر کامران، ندیم عمر اور مبارک علی تھے۔

دوسری کانفرنس 14- اکتوبر 2001ء میں لاہور میں ہوئی، اس کا موضوع ''لاہور شہر'' تھا۔ مقالات پڑھنے والوں میں سعود الحسن خان، سجاد کوثر، پرویز وندل، غافر شہزاد، ندیم عمر، اور مبارک علی تھے۔

تیسری کانفرنس 17- مارچ 2002ء کو ہوئی، اس کا موضوع ''پنجاب اور سکھ تاریخ'' تھا، اُس کانفرنس میں مضامین پڑھنے والوں میں قاضی جاوید، پرویز وندل، غافر شہزاد، عمر کمال خاں، طاہر کامران اور مبارک علی تھے۔

چوتھی کانفرنس 20- اکتوبر 2002ء میں حیدر آباد سندھ میں ہوئی، اس کا موضوع ''تاریخ سندھ'' تھا، اس میں مقالات پیش کرنے والوں میں تنویر جونیجو، اعجاز قریشی، پرویز وندل، قاضی جاوید اور مبارک علی تھے۔ ان کانفرنسوں میں پڑھے گئے مقالات تاریخ کے شماروں میں شائع کئے جاتے رہے۔

یہ پانچویں کانفرنس پنجاب کی تاریخ پر ہے۔ تاریخ کے جرنل کی اشاعت پر ہم نے اس خواہش کا اظہار کیا تھا کہ علاقائی تاریخ پر خصوصی توجہ دی جائے گی۔ مگر بدقسمتی سے ہمیں اس سلسلہ میں معیاری مضامین موصول نہیں ہوئے۔ ہمارا اپنا خیال ہے کہ پاکستان میں علاقائی تاریخ اہمیت کی حامل ہے، کیونکہ اس پر بہت کم تحقیقی کام ہوا ہے۔ اس سلسلہ میں جو مسائل ہیں وہ یہ کہ مرکزی حکومت اور مرکزی اداروں سے بیزار ہوکر، علاقائی نیشنل ازم کی جو تحریکیں اُبھریں انہوں نے تاریخ نویسی کو بھی متاثر کیا۔ نیشنل ازم کے تحت جب بھی تاریخ لکھی جاتی ہے تو اول اس میں ہیروز کو تلاش کیا جاتا ہے، دوئم علاقائی کلچر اور اس کی روایات کو زندہ کیا جاتا ہے۔ یہ دونوں عناصر بڑے نازک ہوتے ہیں۔ مثلاً کون سی شخصیتوں کو بطور ہیرو پیش کیا جائے؟ اگر یہ حکمراں، فوجی جرنل، امراء، اور بالادست طبقے سے تعلق رکھتے ہیں، تو اس سے فائدہ بھی یہی لوگ اور طبقے اٹھائیں گے۔ اسی طرح اگر علاقائی روایات کو بڑھا چڑھا کر پیش کیا جائے، تو اس میں بھی خطرہ ہے کیونکہ ہر روایت تو ترقی پسند اور روشن خیال نہیں ہوتی ہے۔ ان میں فرسودہ اور مسخ شدہ روایات بھی ہوتی ہیں کہ جن کو ختم کرنا ترقی کے لئے لازمی ہوتا ہے۔ لہٰذا علاقائی تاریخ نویسی میں ان اُلجھنوں کو دیکھنا ضروری ہے۔ اہم بات یہ بھی ہے کہ شخصیتوں کو ہیرو بناتے وقت ان کے کردار کا تجزیہ ضروری ہے۔ مثلاً سندھ میں جب راجہ داہر کو ہیرو قرار دیا گیا تو پنجاب میں پورو یا پورس کو ہیرو بنایا گیا۔ ہمارے پاس پورس کے بارے میں ساری معلومات یونانی مورخوں کے مواد پر ہیں۔ اس لئے اگر اس کا بغور تجزیہ کیا جائے کہ پورس نے سکندر سے کہا کہ ''میرے ساتھ وہی سلوک کرو کہ جو بادشاہ بادشاہ کے ساتھ کرتا ہے'' تو اس میں بڑائی سکندر کی ہے کہ جس نے فیاضی دکھاتے ہوئے اسے معاف کر [illegible] کہ وہ اس کا قیدی تھا۔ سکندر کی اس فیاضی اور دریا دلی کے لئے پورس کا جرأت [illegible] دما سروری تھا۔

پنجاب کی تاریخ کے سلسلہ میں ایک نکتہ پرویز وندل نے اٹھایا کہ جب عہد برطانیہ میں نہری کالونیز کے لئے مشرق پنجاب سے آبادکاروں کو لایا گیا، تو انہوں نے یہاں کے مقامی باشندوں کو ''جانگلی'' کہہ کر انہیں پس منظر میں دھکیل دیا۔ لہٰذا ضرورت اس بات کی ہے کہ یہ تجزیہ کیا جائے کہ ان لوگوں پر اس کے کیا اثرات ہوئے؟ اور اس تفریق نے معاشرے کو کیسے اور کس طرح متاثر

کیا؟

آخر میں، میں فکشن ہاؤس کا شکریہ ادا کروں گا کہ ان کے تعاون سے سہ ماہی تاریخ کی پابندی سے اشاعت ہو رہی ہے، اور ہر تاریخ کانفرنس میں ان کا تعاون شامل رہتا ہے۔ پاکستان میں شاید ان کی پہلی مثال ہے کہ جنہوں نے کتابیں شائع کرنے کے ساتھ ساتھ، علمی و ادبی سرگرمیوں کے فروغ میں عملی حصہ لیا۔

میں آپ سب لوگوں کا بھی مشکور ہوں کہ آپ نے اس کانفرنس میں شرکت کی۔

پیڑاں والی: دریائے راوی کی متروک گزرگاہ کے کنارے ایک ہڑپائی ٹیلہ

زبیر شفیع غوری

عظیم تر وادی سندھ کی تہذیب کے حوالے سے دریائے سندھ اور اس کے معاونین کو خصوصی اہمیت حاصل ہے۔ دریائے سندھ، راوی، بیاس اور ستلج کے کنارے زمانہء ماقبل تاریخ سے تعلق رکھنے والی کئی آبادیوں کے آثار سامنے آچکے ہیں۔ کوہستان نمک میں واقع کچھ آبادیوں کو دریائے جہلم جبکہ تھل کے صحرائی علاقے میں موجود بستیوں کو دریائے چناب سے منسوب کیا جا سکتا ہے۔ دریائے ہاکڑہ کے کناروں پر ملنے والی قدیم بستیوں کو چھوڑ کر پنجاب کے باقی حصوں میں اٹھاون کے قریب ایسے اثری ٹیلے دریافت ہو چکے ہیں جو ہاکڑہ، ابتدائی ہڑپائی، عروج یافتہ ہڑپائی یا متاخر ہڑپائی دور کے عکاس ہیں۔ سرائے کھولا اور وھواڈھیرہ کی نچلی تہیں ان ادوار سے قدیم تر یعنی Neolithic دور کی عکاسی بھی کرتی ہیں۔ مختصراً یہ کہ صوبہ پنجاب کی موجودہ حدود کے اندر دریائے سندھ کے کنارے تین، ٹیکسلا کے نواح میں پانچ، کوہستان نمک میں گیارہ، تھل میں سات، دریائے راوی کے کنارے بارہ جبکہ دریائے بیاس کی قدیم گزرگاہ کے ساتھ بیس قدیم آبادیوں کے آثار واقع ہیں۔ ان اثری ٹیلوں میں سے محض چار یعنی ہڑپہ، جلیل پور، سرائے کھولا اور ہتھیال میں کھدائی کے نتائج ہمارے سامنے آئے ہیں۔ جبکہ باقی تمام کے تمام ٹیلے ہنوز کسی باقاعدہ تحقیقی کاوش کے منتظر ہیں۔ اس حوالے سے فکر کی بات یہ ہے کہ ان ٹیلوں میں سے کئی نابود ہونے کے خطرے سے دوچار ہیں اور قوی امکان ہے کہ تخریب کے عناصر یونہی فعال رہے تو آنے

والے چند سالوں میں دس سے پندرہ ٹیلے ہماری نظروں سے اوجھل ہو جائیں گے۔ ٹیکسلا کے نواح میں ہتھیال، جنگ باھتر، پنڈ نوشہری، راوی کے کنارے کھڈاں والا، کچا پنڈ اور بیاس کے ساتھ چشتی والا، بھڑ کی، 18 ایم، 21 ایم، 27 ایم اور 29 ایم اس خطرے سے دوچار ٹیلوں کی اہم مثالیں ہیں۔ کوہستان نمک میں واقع زیادہ تر Sites بھی اسی فہرست میں آتی ہیں۔

یہ بات ذہن میں رہنی چاہئے کہ یہ ٹیلے زمانے ماقبل تاریخ کے انسان کی تہذیب اور تمدن کے مدفن ہیں۔ ان کا مطالعہ عمیق نظری اور قرینے سے کیا جائے تو یہ انسان سے اس طرح مخاطب ہوتے ہیں جس طرح ایک کتاب۔ یہ اپنے ماحول، باشندگان اور عروج و زوال کی کہانی بڑے بے لاگ اور بے باک انداز میں بیان کرتے ہیں۔ ان کا دائرہ کار بھی نہایت وسیع ہے۔ کتابوں کے برعکس یہ ہر طبقے اور ہر سطح کے لوگوں کا ماجرا سناتے ہیں اور اپنی رہت سہت کے مختلف پہلوؤں پر اس طرح روشنی ڈالتے ہیں کہ رائج الوقت نظریات کے تحت لکھی جانے والی کتابیں ان سے ہمسری کا دعویٰ نہیں کر سکتیں۔

آج کی گفتگو کے حوالے سے دریائے راوی کی متروک گزرگاہ کے کنارے واقع ایک اہم اثری ٹیلے ''پیڑاں والی'' کا انتخاب کیا گیا ہے۔

یہ اہم اثری ٹیلہ ننکانہ صاحب، شاہ کوٹ روڈ پر ننکانہ سے شاہ کوٹ کی جانب جاتے ہوئے تقریباً نو کلومیٹر کے فاصلے پر بجانب جنوب مغرب برلب سڑک واقع ہے۔ شاہ کوٹ سے اس کا فاصلہ 19 کلومیٹر کے قریب ہے۔ پختہ سڑک کے بالکل ساتھ ہونے کی وجہ سے کسی بھی موسم میں اس تک رسائی ممکن ہے۔ عرض بلد "30 '28 31 اور طول بلد "37'00 73 پر واقع اس ٹیلے کو پیڑاں نامی ایک سکھ عورت کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے جس نے نواح میں آباد گاؤں پیڑاں والی میں ایک باؤلی تعمیر کرائی اور اس کار خیر کے حوالے سے امر ٹھہری۔ بعہد حاضر یہ ٹیلہ مشترکہ کھاتے میں شامل ہے اور اس کے تقریباً نصف حصے پر ایک مسلم قبرستان بنایا گیا ہے۔

ٹیلہ اندازاً 14/5 ایکڑ رقبے کا احاطہ کرتا ہے۔ بتدریج اونچائی کی طرف مائل ہوتے ہوئے یہ اپنے بلند ترین مقام پر 13/14 فٹ کی اونچائی تک پہنچتا ہے۔ ٹیلے کی چہار جانب آباد رقبے ہیں اگرچہ شمالی جانب پختہ سڑک مزروعہ زمینوں اور اس کے درمیان حائل ہو جاتی ہے۔ جہاں تک ٹیلے کا تعلق ہے شمالی سمت سے لے کر اس کا تقریباً نصف حصہ قبرستان پر مشتمل ہے اور یہی وہ حصہ ہے

جو ٹیلے کا مطالعہ کرتے ہوئے بالعموم سب سے پہلے اس حوالے سے توجہ اپنی طرف مبذول کراتا ہے کہ عہد ماقبل تاریخ کے گلی کوزہ جات کے جو ٹکڑے قبور پر اس غرض سے رکھے گئے ہیں کہ بارشوں کے موسم میں ان کی مٹی بہنے سے محفوظ رہے ان کے مطالعہ کے نتیجے میں بعض اتنے خوبصورت اور اہم سفالی ٹکڑے سامنے آتے ہیں جن کا دستیاب ہونا، باقاعدہ کھدائی کئے بغیر، تقریباً ناممکن ہے۔

ٹیلے کی سطح سے ملنے والی پاٹری اگرچہ ہاکڑہ، کوٹ ڈجی اور ہڑپائی ادوار کی عکاس ہے لیکن سب سے زیادہ ملنے والی ٹھیکریاں کوٹ ڈیجی دور سے متعلق ہیں۔ ان میں بناوٹ اور سجاوٹ کے لحاظ سے ایسی دیدہ زیب ٹھیکریاں دستیاب ہوتی ہیں کہ دست کار کے ہنر کی داد بے ساختہ دینے کو دل چاہتا ہے جس نے اپنے خون جگر کو کوزہ گری کی نذر کر دیا۔

ٹیلے کا جنوبی اور جنوب غربی حصہ اپنی اصل حالت میں موجود ہے۔ اس کی سطح کا عمومی مشاہدہ کرنے اور بارشوں کے نتیجہ میں پڑنے والی دراڑوں کا خصوصی مطالعہ بڑا دلچسپ اور فائدہ مند ثابت ہوسکتا ہے کیونکہ بعض چھوٹی چھوٹی مگر اہم اشیاء ملنے کا امکان ان دراڑوں میں نسبتاً زیادہ ہوتا ہے۔ ایک چھوٹا یا بڑا کراس سیکشن مہیا کرنے والی ان دراڑوں کا مطالعہ اس حوالے سے بھی اہم ہوتا ہے کہ باقاعدہ کھدائی کئے بغیر سطحی مطالعے کے دوران ایک یا زائد تہوں کو اپنی اصل حالت میں دیکھنے کا موقع مل جاتا ہے۔

ہڈیوں کی خاصی بڑی تعداد جنوب غربی حصے میں بکھری نظر آتی ہے۔ گمان ہے کہ یہ حصہ دریا کی گزرگاہ کے قریب ہونے کی وجہ سے شکار کرنے والوں کے لئے اپنے شکار سے لطف اندوز ہونے کے بعد باقیات تلف کرنے اور اوزار وغیرہ صاف کرنے کی غرض سے استعمال ہوتا ہوگا۔ یہ رائے اس وجہ سے بھی تقویت پاتی ہے کہ دریا کی متروک گزرگاہ کے کنارے مارٹن پور کے اثری ٹیلے پر بھی ہڈیوں کے حوالے سے یہی صورت حال دیکھنے میں آتی ہے۔ بہرحال حتمی رائے اسی وقت قائم کی جاسکتی ہے جب ان ہڈیوں کا محتاط مطالعہ کرنے کے بعد اس امر کا تعین کیا جائے کہ یہ کن جانوروں کی ہیں اور کیا یہ جانور شکار کے نتیجہ میں اس جگہ پہنچے یا یہ ان جانوروں میں سے تھے جن کو سدھانے یا پالنے کا عمل اس ماحول میں جاری و ساری تھا۔

ٹیلے کے جنوب غربی حصہ سے ایک دو اینٹیں بھی دستیاب ہوئیں جو کسی باقاعدہ سانچے کی

مدد کے بغیر ہاتھوں سے بنائی گئی ہیں۔اگرچہ ان کی ساخت ماہرانہ نہیں لیکن ان کو اچھی طرح پکایا گیا ہے۔ان کی موٹائی پونے تین انچ کے قریب، چوڑائی سوا نو انچ سے ساڑھے نو انچ تک جبکہ لمبائی بارہ انچ کے قریب تھی۔

اینٹوں کا کوئی مکمل، نامکمل، باقاعدہ یا بے قاعدہ سٹرکچر ٹیلے پر دیکھنے میں نہیں آیا لیکن اینٹوں کی موجودگی اس بات کی شہادت دیتی ہے کہ عمارت، گلیاں یا کوئی پختہ تعمیر یقیناً موجود رہی ہوگی۔ جو اینٹیں سطح پر ہوں گی وہ مقامی لوگوں نے کسی نہ کسی دور میں استعمال کی غرض سے نکال لی ہوں گی جبکہ باقی ماندہ کا مطالعہ کرنے کے لئے لازم ہے کہ اثری ٹیلے کی باقاعدہ کھدائی کی جائے۔

ٹیلے کے مطالعے کے دوران بعض مقامات پر جلی ہوئی سطح بھی دیکھنے والے کو دعوت فکر دیتی ہے۔آبادیوں کے اجڑنے اور ہڑپائی تہذیب کے زوال کے حوالے سے بہت سے سوالات ہنوز جواب طلب ہیں۔ اگر یہ واضح ہو جائے کہ آبادی کی مفروضہ تباہی یا سوختگی کس دور میں عمل میں آئی اور اس سے پہلے یا بعد میں ہونے والی اختیاری یا غیر اختیاری نقل مکانی حتمی طور پر کس وجہ سے ہوئی تو کئی اہم انکشافات کی توقع ہوسکتی ہے۔اس لحاظ سے آبادی کے ان سوختہ حصوں کا جائزہ سائنسی بنیادوں پر لینا ضروری ہے تا کہ اس امر کا تعین کیا جاسکے کہ کیا یہ آثار عہد ماقبل تاریخ سے متعلق باشندوں کی کسی صنعتی یا گھریلو سرگرمی کی باقیات ہیں یا متاخر ہڑپائی دور کے بعد کے عہد میں رونما ہونے والے کسی واقعہ کے نتیجہ کے طور پر نظر آتے ہیں۔

آیئے اب اس ٹیلے کے سطحی مطالعہ کے نتیجہ میں سامنے آنے والی کچھ اہم اشیاء کا جائزہ لیتے ہیں۔

ٹیلے سے ملنے والے گلی کوزہ جات میں سب سے قدیم ان سفالی برتنوں کی ٹھیکریاں ہیں جو ہاکڑہ دور سے متعلق ہیں۔ پیڑاں والی کے نواح میں واقع ایک اور اہم قدیم آبادی نولاں سے اس عہد کے بہت سے برتن دستیاب ہوتے ہیں۔ پیڑاں والی میں ھاکڑہ دور کے برتن اس تعداد میں تو نہیں ملتے جس طرح متذکرہ بالا آبادی سے ملتے ہیں لیکن اس دور کی نمائندگی کچھ نہ کچھ برتن ضرور کرتے ہیں۔ یہ برتن چاک کی مدد سے نہیں بنائے گئے جس وجہ سے ان کی بیرونی اور اندرونی سطح کسی حد تک ناہموار ہے۔اس ناہمواری کا اندازہ سرسری طور پر دیکھنے سے نہیں لگایا جاسکتا ہے البتہ

بغور مشاہدے یا ہاتھ سے برتن کا لمس محسوس کرنے سے فوری طور پر یہ حقیقت سامنے آ جاتی ہے۔ برتنوں کی رنگت مختلف درجے میں سرخی مائل ہے۔ ان پر کسی قسم کی آرائشی تہہ یا Slip نظر نہیں آتی البتہ کچھ مثالیں ایسی ملتی ہیں جن پر دہانے یا اس کے ساتھ ساتھ کچھ نیچے سیاہ افقی لکیریں خوبصورتی پیدا کرنے کے لئے بنائی گئی ہیں۔ ان لکیروں میں دست کار کی ابتدائی ناتجربہ کاری جھلکتی نظر آتی ہے۔ البتہ یہ حقیقت مدنظر رہنی چاہئے کہ کوٹ ڈیجی عہد میں فن کی یہی ناپختگی قابل داد حد تک چابک دستی میں بدل گئی، جو اس امر کا بین ثبوت ہے کہ مقامی دست کار ارتقاء کی منازل مسلسل طے کرتے ہوئے کوزہ گری کے فن میں ہونے والی ہم عصر تبدیلیوں سے پوری طرح آگاہ رہا۔

دریائے راوی کی قدیم گزرگاہ کے ساتھ واقع آبادیوں میں جھری دار یا Grooved برتنوں کی سب سے خوبصورت مثالیں پیڑاں والی میں دیکھنے میں آتی ہیں۔ کوٹ ڈجی عہد کی نمائندہ یہ ٹھیکریاں اگرچہ اپنی مخصوص ہیئت کے باوصف ہنرمند کو اپنے فن کے اظہار کے لئے زیادہ کھلا میدان فراہم نہیں کرتیں لیکن اس کے باوجود کوزہ گروں نے اپنی حدود میں رہتے ہوئے بہت سے تجربے کئے ہیں جن کے نتیجے میں ظروف کی خوبصورت مثالیں سامنے آئی ہیں۔ اس طرز خاص کے برتنوں پر بنی ہوئی افقی لکیریں حیرت انگیز حد تک سیدھی اور توازن کی حامل ہیں۔ ان کے درمیانی فاصلے کو کم یا زیادہ کر کے مختلف انداز کا تاثر پیدا کیا گیا ہے۔ ایک برتن پر تمام تر لائنیں بالعموم ایک ہی ضابطے کے تحت بنائی گئی ہیں۔ بعض صورتوں میں ابھار اور بعض میں دبازت نمایاں کر کے الگ الگ انداز کے برتن بنائے گئے ہیں۔ اس طرز کی ایک اور خوبصورت مثال وہ ٹھیکریاں پیش کرتی ہیں جن میں یہ جھریاں افقاً بنانے کی بجائے لہریہ دار انداز میں تشکیل دی گئی ہیں۔ لہروں کے مدوجزر کم یا زیادہ کر کے ان کا تاثر جدا جدا کیا گیا ہے۔ اس قبیل کی ٹھیکریاں ٹیلے کے مطالعے کے دوران کم کم نظر آئیں۔ یہ خاص انداز برتن کو آرائش کے لحاظ سے ہاکڑہ کی شگافتہ یا incised پاٹری کے بالکل قریب پہنچا دیتا ہے۔ پیڑاں والی سے ملنے والی ٹھیکریوں پر گہرے سرخ رنگ کی تہہ دیکھنے میں آتی ہے۔ ہاکڑہ incised اور کوٹ ڈیجی کی ان زیر بحث ٹھیکریوں کو باہم ملا کر دیکھا جائے تو یہ اخذ کرنا مشکل نہیں رہتا کہ کوٹ ڈجی عہد کی یہ پاٹری قدیم تر طرز کی ہی ایک ارتقائی شکل ہے۔ Grooved پاٹری کی ایک خوبصورت مثال وہ ٹھیکری پیش کرتی ہے جس پر ایک پھول نما نقش بنایا گیا ہے، جس کی بنیاد چوکور اور تکون کی اقلیدسی اشکال پر رکھی گئی ہے۔

نمونے کے درمیان نسبتاً چھوٹی چوکور بنانے کے بعد اس کے ہر ضلع پر ایک مثلث بنائی گئی ہے۔ان چار مثلثوں کے اضلاع باہم برابر جبکہ مربع کے اضلاع کی نسبت تقریباً دوگنے ہیں۔نمونہ دیکھنے میں ایک پھول کی طرح لگتا ہے اور اس حوالے سے زیادہ اہمیت اختیار کر گیا ہے کہ چوکور اور تکون کی اشکال باہم ملا کر ڈیزائن تشکیل دینا کوزہ گر کی ذہنی اپچ کی جانب توجہ مبذول کراتا ہے۔

جھری دار پاٹری کی کچھ ایسی مثالیں بھی سامنے آئیں جن میں برتن کے تقریباً درمیانی حصے میں دو سیاہ لکیریں بنا کر ان کے درمیان ایک سفید لکیر بنائی گئی ہے۔ یہ برتن جہاں سرخ، سیاہ اور سفید رنگوں کی نقش گری کے حوالے سے ملٹی کروم پاٹری کی مثال پیش کرتے ہیں وہیں سفید رنگ کی نسبت سے ''سوتھی'' کلچر کے ترجمان بھی ہیں جس کی مثالیں سرخ Slip کے حامل برتنوں پر سیاہ اور سفید نقش گری کے حوالہ سے سوتھی کے ساتھ ساتھ کالی بانگاں، سیسوال اور کوٹ ڈ جی میں بھی دیکھنے میں آتی ہیں۔

تمام برتن خوب گندھی ہوئی مٹی سے بنا کر اچھی طرح پکائے گئے ہیں۔ان کا رنگ قدرتی طور پر سرخ ہے جس پر خوبصورتی کے لئے اسی رنگ کی Slip مہیا کی گئی ہے۔اس تہہ کی رنگت ہلکی سرخی مائل سے لے کر بھوری اور بعض صورتوں میں کلیجی تک ہو جاتی ہے۔جھری دار برتنوں کے دہانے پر باہر کی طرف سیاہ پٹی، جو کوٹ ڈ جی عہد کے برتنوں کی ایک نمائندہ خصوصیت ہے، نظر آتی ہے۔اس پٹی کی چوڑائی مختلف صورتوں میں مختلف ہے بعض مثالوں میں دہانے کی چوڑی پٹی کے نیچے تھوڑی سی جگہ چھوڑ کر ایک اور سیاہ لائن بنائی گئی ہے جس کی چوڑائی اول الذکر پٹی سے خاصی کم ہے۔دونوں پٹیوں کا باہمی فاصلہ مختلف صورتوں میں مختلف ہے۔دہانے کی اندرونی سمت بھی ایسی ہی لکیریں بنائی گئی ہیں البتہ ان لکیروں کا رنگ بالعموم سرخی مائل یا بھورا ہے۔بعض مثالیں ایسی بھی ہیں جن میں چوڑی پٹی کے اوپر ایک باریک سی سیاہ لکیر بھی دیکھنے میں آتی ہے۔اس انداز کے جو برتن ملے ان میں چھوٹے برتنوں سے لے کر درمیانی جسامت کے برتن شامل ہیں۔

Grooved پاٹری کے ساتھ ساتھ کوٹ ڈ جی عہد کی ایک اور نمائندہ طرز ان سادہ مگر دیدہ زیب برتنوں کی ہے جن پر گاڑھے سرخ رنگ کی باریک تہہ ان کی خوبصورتی میں اضافہ کرتی ہے۔ دہانے پر اندرونی اور بیرونی دونوں اطراف مختلف چوڑائی کی رنگین پٹیاں ہیں۔ بیرونی سمت بالعموم سیاہ جبکہ اندرونی جانب سرخی مائل رنگ کو ترجیح دی گئی ہے۔اس طرز کے ساتھ ساتھ بھورا، سلیٹی

مائل یا سیاہ رنگ بھی بعض برتنوں کی اندرونی سمت دیکھنے میں آتا ہے۔ بیرونی اور اندرونی پٹیوں کی چوڑائی کے حوالے سے بھی کوئی خاص اصول نظر نہیں آتا۔ غالباً کوزہ گر اپنی پسند اور مرضی کے مطابق انہیں بناتا ہوگا۔ زیادہ صورتوں میں ایک جبکہ بعض مثالوں میں ایک سے زائد لائنیں بنائی گئی ہیں جن سے خوبصورتی میں اضافہ مقصود ہوگا۔ دہانے کی اندرونی اور بیرونی سمت بنائی گئی ان پٹیوں کی نسبت سے برتنوں کی اس طرز خاص کو Banded Pottery کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔

تزئین و آرائش کا مندرجہ بالا انداز عام طور پر ان برتنوں میں نظر آتا ہے جو پکانے یا کھانے پینے کی اشیاء کو محفوظ کرنے کے لئے استعمال ہوتے ہیں۔ ان کے برعکس برتنے کے عام کوزوں اور پیالوں میں باریک لائنیں جن کی تعداد تین چار سے لے کر دس بارہ، ان کے مابین یا زیادہ بھی ہو سکتی ہے برتن کے دہانے کی اندرونی سمت جبکہ بیرونی طرف بالعموم ایک چوڑی پٹی بنائی گئی ہے بعض صورتوں میں متوازی لائنوں کی بجائے ایک دوسرے کو قطع کرتی Loops کو آرائشی مقصد کے لئے استعمال کیا گیا ہے۔ کوزہ گر کو اس امر کا پورا احساس تھا کہ کھلے برتنوں میں اندرونی سمت بنیادی اہمیت کی حامل ہونے کی وجہ سے زیادہ آرائش و زیبائش کی متقاضی ہے۔ اور اسی احساس کے تحت اس نے کھلے برتنوں کی اندرونی سمت پر زیادہ توجہ دی ہے۔

Flanged پاٹری کی بعض خوبصورت مثالیں بھی دیکھنے میں آئیں جن کو سنوارنے اور خوبصورت بنانے کی خاصی کوشش کی گئی ہے۔ ایک ٹھیکری پر سرخی مائل مٹیالے رنگ کی سلپ پر سیاہ رنگ کی تین تین باریک اور متوازی لائنیں تین دفعہ بنا کر ان کے درمیان نسبتاً لہریہ دار لکیریں کھینچ کر ایک ڈیزائن تشکیل دیا گیا ہے۔ دہانے اور Flange کی درمیانی جگہ گہرے بھورے رنگ کی ہے۔ Flange میں ڈھکنے کی مدد سے برتن ڈھانپنے کے لئے سوراخ بھی بنائے گئے ہیں۔ ایک اور مثال میں جو نسبتاً زیادہ خوبصورت ہے برتن پر زردی مائل تہہ بچھانے کے بعد سیاہ اور گہرے سلیٹی رنگوں سے آرائش کی گئی ہے۔ دہانے اور فلیج کے مابین کئے گئے گہرے سلیٹی رنگ میں کوئی ایسا عنصر بھی شامل کیا گیا ہے جس سے برتن میں ایک نمایاں چمک پیدا ہوگئی ہے جو دیکھنے میں بھلی لگتی ہے۔ Flange سے نیچے سیاہ رنگ کی چند متوازی افقی لائنیں برتن کا احاطہ کرتی ہیں۔ ان لکیروں کے نیچے مربع شکل کے خانے ایک لائن کے ذریعے باہم جڑے ہوئے برتن کی خوبصورتی

میں اضافہ کرتے ہیں۔ مربع کا ہر ضلع تقریباً پون انچ کا ہے جبکہ چہار خانوں کا باہمی فاصلہ بھی تقریباً اتنا ہی ہے جسے ایک لکیر سے آپس میں ملا دیا گیا ہے۔ ان مربعوں کے درمیان پینتالیس درجے کی متوازی لائنیں بنا کر ان کی دلکشی میں اضافہ کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ جہاں چہار خانے نہیں وہاں لائن کے آر پار الٹی اور سیدھی ''T'' کی صورت اس طرح بنائی گئی ہے کہ چہار خانوں اور ان کے مابین خوبصورت یگانگت اچھوتے نمونے کو جنم دے دیتی ہے۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ یہ خاص نمونہ ابتدائی ہڑپائی عہد میں کسی حد تک رائج رہا۔ رحمان ڈھیری کے مطالعے کے دوران بالکل اسی طرز کے نقوش کے حامل برتنوں کے ٹکڑے دیکھنے میں آئے۔ ان گلی ٹکڑوں میں سے بعض Flanged Pottery کی باقیات میں سے تھے جبکہ بعض سادہ برتنوں سے تعلق رکھتے تھے۔

قدیم پاٹری کے اس مطالعے کے دوران ایک دو ٹھیکریاں ایسی ملیں جو انفرادی طور پر قابل ذکر ہیں۔ ایک پر زردی مائل buff رنگ کی تہہ مہیا کرنے کے بعد سیاہ رنگ کا خوبصورت جیومیٹریکل ڈیزائن بنایا گیا ہے اور افقی و عمودی لائنوں اور مربع شکل کے ملاپ سے برتن کو قابل دید بنانے کی کوشش کی گئی ہے۔

ایک اور برتن پر ایسی مٹی کا لیپ یا Mudwash کیا گیا ہے جس میں ریت کی کثرت ہے۔ اسی وجہ سے ابرقی ذرات خوبصورت انداز میں دمکتے جگہ جگہ دکھائی دیتے ہیں۔ Mudwash کا استعمال بنیادی طور پر برتن میں رکھی شے مثلاً پانی کو زیادہ ٹھنڈا کرنے کے حوالے سے سودمند تصور ہوتا ہے۔ گیلی بوری یا کپڑے کا استعمال کر کے برتن کو ایک اضافی تہہ فراہم کرنے کا رواج بھی خال خال دیکھنے میں آتا ہے۔ آج بھی Mudwash کی مختلف صورتیں بآسانی دیکھی جا سکتی ہیں۔ بعض تو اس درجہ ماقبل تاریخ کی مثالوں کے قریب پہنچتی ہیں کہ سرسری طور پر دیکھنے سے دونوں کے مابین تفریق کرنا ممکن نہیں ہوتا۔ ہاکڑہ عہد کی ایپلک، کوٹ ڈجی اور ہڑپائی ادوار کی Mudwash پاٹری بھی اسی سوچ کے تحت بنائی جاتی ہوگی۔

عروج یافتہ ہڑپائی دور سے متعلق برتن زیادہ بڑی تعداد میں دیکھنے میں نہیں آتے۔ غالب گمان ہے کہ اس عہد میں پیڑاں والی کے رہنے والے کسی خاص وجہ کے باعث جنوب میں کچھ فاصلے پر واقع بلند و بالا ٹیلے ''پنج پیر'' کی جانب منتقل ہو گئے ہوں گے۔ پنج پیر عروج یافتہ ہڑپائی

دور کی باقیات کے حوالے سے خصوصی اہمیت کا حامل اثری ٹیلہ ہے۔ جہاں تک پیڑاں والی کا تعلق ہے عروج یافتہ ہڑپائی عہد کی Pottery میں روزنی یا Perforated ظروف اور ڈش آن سٹینڈ کے ٹکڑے محدود تعداد میں اس ٹیلے پر دیکھنے میں آتے ہیں۔ ڈش آن اسٹینڈ کی کچھ صورتیں ابتدائی ہڑپائی عہد میں بھی ملتی ہیں لیکن Perforated Pottery خصوصیت کے ساتھ عروج یافتہ ہڑپائی دور اور مابعد سے منسوب ہے۔

ماہرین آثار قدیمہ کے مابین یہ برتن دلچسپ مباحث اور نتیجے کے طور پر متضاد آراء کا باعث بنے ہیں۔ لیکن ابھی تک حتمی طور پر نہیں کہا جا سکتا کہ اس طرز خاص کے حامل برتن کسی ایک مقصد کے تحت بنائے جاتے تھے یا پھر ایک سے زائد مقاصد کون کون سے تھے جن کے حوالے سے عروج یافتہ ہڑپائی دور کے ساتھ ساتھ یہ مخصوص برتن متاخر ہڑپائی دور میں بھی خاصی تعداد میں ملتے ہیں۔ البتہ متاخر عہد میں بنائے گئے اکثر برتنوں میں وہ مہارت اور چابکدستی مفقود ہے جو عروج یافتہ ہڑپائی دور میں دیکھنے میں آتی ہے۔ یہ ثبوت بھی ملتے ہیں کہ Perforated ظروف بنانے کی روایت متاخر ہڑپائی دور کے بعد بھی کلیتاً متروک نہیں ہوئی۔ محدود پیمانے پر سن عیسوی کے آغاز سے متصل پہلے اور بعد کے زمانے سے تعلق رکھنے والے اثری ٹیلوں پر بھی اس طرز کے نمونے دیکھنے میں آتے ہیں۔ ٹیکسلا کے آثار کے علاوہ ضلع راولپنڈی میں مندرہ کے نواح میں کالا، قدیم بھیرہ اور سیالکوٹ کے نواح میں جہاں بدھ عہد کے آثار کی کثرت ہے Perforated پاٹری کے کئی نمونے دیکھنے میں آئے۔ شورکوٹ کے قدیم آثار سے بھی اس کی بعض مثالیں ملتی ہیں۔ یہ الگ بات ہے کہ یہ مثالیں عروج یافتہ یا متاخرہ ہڑپائی دور کے مختلف سائز اور عموماً ٹھوس اور مضبوط برتنوں کے برعکس نازک برتنوں کی عکاسی کرتی ہیں۔ ریت اور رواج کا یہ تسلسل، اپنے چھوٹے چھوٹے تضادات سمیت، تحقیق طلب ہے۔ دیگر حوالوں کے علاوہ ایک سوال یہ بھی ابھرتا ہے کہ کیا معاشرے میں قدیم تر کوزہ گروں کی نسل سے تعلق رکھنے والے کچھ دستکار ہنوز موجود تھے یا محض ایک انوکھی روایت نے بعد میں آنے والے ہنرمندوں کی توجہ اپنی طرف مبذول کرائی تھی۔

برتنوں کے علاوہ ملنے والی اشیاء میں سرمئی اور سرخ رنگ کی مٹی کی چوڑیوں کے ٹکڑے بھی جا بجا بکھرے ہوئے ملتے ہیں۔ ان کے سیکشن گول بھی ہیں اور ایسے بھی جن کی بیرونی اطراف انگلیوں سے دبا کر تکون کی شکل بنا دی گئی ہے۔ تکونی شکل صرف سرخ رنگت کی حامل چوڑیوں میں

نظر آتی ہے۔ایک آدھ مثال ایسی بھی ملی جس میں دوسرمئی چوڑیوں کو باہم ملا کر پکایا گیا ہے۔ چوڑیوں کے ٹکڑے اوران کی قوسیں اس امر کی نشاندہی کرتی ہیں کہ یہ بچوں اور جوانوں دونوں کے لئے بنائی جاتی تھیں۔

مٹی کے بنے ہوئے منکے بھی دستیاب ہوئے۔یوں محسوس ہوتا ہے کہ مٹی کے Cones باہم ملا کر پکائے گئے ہوں۔اس شکل کا ایک چھوٹا سامنکہ سوا سینٹی میٹر کے قریب لمبا ہے جبکہ اس کا قطر اس سے تھوڑا سا زیادہ ہے۔ بڑے منکے تقریباً تین سوا تین سینٹی میٹر لمبے اور اس سے کچھ زائد چوڑے ہیں۔

نیم قیمتی پتھروں میں لاجورد اور عقیق کے منکے دیکھنے میں آئے۔ یہ بظاہر چھوٹے چھوٹے Beads دیکھنے والے کو عالم تصور میں بدخشاں، دکن اور بلوچستان کی Queries تک لے جاتے ہیں۔ساتھ ہی ساتھ یہ ان تجارتی راستوں پر غور وفکر کرنے کے لئے ایک وسیع میدان بھی فراہم کرتے ہیں جو ہڑپائی عہد تک آتے آتے وادی سندھ اور دیگر تہذیبی وثقافتی مراکز کے درمیان قائم ہو چکے تھے۔ان راستوں پر گامزن باقاعدہ اور بے قاعدہ کاروباری طبقے بھی ہماری دلچسپی کا باعث بن سکتے ہیں۔اسی نوع کی ایک اور اہم شے سیپ سے بنی ہوئی وہ چوڑیاں ہیں جو ساحل سمندر پر واقع مختلف تجارتی مراکز سے وادی سندھ کے طول وعرض میں پھیلی سینکڑوں چھوٹی بڑی بستیوں تک آتی تھیں۔اس امر کے شواہد ملتے ہیں کہ یہ چوڑیاں بنی بنائی صورت میں درآمد ہونے کے ساتھ ساتھ مقامی طور پر بھی بنائی جاتی تھیں جس کی نشاندہی سیپ کے شکستہ ٹکڑے اب تک کرتے نظر آتے ہیں۔''پیڑاں والی'' سے بھی سیپ کی چوڑیوں کے کچھ ٹکڑے ہاتھ آئے۔

چرٹ پتھر کے کچھ بلیڈ بھی ٹیلے کی سطح سے ملے۔کریم رنگ کے یہ بلیڈ بظاہر روہڑی یا اس کے نواح سے دستیاب ہونے والے پتھروں سے بنائے گئے ہیں ان کی چمک دار دھار اس امر کی نشاندہی کرتی ہے کہ یہ استعمال ہوتے رہے ہیں۔ چرٹ کے بلیڈ اوزاروں کے ساتھ ساتھ ملنے والی ایک اور دلچسپ چیز سیاہ چرٹ کی وہ Core ہے جو اپنی نوعیت کے حوالے سے قدیم تر اور مختلف Querry سے متعلق محسوس ہوتی ہے۔غالباً بلوچستان،کوہ سلیمان یا کوہستان نمک کے کسی مرکز سے

زمانہ ماقبل تاریخ سے متعلق مختلف اثری ٹیلوں کی کھدائی کے نتیجے میں سامنے آنے والے

شواہدات کی روشنی میں یہ بات واضح ہوتی ہے کہ چرٹ کے اوزار وسطی ہجری دور کے اختتام پر بننے شروع ہو گئے تھے۔ بعض قدیم آبادیوں کی کھدائی کے دوران ان اوزاروں کے ساتھ رہت سہت کی دوسری علامات مثلاً کوزہ جات دستیاب نہیں ہوئے جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ لوگ ابھی تک سیر و شکار پر انحصار اور عارضی نوعیت کے رہائشی ٹھکانوں پر اکتفا کرتے ہوں گے۔ بعد کے ادوار میں البتہ گلی ظروف، آرائش وزیبائش کی اشیاء اور ابتدائی طرز تعمیر کے نمونوں کے ساتھ ساتھ چرٹ اوزاروں کی موجودگی برقرار رہی اور یہ سلسلہ اس وقت تک چلا جب تک انسان ان اوزاروں کی طرز پر دھات کے اوزار بنانے کے قابل نہیں ہو گیا۔ ان بظاہر بے بضاعت سنگی ٹکڑوں کا مطالعہ عمیق نظری سے کیا جائے تو یہ حقیقت واضح ہوتی ہے کہ ابتداً ان ٹکڑوں کو بالعموم اکائی کی حیثیت میں کام لایا جاتا رہا۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ انسان نے شعور حاصل کر لیا کہ چرٹ پتھروں کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے مرکب اوزار ترتیب دینے میں مدومعاون ہو سکتے ہیں اور انہیں ہڈی، بانس یا لکڑی کے دستے میں لگا کر زیادہ احسن طریقے سے استعمال کیا جا سکتا ہے۔ اس کے علاوہ خم دار لکڑی یا ہڈی میں تھوڑا سا خلا پیدا کر کے بلیڈز کو ان میں پیوست کرنے اور مضبوطی سے باندھنے کے بعد درانتی کا کام لیا جانا بھی ممکن ہے۔

پیڑاں والی سے ملنے والے چرٹ اوزار بھی مفرد یا مرکب صورتوں میں استعمال ہوتے رہے۔ ان کے دندانوں کے خم اور چمک ان کے تادیر استعمال کی دلیل فراہم کرتے ہیں۔

پتھر کے اوزاروں میں سل پر پیسنے کے لئے استعمال ہونے والا ایک پتھر مکمل درست حالت میں دستیاب ہوا جس کے مختلف پہلو اس کے استعمال پر دلالت کرتے ہیں۔ مٹی کا ایک پختہ بٹہ بھی جو شکل میں بہت حد تک T/c کیکس سے ملتا جلتا ہے دیکھنے میں آیا۔ خیال ہے کہ مٹی کے برتنوں میں غلے سے چھلکا اتارنے کے لئے اس طرز کے پختہ کیک استعمال ہوتے ہوں گے۔ کیونکہ پتھر کا بٹہ استعمال کرنے کی صورت میں برتن کے ٹوٹنے کا احتمال ہوتا ہوگا۔

ٹیلے کی جنوب غربی سمت میں صنعتی سرگرمی کی واضح علامات ملتی ہیں۔ بھٹی کی میل کچیل پر مشتمل پختہ ٹکڑے، فرنس کی باقیات اور اس نوعیت کی دیگر اشیاء، سرسری نظر ڈالنے پر بھی دیکھی جا سکتی ہیں۔ برتن، چوڑیاں، گھگھوگھوڑے، نیم قیمتی پتھروں کے منکے سب ہی کی تیاری میں بھٹیوں کی ضرورت پڑتی ہو گی۔ تانبے کے چھوٹے چھوٹے گول ٹکڑے اور خال خال تانبے کی مختلف اشیاء

کے ٹوٹے ہوئے حصے اس بات کو ثابت کرتے ہیں کہ تانبہ پگھلا کر اوزاروں یا استعمال کی دیگر اشیاء کی صورت میں ڈھالا جاتا ہوگا۔ پیڑاں والی سے بجانب شاہ کوٹ مارٹن پور کے ساتھ واقع ہڑپائی بستی میں بھی بہت سی بھٹیوں کا سراغ ملتا ہے۔ ان ٹیلوں کا تفصیلی جائزہ اور اگر ممکن ہو تو کسی قدر باقاعدہ کھدائی اس امر کا تعین کرنے کے لئے مفید ثابت ہو سکتی ہے کہ تانبے کے اوزار محدود پیمانے پر مقامی ضروریات پوری کرنے کے لئے ہی بنائے جاتے تھے یا انہیں دوسری ہم عصر آبادیوں میں فروخت کرنے یا بارٹر سسٹم کے تحت اشیاء کے لین دینے کے لئے بھی استعمال کیا جاتا تھا۔

بچوں کے لئے بنائے جانے والی اشیاء میں کھلونا برتن اور گھگو گھوڑے خصوصی دلچسپی کے حامل تھے۔ کھلونا جانوروں کے ٹوٹے پھوٹے ٹکڑے اس ماحول میں موجود جانوروں کی ترجمانی کرتے ہیں۔ ایک آدھ مثال میں کوہان سے اندازہ ہوتا ہے کہ بیل بنایا گیا ہے۔ ایک دو کھلونے کتے سے ملتے جلتے ہیں۔ ایک کسی قدر مکمل مثال میں جانور کی پچھلی ٹانگیں جدا جدا جبکہ اگلی باہم پیوست ہیں۔ سادہ مٹی کے پکائے ہوئے ان کھلونوں پر کسی قسم کی آرائش یا Slip وغیرہ موجود نہیں ہے۔

مٹی کے برتنوں کے بعض ایسے ٹکڑے بھی جنہیں دانستہ توڑ کر گول بنانے کی کوشش کی گئی ہے دستیاب ہوئے۔ پنجاب کے شہر اور دیہات دونوں میں بچے ''پٹھو گرم'' نامی کھیل نہایت شوق سے کھیلتے ہیں اسی طرح ''سٹاپو'' نامی کھیل میں آج بھی اس انداز کے ٹکڑے استعمال ہوتے ہیں۔ اول الذکر کھیل میں اگرچہ ایک گیند درکار ہوتی ہے لیکن موخر الذکر میں تو محض ٹھیکری ہی کام دے دیتی ہے۔

چولہے کا ایک ٹوٹا ہوا حصہ، جس پر مخروطی شکل کا ایک ابھار ابھی تک محفوظ ہے، پنجاب کے دیہات میں دودھ یا کھانا وغیرہ گرم رکھنے کے لئے اس انداز کا چولہا استعمال کرنے کی روایت کی قدامت کا عکاس ہے۔ اس کے مسطح حصے کو زمین کے ساتھ بچھانے کے بعد اوپر دہکتے کوئلے رکھ دیئے جاتے ہیں اور تین یا چار ابھاروں پر برتن رکھ کر اس امر کو یقینی بنایا جاتا ہے کہ کھانا دیر تک گرم رہ سکے۔ دیہی معاشرے میں خوراک سے متعلق ابتدائی سہولتوں کی فراہمی کی روایت کتنی قدیم ہے پیڑاں والی سے ملنے والے چولہے کا یہ حصہ اس کی کسی قدر نشاندہی کرتا ہے۔

چولہے کا ایک اور ٹکڑا جس کا جلا ہوا حصہ اس امر کا ثبوت فراہم کرتا ہے کہ یہ استعمال میں آتا

رہا، ایک اور حوالے سے دلچسپی اور غور و فکر کا متقاضی ہے۔ مٹی گوندھنے کے بعد اس میں بھوسہ ملانے کی روایت آج بھی زندہ ہے۔ ماقبل تاریخ کے اس چولہے کے ٹکڑے کو دیکھ کر اس روایت کی قدامت کا اندازہ لگانے کے ساتھ ساتھ اس طرح کی باقیات سے اس بات کا تعین بھی ہو سکتا ہے کہ ماحول میں کون کون سا غلہ پیدا ہوتا ہوگا۔ جو سے ملتے جلتے دانے اور بھس بڑی آسانی سے شناخت میں آ جاتے ہیں۔ ایسی باقیات کا محتاط مطالعہ عہد قدیم میں اس ماحول میں پائی جانے والی بعض فصلوں کے بارے میں ہمارے علم میں اضافے کا باعث بن سکتا ہے۔

ٹیلے کی سطح سے ملنے والی ایک اور دلچسپ شے مٹی کی پختہ ٹکیوں یا T/c کیکس کے ٹوٹے پھوٹے حصے ہیں۔ یہ بڑی تعداد میں تو دیکھنے میں نہیں آتے لیکن اکا دکا مثالیں بہر حال مل جاتی ہیں۔ T/c Cakes کے حوالے سے ماہرین آثار قدیمہ کی ٹائلٹ پیپر سے لے کر برتن پکانے کی بھٹیوں کے دہانے پر حرارت اور دھوئیں کو کنٹرول میں رکھنے والی گلی ٹکیوں تک کی آراء ہمارے سامنے آتی ہیں۔ بہر حال یہ خیال کرنا کہ یہ کسی ایک خاص مقصد کے لئے استعمال ہوتی ہوں گی درست نہ ہوگا۔ ان کی مختلف ساخت بھی اسی رائے کو تقویت دیتی ہے۔ ایسی ٹکیاں جن کے درمیانی حصے میں دونوں اطراف پر ایسی دبازت یا پچکاؤ نظر آتا ہے جو انگوٹھے اور انگشت شہادت سے ناپختہ مٹی کی کسی شے کو پکڑنے پر وجود میں آ سکتا ہے اس بات کی شہادت دیتا ہے کہ یہ دبازت ان ٹکیوں کو پکانے سے قبل موجود ہوگی اور پختہ ہونے پر ان Cakes کو مضبوطی سے گرفت میں لانے کے بعد استعمال کرنا مقصود ہوگا۔ یہ خیال بھی گزرتا ہے کہ گول، تکونی یا مستطیل نما سفالی ٹکیاں اپنی مخصوص ساخت کے حوالے سے مختلف انداز میں استعمال ہوتی ہوں گی اور جس مقصد کے لئے جو شکل مناسب سمجھی جاتی ہوگی وہی اختیار کی جاتی ہوگی۔

Terracotta Cakes کے حوالے سے یہ امر تحقیق طلب ہے کہ یہ تکون، مدور، آلو یا کچالو نما ٹکیاں اس قدر کثیر تعداد میں عروج یافتہ ہڑپائی دور ہی میں کیوں نظر آتی ہیں۔ یاد رہے کہ کوٹ ڈجی دور کے وسط سے ہمیں کم کم تعداد میں ان کا وجود نظر آنا شروع ہو جاتا ہے لیکن عروج یافتہ ہڑپائی دور کے بعض اثری ٹیلوں کو دیکھ کر تو یہ گمان گزرتا ہے کہ ان آبادیوں میں شاید یہ Cakes بنانے کے علاوہ کوئی اور بنیادی کام کیا ہی نہیں گیا۔ ملتان کے نواح میں قطب پور کے

نزدیک چک W.B 160 کے بڑے حصے پر دوہاڑی کے قریب کسم سر اور چیچہ وطنی تحصیل میں چک L-90/12 میں کم و بیش یہی صورت حال نظر آئی۔ عروج یافتہ ہڑپائی عہد سے متعلق اور بہت سے اثری ٹیلوں پر بھی یہی معاملہ دیکھنے میں آیا۔ یہ صورت احوال اس رائے کو تقویت دیتی ہے کہ عروج یافتہ ہڑپائی عہد میں کوئی نہ کوئی سرگرمی ایسی ضرور تھی جس کے لئے وافر تعداد میں ان کیکس کی ضرورت پڑتی تھی۔ مٹی کے برتن بنانے کے حوالے سے دھوئیں یا درجہ حرارت کو مخصوص حد میں رکھنے کے لئے ان کا استعمال زمانہ ماقبل تاریخ سے لے کر اب تک دیکھنے میں آتا ہے۔ یہ الگ بات کہ ان ٹکیوں کی شکل اس خاص حوالے سے باہم اختلاف کی حامل ہے۔

ہڑپہ میں ہونے والی نئی کھدائیوں میں جہاں اور بہت سے دلچسپ انکشافات ہوئے وہیں گلیوں، سڑکوں کے علاوہ بعض تعمیرات میں دیواروں کے نیچے ان آلو نما ٹکیوں کی تہہ کا سراغ بھی ملا ہے۔ غالباً یہ T/c کیکس راستوں کی پختگی بڑھانے اور ہر موسم میں آمدورفت ممکن بنانے کے لئے ناگزیر ہو گئے تھے۔ بڑے قصبے یا شہر جہاں باقاعدہ منصوبے کے تحت سڑکیں، گلیاں اور مکانات بنائے جاتے ہوں گے وہاں ان کا استعمال بڑی تعداد میں ہوتا ہوگا۔ یہ صورت حال بالکل ایسی ہے جیسی آج کل شہروں کے نواح میں اینٹوں کے بھٹوں کی صورت دیکھنے میں آتی ہے۔ جس طرح نواحی علاقوں میں واقع ان بھٹوں سے اینٹیں شہروں میں ہونے والی تعمیرات کے لئے لائی جاتی ہیں بعینہ اسی طرح عروج یافتہ ہڑپائی دور کے بڑے شہروں کے قرب و جوار میں واقع بعض آبادیاں T/c کیکس بنا کر شہروں کو سپلائی کرنے کے مراکز کی حیثیت رکھتی ہوں گی۔ اس اعتبار سے دیکھا جائے تو اولین استعمال میں آنے والی شے جو وادی سندھ میں راستے مضبوط اور پختہ کرنے کے لئے استعمال ہوئی یہی Nodules تھے۔

اپنی بات کو سمیٹتے ہوئے میں یہ کہوں گا کہ پیڑاں والی بعض حوالوں سے انتہائی اہم ٹیلہ ہے۔ یہ کوٹ ڈیجی یا ابتدائی ہڑپائی عہد کے آثار کی عکاسی خاصے بھرپور انداز میں کرتا ہے۔ اس امر کی اشد ضرورت ہے کہ اس کی حفاظت کا جس حد تک ہو سکے اہتمام کرنے کے ساتھ ساتھ سائنسی انداز میں اس کے مطالعے کی کوشش کی جائے۔ قبرستان بننے کی وجہ سے یہاں موجود کچھ اشیاء شاید

مطالعے کے لئے محفوظ رہیں لیکن اپنی اصل جگہ سے ہٹ جانے کی وجہ سے ان سے وہ نتائج یقیناً اخذ نہیں کئے جاسکیں گے جو اصولی طور پر استنباط کرنے کے لئے ضروری ہیں۔
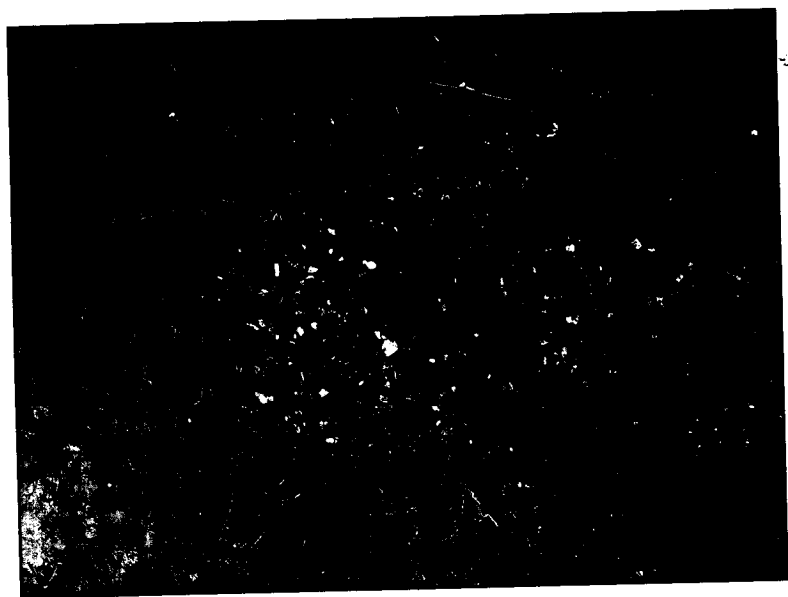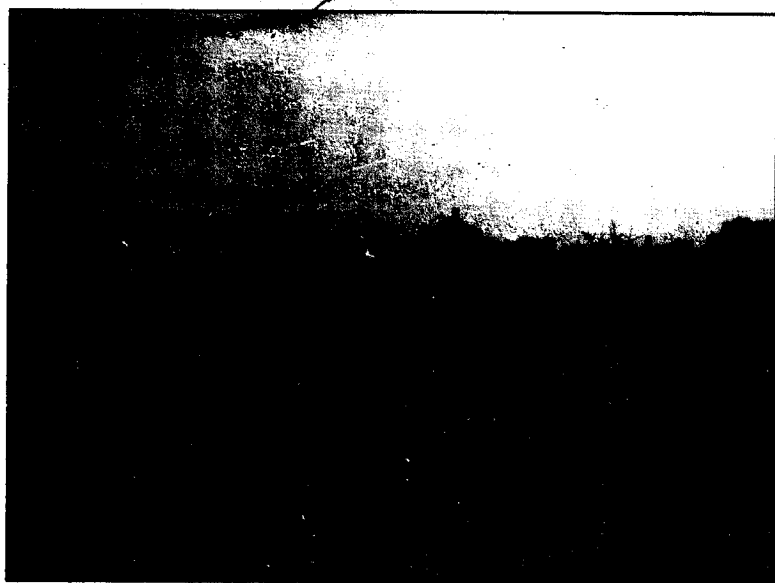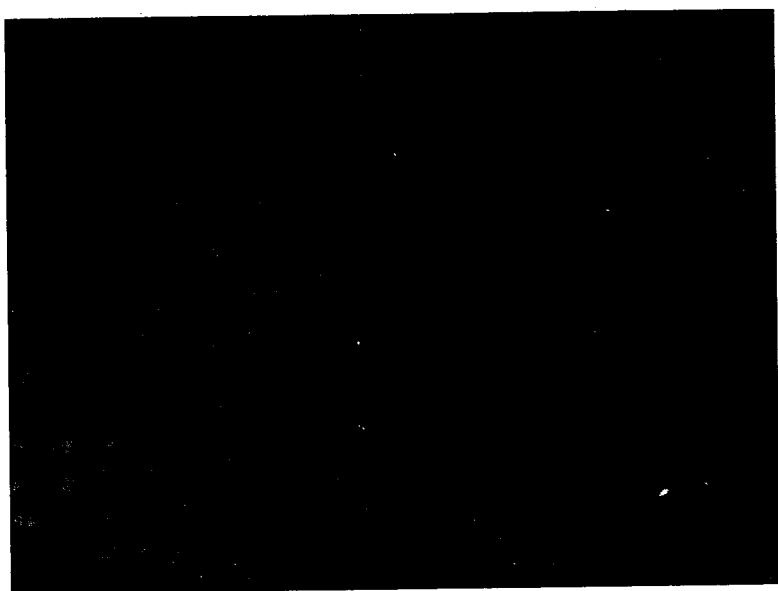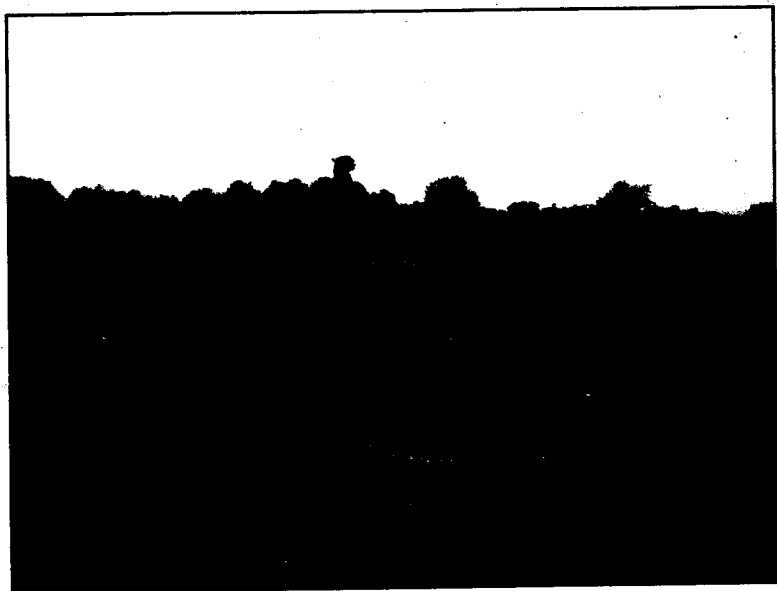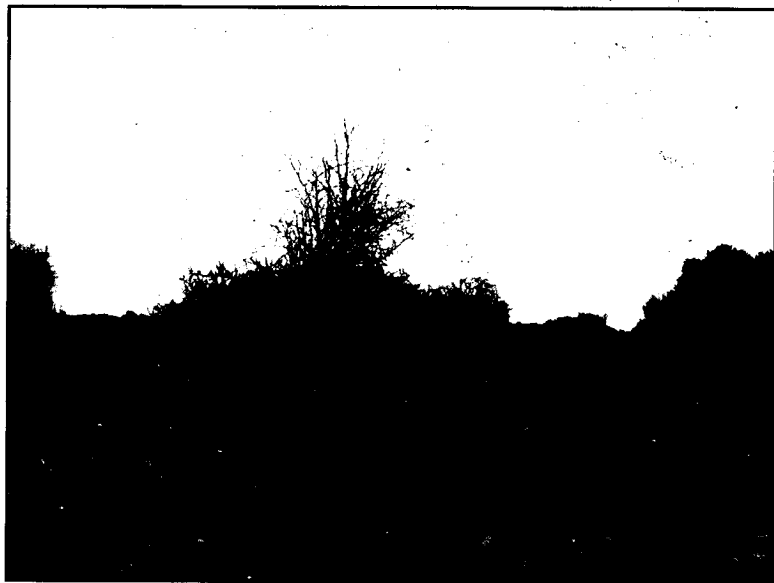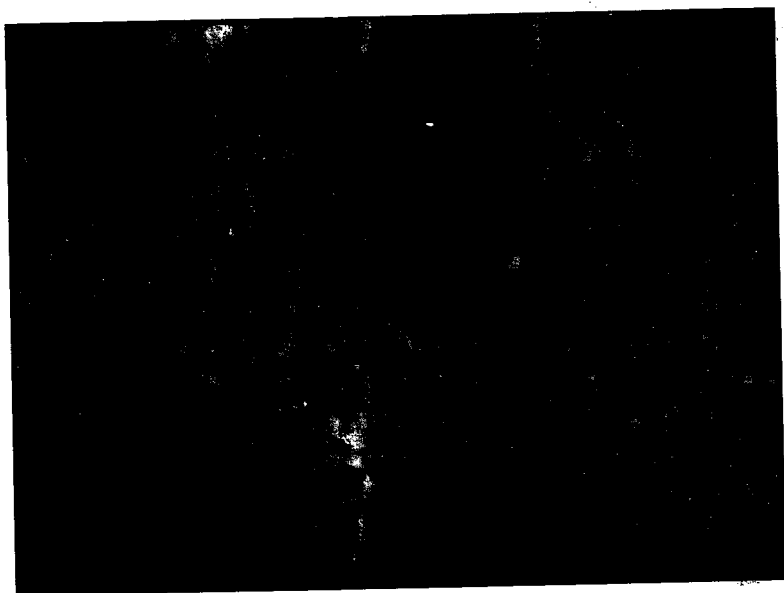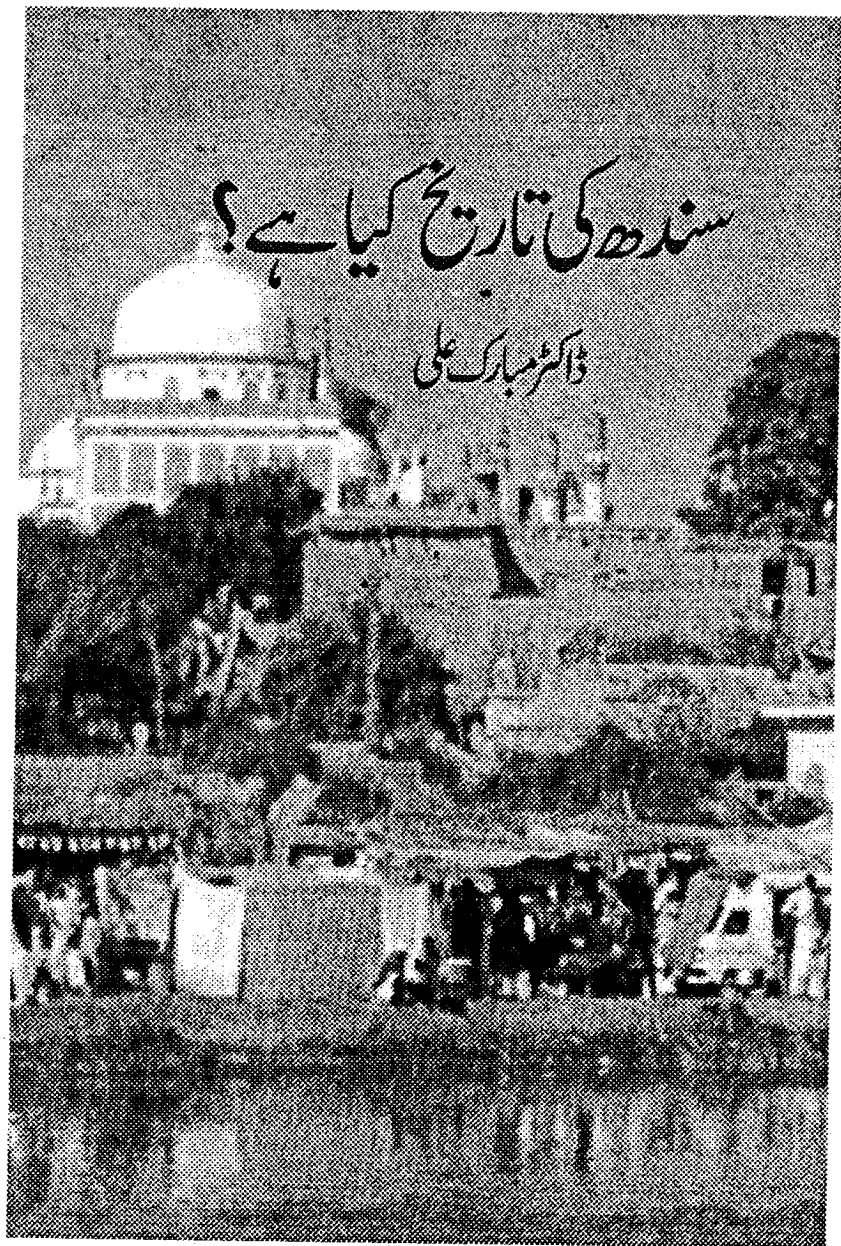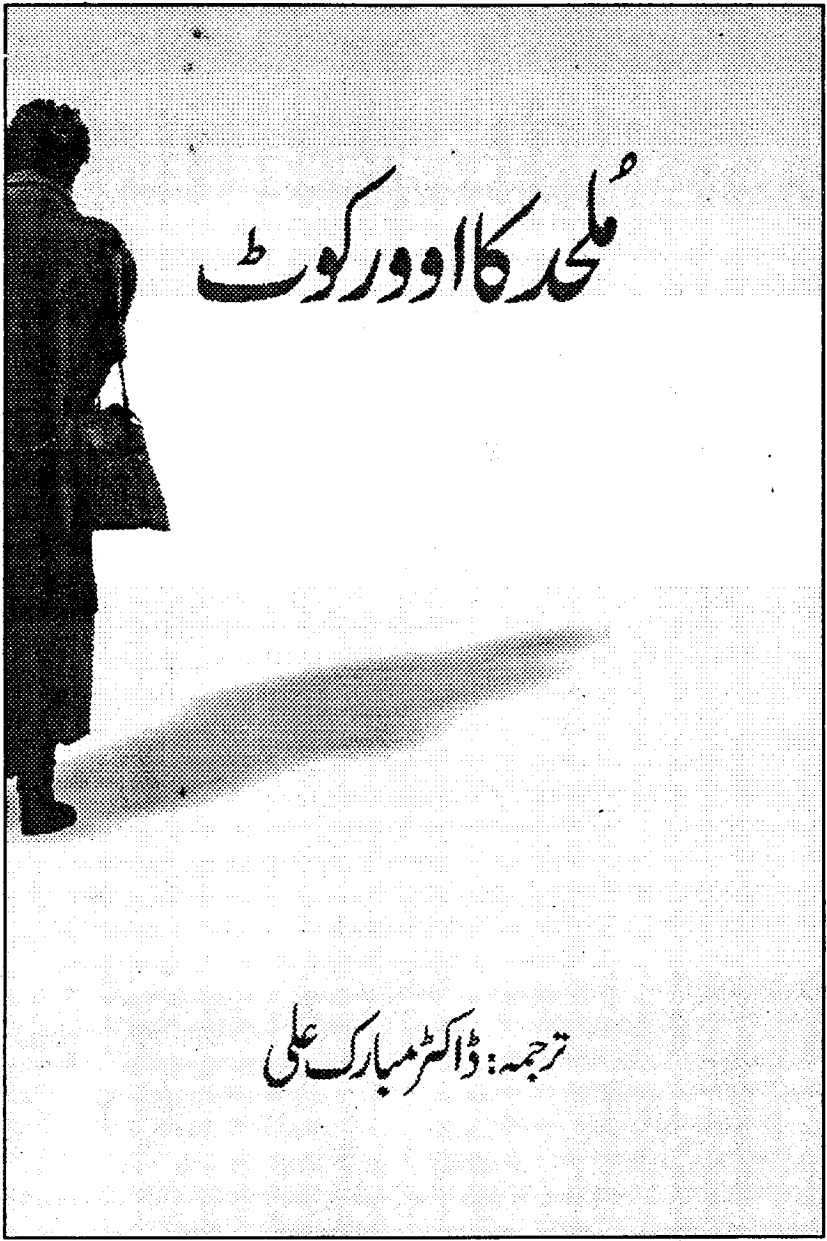
قیمت: -/90

نیا ایڈیشن

قیمت: -/90

قیمت: -/200
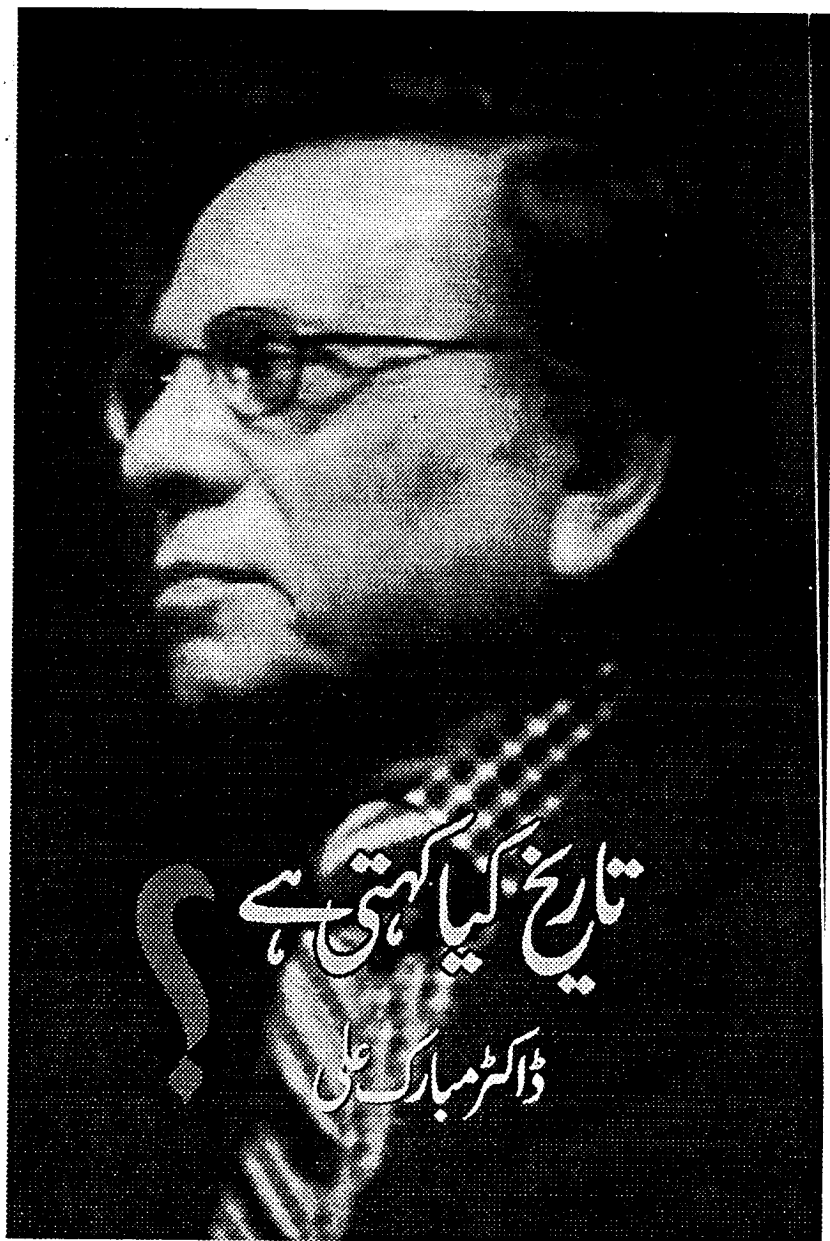
نیا ایڈیشن

نیا ایڈیشن

قیمت: -/90
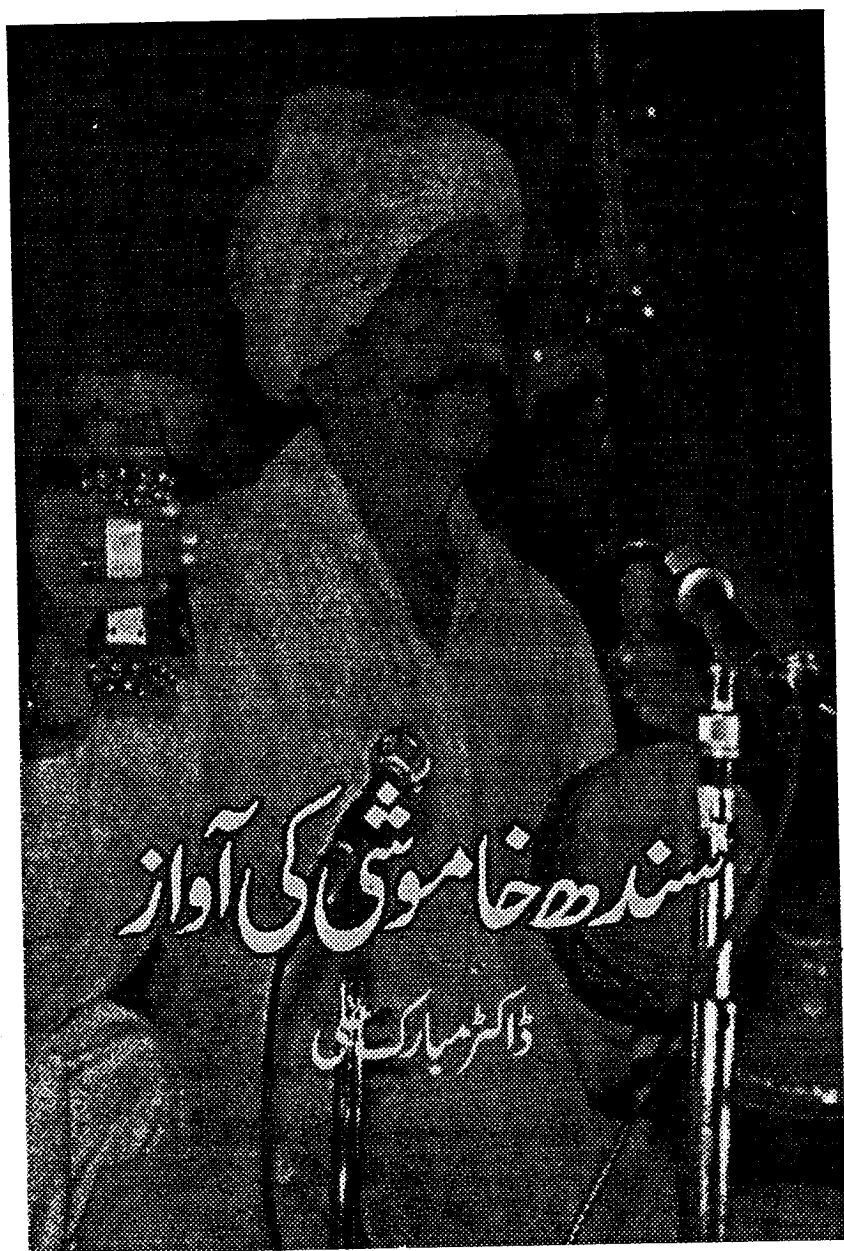
قیمت: -/150

نیا ایڈیشن

پنجاب کے قدیم باشندے

اشفاق سلیم مرزا

نسلی رنگارنگی

پنجاب کے کسی بھی بڑے شہر میں اگر کوئی اجنبی کسی پُر رونق چوراہے پر کھڑے ہو کر آتے جاتے ہوئے لوگوں پر نظر ڈالے تو وہ جگہ ایک تماشہ گاہ دکھائی دے گی۔ ہر رنگ، جسمانی ساخت اور لباس میں انسان وہاں نظر آئیں گے۔ گوری عورت، کالا مرد، کالی عورت، گورا آدمی، چھوٹے سر والے، بڑے سر والے، دھوتی پہنے ہوئے، سوٹ پہنے ہوئے، گندمی رنگت والے تانبے جیسے، سیاہ فام اور زرد چہروں والے لوگ جگہ جگہ گھومتے نظر آئیں گے۔ چہروں کو غور سے دیکھو تو کشادہ پیشانی والے، تنگ پیشانی والے، بڑی اور خوبصورت آنکھوں والیاں، چھوٹی اور ''کھچری'' آنکھوں والیاں، نیلی سیاہ اور بھورے رنگ کی آنکھوں والے، تنگ دہانے والے، کھلے دہانے والے، لمبی ناک والے، چپٹی ناک والے، مضبوط اور لمبے جبڑوں والے، چھوٹے جبڑوں والے، سیاہ اور گھنگریالے بالوں والے، سنہرے بالوں والے، غرض کیا نہیں جو ہمارے شہروں میں نہ ملتا ہو۔ یہی کچھ دیکھ کر ایک بار ملکہ ایلزبتھ نے کرکٹر فضل محمود کی نیلی آنکھوں سے متاثر ہو کر کہا تھا کہ ''تم بھی پاکستانی ہو!''

یہ لوگ کہاں سے آئے؟ کیا وہ ازل سے یہاں موجود تھے یا پھر لہر در لہر کہیں سے آن کر یہاں بس گئے۔ یہ کہانی بہت دلچسپ اور پُر اسرار ہے۔ تین چار ہزار سال پیچھے بھی اگر چلے جائیں تو بھی کچھ خاص سمجھ میں نہیں آتا۔ ماہرین بشریات اور نسلیات ابھی تک تذبذب میں پڑے

ہوئے ہیں۔ بہت کچھ وثوق کے ساتھ بھی کہا جاتا ہے۔ پھر بھی قیاس آرائی بہت ہے۔

دوسری طرف ہمیں اپنی جڑوں (Roots) کی تلاش رہتی ہے۔ جیسے یہ کوئی انقلابی فعل ہے۔ اکثر لوگ یہ سوال کرتے ہیں کہ ہماری شناخت کیا ہے؟ میرے لحاظ سے اگر ہم آج پاکستان میں بس رہے ہیں تو ہم پاکستانی ہیں۔ ہم کہیں بھی پیدا ہوئے ہوں یا ہمارے آباؤاجداد آج سے سینکڑوں سال پہلے کہیں سے بھی آ کر آباد ہوئے ہوں اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ ایسی بہت سی شناختیں اپنی بڑائی کا اظہار ہوتی ہے یا پھر چھوٹی قوموں کے لئے تذلیل کا باعث۔ اس سے کیا فرق پڑتا ہے۔ اگر میرا شجرہ نسب عرب کے قریش سے ملتا ہے یا پھر میں مغلیہ خاندان کا چشم و چراغ ہوں۔ دیکھنا تو یہ ہے کہ آج کے پاکستانی سماج میں میرا کردار کیا ہے۔ چودھری، سردار یا خان ہونا ہمارے ہاں پیدائشی برتری کی علامت سمجھا جاتا ہے۔ جڑوں کی تلاش کا مسئلہ برتر قوموں کا مسئلہ رہا ہے۔ اوراس کے اثرات بھی کچھ اچھے نہیں رہے۔ جیسا کہ نازیوں کو خالص آریاؤں کی تلاش تھی۔ اوراسی دھن میں وہ کیا کیا کر بیٹھے۔ چونکہ ہم کچھ اور نہیں کر پا رہے اس لئے سب سے پہلے یہ مسئلہ حل کرنا چاہتے ہیں کہ ہماری شناخت کیا ہے۔ جیسا کہ ایسا کرنے سے باقی مسائل خود بخود حل ہو جائیں گے۔

چلئے ہم اپنی بات کو آگے بڑھاتے ہیں۔ ایک زمانے میں امریکی جامعہ ییل (Yale) سے محققین نے آ کر پوٹھوہار کے علاقے میں انسانی قدامت کا اندازہ لگانا شروع کیا۔ پچھلی صدی کی ستر کی دہائی میں پروفیسر لیکی (Leaky) اور پل بیم نے یہاں بہت کام کیا۔ یہ دونوں نسلیات اور رکازیات (Paleontology) کے ماہر تھے۔ انہوں نے ضلع اٹک کے آس پاس اور کالا چٹا سلسلہ کے اردگرد کے دیہات نگری ڈھوک پٹھان اور چھنجی میں کھدائی کے دوران جو رکازیاتی نمونے حاصل کئے اُن سے انہوں نے یہ دعویٰ کیا کہ اس علاقے میں موجودہ انسان کے جدامجد کے رکازیاتی نمونے پچھلے ڈیڑھ کروڑ سال سے تسلسل کے ساتھ پائے جاتے ہیں۔ اور ایسا تسلسل دنیا بھر میں پاکستان کے علاوہ کہیں اور نہیں پایا جاتا۔ ڈاکٹر پل بیم نے ایک جبڑا دریافت کیا جسے انہوں نے (Rama Pithecus Punjabicus) راما پیتھے کس پنجابیکس کے سلسلہ کی نسل کے انسان کے طور پر شناخت کیا۔ اس دوران ڈاکٹر پل بیم اور ڈاکٹر ابراہیم شاہ نے اسی کے قریب رکازیاتی نمونے حاصل کئے۔ اسی راما پیتھے کس پنجابی کس کو بعدازاں پوٹھوہار مانس بھی کہا گیا۔ اس

کے سر اور جبڑے کی ساخت کی وجہ سے اسے موجودہ انسان کے قریب ترین گردانا گیا۔

حال ہی میں افریقہ میں جو رکازیات ملے ہیں اُن کے مطابق موجودہ شعور انسان کی جنم بھومی افریقہ تھی۔ ایتھوپیا کے دارالحکومت عدلیس ابابا کے شمال مشرق میں 940 میل دور ہرٹو انسان کی قدامت کا اندازہ ڈیڑھ کروڑ سال پہلے کا ہے۔ یہ ایک لمبی بحث ہے۔ جو ہمارے مضمون سے کچھ ہٹ کر بھی ہے۔

اپنے موضوع کی طرف پلٹتے ہوئے دیکھنا یہ ہے کہ جن لوگوں کے رکازیاتی نمونوں کو پل بیم اور اُن کے معاونین نے اکٹھا کیا ان کا تعلق کس نسل سے تھا۔ کچھ ماہر بشریات جن میں گنگو سکی بھی شامل ہے کا خیال یہ ہے کہ یہ بھی اس افریقی نسل سے تعلق رکھتے تھے جنہیں Negro Australoid کہا گیا ہے۔ اور یہ لوگ افریقہ اور ایشیا کے استوائی خطوں کے وسیع علاقوں میں پھیلے ہوئے تھے۔(1)

Negro-Australoid کے نقوش کو نسترخ نے یوں بیان کیا ہے۔ ان کی جلد، بال اور آنکھیں سیاہ ہیں۔ سر کے بال گھنگریالے، عام طور پر چہروں اور جسم پر بال کم ہوتے ہیں۔ گو ان میں کچھ نسلی گروہ ایسے بھی پائے جاتے ہیں جن کے جسم پر بال زیادہ گھنے ہوتے ہیں۔ ان کے جبڑے کی ہڈی تنگ ہوتی ہے۔ چہرے پر ناک نمایاں اور نیچے سے چپٹا ہوتا ہے۔ دہانہ عام طور پر چوڑا ہوتا ہے۔ کچھ گروہوں میں نچلے اعضاء دھڑ کی نسبت لمبے ہوتے ہیں۔(2)

دراوڑ اور داسیو

جیسا کہ آپ جانتے ہیں کہ زمانہ ماقبل از تاریخ میں کسی خطے کی نام سے شناخت ممکنات میں سے نہیں تھی۔ لیکن پنجاب میں آریاؤں کی آمد کے بعد سے اس خطے کی شناخت مختلف انداز سے ہوتی رہی۔ لیکن محقق اس بات پر متفق نظر آتے ہیں کہ لفظ پنجاب کی تضمین جغرافیائی ہے۔ اس سے مراد پانچ دریاؤں کی سرزمین ہے۔ لیکن دوسری طرف اسی سے مختص لفظ پنجابی سے مراد پنجابی بولنے والے ہیں۔ میرے خیال میں لفظ پنجاب کی کوئی نسلی اہمیت نہیں ہے۔ کیونکہ بہت سے پنجابی بولنے والوں کا تعلق مختلف نسلی گروہوں اور قبائل سے ہوسکتا ہے۔ لفظ پنجاب کا اشتقاقی تعلق رگ وید کے سپت سندھو سے ہے۔ فارسی دانوں نے سپت سندھو کو ہفت ہندو کر دیا کیونکہ

ان کے ہاں سنسکرت کی "س" ہے اور "پ" ف میں بدل جاتی ہے۔ بعدازاں سنسکرت میں بھی اس کو پنج ند کہا گیا ہے جو ہمارے ہاں آج بھی مستعمل ہے۔ جس کا فارسی متبادل پنج آب ہے۔ ایس ایم لطیف کے مطابق یونانی اس سرزمین کو Pentopotamia کہا کرتے تھے۔ جیسا کہ دریائے فرات اور دجلہ کے علاقے کو میسوپوٹیمیا (Mesopotamia) کہا جاتا ہے۔ پنج ند کے علاوہ یہ سرزمین ارّت بھی کہلائی۔ ہیون سانگ نے دریائے سندھ اور بیاس کے درمیانی علاقے کو "ٹک دیس" (Taka-Desa) بھی کہا ہے۔

پنجاب کے قدیم باشندوں پر بات کرتے ہوئے ہمیں ویدی، رزمیہ، پورانی، یونانی اور مسلم ماخذوں سے مدد لینی پڑتی ہے۔ پنجاب میں نسلی تضاد کی پہلی شہادت اُس وقت ملتی ہے جب آریا لہر درلہر یہاں آئے اور اُن کی یہاں پر پہلے سے بسنے والے لوگوں کے ساتھ مڈبھیڑ ہوئی۔ اپنی تعریف کے گُن گاتے ہوئے انہوں نے مقامی لوگوں کو نفرت کی نگاہ سے دیکھا۔ اُن کے لئے حقارت آمیز الفاظ استعمال کئے۔ نہ صرف یہ بلکہ اُن کے رہن سہن اور مذہب کو تنقید کا نشانہ بنایا۔ مقامی لوگوں کے لئے انہوں نے ہم صوتی دو الفاظ استعمال کئے یعنی داس اور داسیو۔ ڈاکٹر رام شرن شرما کہتا ہے کہ "ویدوں میں اندر کا ظہور داسوں کے فاتح کی حیثیت سے ہوتا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ اندر نے اسفل داس ورن کو غار میں مقید کر دیا۔ دنیا کا منتظم ہونے کے تعلق سے وہ داسوں کو محکوم بنانے کی مہم اپنے ذمہ لیتا ہے اور انہیں تباہ کرنے کے لئے تیاری کی ہدایت دی جاتی ہے۔ داس قبیلوں کو کچلنے کی درخواست رگ وید میں مندرج اِندر سے پرارتھنا کا مسلسل موضوع ہے۔ اِندر کو داسیوں کو تمام اچھے اوصاف سے محروم کرنے والے اور داسوں کو محکوم بنانے والے کے طور پر دکھایا گیا ہے۔ اِندر کے داسوں کے مقابلے میں داسیوں کو تباہ یا محکوم بنانے کے زیادہ حوالے ملتے ہیں۔"(3)

سنگھال کے نزدیک "اگر داس اور داسیو کے الفاظ داس سے مشتق ہیں جس کا مطلب ہے "تباہ کرنا تو پھر جیسا کہ وٹنی (Whitney) کا بھی خیال ہے تو پھر اس سے مراد "تباہ کرنے والا" یا "غارت گر" ہے۔ اس طرح یہ دشمن کے معنی بھی استعمال ہوتا ہے۔ بلقان کے مسلمان خانہ بدوش عیسائی خانہ بدوشوں کو داس کہا کرتے تھے۔"(4) لیکن اس کے علاوہ بھی داسیو کی اور تضامین ہیں۔

''میر اور ہیلی برانٹ داسیو کی شناخت ''داہای'' سے کرتے ہیں جو ایک ایرانی قبیلہ ہے جو کرغیز ترکمان کے میدانوں میں بستا ہے۔ اور کیپسین سے لے کر ہر دریا تک پھیلے ہوئے ہیں۔'' (5) بدھ پرکاش کا کہنا ہے کہ یہ لفظ ہند ایرانی زبان بولنے والے گروہوں کے ذریعے Finno-ugrain زبانوں میں داخل ہوا۔ اس زبان کی ووگل بولی میں ''داس'' کا لفظ ٹاس میں بدل گیا جس کے معنی ہیں ''اجنبی''۔ (6)

بہر حال ہم اب یہ کہنے کے قابل ہیں کہ مختلف حوالوں سے اس لفظ کے معنی تباہ کرنے والا، غارت گر، دشمن اور اجنبی کے طور پر مستعمل ہوئے۔

رِگ وید میں ایسے بہت سے پیرائے ہیں جن میں مقامی لوگوں کو زبان، مذہب اور شکل و شباہت کے حوالے سے آریاؤں سے مختلف بتایا گیا ہے۔ گرس ولڈ کا کہنا ہے کہ ''داسیو دراصل پنجاب کے قدیم ترین باشندے تھے اور بینز (Benes) کے مطابق نسلی طور پر وہ کول نسل کے قریب تھے۔ دوسرے یہ کہ مخی (Cerebral) حروف دراوڑی زبانوں کا خاصہ ہیں نہ کہ ہند یورپی زبانوں کا۔ اس لئے رِگ وید میں تو ایسے الفاظ مل جاتے ہیں لیکن اوستا میں یہ نایاب ہے۔ اس لئے ہم یہ نتیجہ اخذ کرتے ہیں کہ آریاؤں کے حملے کے وقت پنجاب میں دراوڑی زبانیں بولنے والے باشندے موجود تھے۔'' (7)

رِگ وید میں اکثر داسیو کا ذکر سیاہ فام، قانون شکن، اناس (بغیر ناک کے) شیطان صفت بُری زبان بولنے والے اور لنگم کی پرستش کرنے والوں کے طور پر کیا جاتا ہے۔ ویدوں میں داسیوں کے مقابلے میں داسوں کے بارے میں نرمی برتی گئی ہے۔ ہمیں یہ کہنے میں فی الحال کوئی تامل نہیں ہونا چاہئے کہ جب آریا پنجاب میں آئے تو وہ لوگ یہاں کے مقامی باشندے تھے جن کے لئے ویدوں میں داس اور داسیو کے الفاظ استعمال کئے گئے۔ دراوڑی کی اصطلاح جدید زمانے میں رابرٹ۔ اے۔ کالڈ۔ ویل (Robert A. Cald Well) نے متعارف کروائی۔ اس نے 1856ء میں اپنی کتاب (A Coprarative Grammer of South Indian Family of languages 1856) میں سنسکرت کا لفظ دراوڑ متعارف کروایا جس کے معنی ساتویں صدی کے حوالے سے ''تامل'' کے تھے۔ یہاں ہمیں دراوڑی زبان اور نسل کے مابین بھی تفریق کرنے کی ضرورت ہے۔ پروفیسر میکس مُلر نے نسلیات اور لسانیات کے علوم کو ایک ہی

لاٹھی سے ہانکنے کی سخت مخالفت کی۔ کیونکہ اس نتیجے پر پہنچنا کہ دراوڑی زبان بولنے والوں کا تعلق ضرور دراوڑی نسل سے ہوگا، غلطی کا ارتکاب کرنے کے مترادف ہوگا۔ جیسا کہ براہوی زبان دراوڑی الاصل ہے۔ لیکن اس زبان کے بولنے والوں کا تعلق ترکی ایرانی اصل سے ہے۔ ایچ رزلے دراوڑی لوگوں کا تعین یوں کرتا ہے: ''اِن کے قد عموماً چھوٹے ہیں۔ ان کا رنگ سیاہی مائل ہے جسے بالآخر سیاہ ہی کہیں گے۔ بال گھنے اور کبھی کبھی گھنگریالے بھی ہیں۔ آنکھیں سیاہ ہیں، سر لمبا ہے، ناک چپٹا ہے اور نتھنے پچکے ہوئے ہیں۔ لیکن اتنے بھی نہیں ہیں کہ چہرہ بالکل ہی سپاٹ دکھائی دے۔''

عام طور پر ماہر نسلیات یہ سمجھتے ہیں اور یہ بھی اُن ڈھانچوں سے ثابت ہوا ہے جو ہڑپہ سے نکلے ہیں کہ ان باشندوں کا تعلق Proto-Australoid اور Mediterranean نسل سے تھا جس کا اختلاط الپائنی اور منگول نسلوں سے بھی تھا۔

یہاں میں پنی قوم کا ذکر کرنا چاہوں گا۔ گو اِن کا شمار بھی مقامی لوگوں میں ہوتا ہے۔ لیکن اِنہیں ہر جگہ داس اور داسیو سے ممیّز کیا گیا ہے۔ یہ تاجر پیشہ لوگ تھے۔ کوسامبی کا خیال ہے کہ پنی نام آریائی نہیں لگتا۔ لیکن بعد ازاں ہندی زبانوں کے کئی الفاظ اس سے ماخوذ ہوئے۔ آج جِسے ہم بنیا کہتے ہیں۔ یہ لفظ سنسکرت کے وانک سے نکلا ہے اور دراصل پنی سے مشتق ہے۔ لین، دین، مول، اجرت اور سکے کو سنسکرت زبان میں پن کہتے ہیں۔ تجارتی اجناس کے کاروبار کو اِسی نسبت سے پنیہ کہا جاتا ہے۔ اوزان کے پرانے پیمانے وہی ہیں جو وادی سندھ میں رائج تھے۔ اِس لئے بہت سی ہڑپائی روایات برقرار ہیں۔

اِن پنیوں اور آریاؤں کے مابین لڑائیوں اور جھگڑوں کی کئی کہانیاں رقم ہیں۔ وہ صاحبِ ثروت تھے۔ آریا اُن سے اِس لئے ہی نفرت کرتے تھے۔ اُنہیں دولت مند، حریص، مکار اور اِندر کے مقابلے میں بگھوڑے قرار دیا گیا ہے۔ رگ وید ایک جگہ سرما دیوی کو اِندر کا پیغامبر بنا کر آریوں کے چرائے ہوئے مویشی لانے کے لئے بھیجا جاتا ہے۔ دراصل یہ خراج وصول کرنے کا ایک بہانہ ہوتا تھا۔ اِن کے درمیان بہت دلچسپ مکالمہ ہوتا ہے۔ جو ڈرامائی شکل کا ہے۔ رگ وید میں اِن کے سردار کا نام بربو بتایا گیا ہے۔ اور رشی بھرت واج نے اس کی تعریف کی ہے ایک دلچسپ بات یحییٰ امجد نے لکھی ہے ''وہ کہتا ہے کہ سدھارتھ کی بیوی بھی پنی تھی۔''

آریاؤں کی آمد

تقریباً 2000 سال ق م کے بعد پنجاب میں نسلی اعتبار سے ایک بڑی تبدیلی یکے بعد دیگرے مختلف آریائی قبیلوں کی یہاں آمد کے بعد رونما ہوئی، آریاؤں سے متعلق یکدم بہت سی مباحث کا آغاز ہوسکتا ہے کہ اُن کا اصل وطن کونسا تھا۔ یہی ایک سوال ایک الگ مضمون یا کتاب کا تقاضا کرتا ہے۔ یا پھران کی سماجیات کیا تھی۔ میں یہاں صرف یہ کہنے پر اکتفا کروں گا کہ وہ وسط ایشیا سے یہاں آئے۔ علم اشتقاق کے ماہر ابھی تک یہ گتھی بھی پوری طرح نہیں سلجھا سکے کہ اس لفظ کا ماخذ کیا ہے۔ ڈاکٹر بدھ پرکاش یہ کہتا ہے کہ آریا لفظ مشتق ہے۔ آر (r) سے جس کے معنی ہیں چلنا یا پُر حرکت رہنا۔ جو خانہ بدوش یا مسافر ہونے کی دلالت کرتا ہے۔ کچھ محقق اسے صرف ایک لسانی اکائی قرار دیتے ہیں۔(8)

بعض عالم اسے سنسکرت الاصل قرار دیتے ہیں اور کہتے ہیں کہ یہ لفظ ''ریار'' سے نکلا ہے۔ جس کے معنی ہیں ہل چلانا۔ اس طرح اس کے معنی لاطینی لفظ اراترم (Oratrum) کے بہت قریب آجاتے ہیں جس کے معنی رقبہ یا کھلی جگہ کے ہیں۔ وِل ڈورانٹ کے نزدیک اس لفظ کا اصل مطلب ''کسان'' تھا۔(9) لیکن برہمنی ادب میں آریا سے مراد وہ قوم ہے جو پنجاب میں ہندوستان کی سرحدوں کے پار سے آکر داخل ہوئی۔

جوشی اور فوجا سنگھ کہتے ہیں کہ قدیم پالی صحیفوں کے مطابق لفظ آریا تین معنوں میں مستعمل تھا۔ کبھی کبھار نسلی معنوں میں جیسا کہ آریا کو کسی غیر آریا سے تمیز کرتے وقت ایسا ہوتا تھا۔ سماجی سطح پر اس کے معنی ایک معزز شخص کے لئے جاتے تھے۔ جو پیدائشی طور پر شرفا میں سے تھا۔ اس طرح اسے داسیو یا غلام سے ممیّز کیا جا سکتا تھا۔ یا پھر اخلاقی معنوں میں نیک کردار، باحیا اور پُروقار شخص کے طور پر لیتے تھے۔ نازیوں کے ہاں آریا کی اعلیٰ نسلی ایک قفقازی (Caucasian) یا پھر ایک ناروی (Nordic) کے طور پر متعین کی جاتی تھی جو غیر سامی اور غیر یہودی ہو۔(10) مارگریٹ اور جیمز سٹنلے کہتے ہیں کہ اس کا ماخذ ویلش لفظ آرگلوڈ (Orglwydd) میں ملتا ہے جس کے معنی ہیں آقا۔ دوسرے لفظوں میں ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ وہ جو پہلے ہو یا بالا ہو یا ترجیحی ہو وہاں زمیندار کے معنی میں بھی آتا ہے۔ جو مال مویشی کا مالک ہو اور ویلش اشرافیہ کا خطاب یافتہ ہو۔(11)

لیکن روسی محققین ایک دوسرا نظریہ پیش کرتے ہیں۔گنگوسکی کے نزدیک سب سے قریب وہ تعبیر ہے جو آر۔تھائیم (R. Thieme) نے پیش کی ہے۔وہ کہتا ہے یہ لفظ اری (Ari) سے نکلا ہے جس کے معنی اجنبی ،نووارد، غیر ملکی یا بیگانے کے ہیں۔یا نوواردوں کے لئے مہمان نواز۔اس لئے آریا کے معنی میں مہمان نواز۔ایم ے ہوفر نے بھی تھائیم کی اس تعبیر کی تائید کی ہے۔(12)
آریاؤں کی گلہ بانی کو فیر سروس (Fair Servis) نے ایک خوبصورت پیرائے میں کچھ یوں سمیٹا ہے "یہ کہانی کئی ہزار سال تک دہرائی جاتی رہی ہے مندروں میں اس کے گیت گائے گئے اور پاٹ کئے گئے۔لفظوں نے وہ منظر نامہ سجایا جہاں آریاؤں کی پُر حرکت زندگی کو پیش کیا گیا کہ کیسے یہ جنگجو لوگ ایشیائے کوچک کے وسیع وعریض میدانوں سے نکل کر شمال مغربی دروں کو پار کرتے ہوئے ہندوستان کے قلعہ بند شہروں کو فتح کرنے کے لئے ٹوٹ پڑے۔وہ گھوڑوں اور رتھوں پر سوار، مویشیوں کے گلوں کو ہانکتے ہوئے ،اِندر اور اگنی کے گُن گاتے ہوئے، چڑھاوے چڑھاتے ہوئے، لڑتے جھگڑتے ناؤ نوش کی محفلیں سجاتے ہوئے، جوئے اور رقص وسرود میں محو یہاں آئے۔رگ وید میں آریاؤں کا بیان اس دنیا کی قدیم ترین رزمیہ نظموں میں سے ہے۔(13)
نسلی اعتبار سے آریاؤں کا تعلق یورپی (Europeoid) نسل سے ہے جو گروہی اعتبار سے ناروی میں شمار ہوتی ہے۔یہ ناروی عناصر صوبہ سرحد میں خصوصی طور پر پائے جاتے ہیں۔پیٹر جی کے مطابق اس نسل سے تعلق رکھنے والے زیادہ لوگ دریائے سندھ کے بالائی اور اس کے معاون دریاؤں سوات، پنجگورہ، کنڑ اور چترال کے علاقوں کے علاوہ ہندوکش کے جنوب اور پنجاب میں بھی پائے جاتے ہیں۔(14) لیکن ساتھ ساتھ وہ یہ بھی تسلیم کرتا ہے کہ نسلی اختلاط اور موسمی اثرات کی وجہ سے ان کی رنگت گندمی (Brown) اور بالوں اور آنکھوں کا رنگ سیاہ ہوتا جا رہا ہے۔

نسترح اس نسل کی خصوصیات بیان کرتے ہوئے کہتا ہے کہ ان کی جلد کا رنگ سفیدی سے گہری رنگت کی طرف مائل ہے۔جس میں سرخی اور گلابی جھلکتی ہے۔سر پر بال نرم، گھنگریالے یا سیدھے ہیں۔اور ان میں کئی رنگ ملتے ہیں اور کم گھنے ہوتے ہیں۔پیشانی سیدھی یا مائل بہ ڈھلوان ہوتی ہے۔(15)

رگ وید کے قبائل

رگ وید کے قبائل کے ذکر کا ماخذ دس راجن یدھ (دس راجاؤں کی لڑائی) ہے۔اس کا ذکر رگ وید کے ساتویں منڈل کی 83ویں مناجات میں ہے۔ان میں بھرت، پورو، یدو، دُرواس، انو، دھریو، آلینا پکھتا، بھالنا، سیوا اور روشنی کا ذکر ہے۔اس کے علاوہ دوسرے ماخذوں میں چند مزید قبائل کا بھی ذکر پایا جاتا ہے۔ان میں سے پکھتا اور بھالنا کا تعلق تو سرحد اور بلوچستان سے ہے لیکن باقی قبائل پنجاب سے تعلق رکھتے ہیں۔عام طور پر یہ سمجھا جاتا ہے کہ یہ قبائل آریائی تھے لیکن پھر بھی اس پر اختلاف پایا جاتا ہے۔

پورو قبیلے کا نام مختلف جگہوں پر مختلف انداز میں درج ہے۔بہر حال اس بات سے بہت کم لوگوں کو اختلاف ہے کہ دس راجاؤں کی لڑائی کے وقت یہ قبیلہ دریائے پرشنی (راوی) کے کنارے آباد تھا اور یہ لڑائی بھی دریائے راوی کے کنارے ہی لڑی گئی۔بدھ پرکاش کا کہنا ہے کہ لفظ پورو ایرانی الاصل ہے۔اس کا ذکر اوستا میں بھی ہے جہاں اسے پاؤرو کہا گیا ہے۔دارا اوّل کے نقش رستم میں پارو کے نام سے لکھا گیا ہے۔ان کا ایک بادشاہ پوروکتس تھا جو سورداس کا ہم عصر تھا اور اس کے خلاف لڑائی میں اپنے قبیلہ کا قائد تھا۔یہ قبیلہ چناب اور راوی کے درمیان آباد تھا۔(16) بدھ پرکاش کے نزدیک راجہ پورس جس نے سکندر اعظم کے خلاف جنگ کی وہ بھی اس قبیلہ کا راجہ تھا۔آج کل جو پوری کہلاتے ہیں ان کا تعلق بھی شاید اسی قبیلے سے تھا۔کوسامبی بھی اسی خیال کا حامی ہے۔

باشم کا کہنا ہے کہ دس راجاؤں کی لڑائی میں پورو قبیلہ سب سے طاقتور تھا۔اور یہ لوگ سرسوتی کے زیریں علاقے میں رہتے تھے۔اور بھرت کے مغربی ہمسائے تھے۔اس کے نزدیک اُن کا راجہ پوروکتس غالباً اسی لڑائی میں مارا گیا۔بعد ازاں بھرت اور پورو دونوں کورو میں ضم ہو گئے۔کیونکہ کورو کے آباؤ اجداد میں بھرت اور پورو کا نام لیا جاتا ہے۔(17) ڈوسن کے نزدیک پورو قبیلہ، یدو اور چندر بنسی خاندان کی دو اہم شاخوں کے جد امجد بتائے جاتے ہیں اور انہی کی نسل سے بعد ازاں کوروؤں اور پانڈوؤں نے جنم لیا۔

قبیلہ بھرت کا ذکر بھی دس راجاؤں کی لڑائی کی وجہ سے تاریخ میں اپنا نام پاتا ہے۔کیونکہ یہ

لڑائی بھرت قبیلہ کے راجہ سوداس نے دس راجاؤں کے خلاف لڑی تھی اور اُنہیں دریائے راوی کے کنارے شکست دی۔ یہ لڑائی ختم نہیں ہوئی بلکہ بعدازاں جمنا کے کنارے لڑی گئی۔ اس میں بھی سوداس فتح یاب ہوا۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ یہ قبیلہ بعد میں جاکر کوروکیشتر میں آباد ہو گیا۔ رامائن کے بھرت کا تعلق بھی اسی قبیلے سے تھا جو کہ رام چندر کا سوتیلا بھائی ہے۔

بعدازاں پوروں اور بھرتوں کے درمیان زبردست لڑائی ہوئی جن میں پوروں کو فتح ہوئی اور انہوں نے بھرت کی سلطنت پر قبضہ کرلیا۔ اس کے بعد یہ دونوں قبائل آپس میں گھل مل گئے اور اِن میں تمیز کرنا مشکل ہو گیا۔ یہ پورو بھرت کہلانے لگے۔ کوروں کے جنم کے بعد اُن کا ماخذ پورو اور بھرت میں تلاش کیا جاتا ہے۔ اگر ہم ان تمام حوالوں کو دیکھیں جو بھرت قبائل کے بارے اور اس نام کے راجاؤں سے منسلک ہیں تو ہمیں ایک دیو مالائی تانا بانا بھی بُنا ہوا نظر آتا ہے۔ ہمیں اُسے تاریخی حقائق سے الگ کرنے کی ضرورت ہے۔

انو ۔۔۔۔ یہ قبیلہ بھی دریائے راوی کے کنارے آباد تھا۔ اُن کے ہمسائے تُرواس تھے۔ یہ بھی پنچ جن میں سے تھا جس میں انو کے علاوہ پورو، دورہیو، ترواس اور یدو شامل تھے۔ گرفتھ کے مطابق رگ وید میں جن لوگوں کے لئے اناواس کا لفظ استعمال ہوا ہے اُن سے مراد انو قبیلے کے لوگ ہیں۔ اِبٹسن، مکلیگن اور روز کے نزدیک انو قبیلہ پنجاب کے بڑے قبائل کا جد امجد تھا۔ آٹھویں پشت میں اس سے اُسی نار اور اس کے بچوں نے جنم لیا جو شوی یا سوی، یاؤدے اور جوئیہ تھے۔ (18) کنگھم کے خیال کے مطابق موجودہ اعوانوں کا تعلق بھی اسی قبیلہ سے ہے۔ وہ جو خود کو حضرت علی کی اولاد سمجھتے ہیں اس کے لئے کوئی ٹھوس شہادت موجود نہیں ہے۔

ترواس ۔۔۔۔ ترواس دریائے راوی اور چناب کے درمیانی علاقے میں آباد تھے۔ ترواس اور یدو قبائل خونی رشتوں میں اس قدر قریب تھے کہ ہوپکنز کے نزدیک ترواس دراصل ایک یدو بادشاہ کا نام تھا اور یہ پہلے پہل جنوبی پنجاب اور راجپوتانہ میں آن بسے تھے اور سپت سندھو کے میدانوں میں نکل آئے تھے۔ ان کے بارے میں ایک رائے یہ بھی ہے کہ یہ دونوں قبائل روایتی آریائی مذہب سے الگ راستے پر چل پڑے تھے۔ اس لئے بعض حوالوں میں اُنہیں داسیو کے قریب سمجھا جاتا ہے۔ بدھ پرکاش کے نزدیک ترواس قبیلہ شاید وہی ہے جسے اوستا میں تورا کہا گیا ہے۔ وہ وسط ایشیائی میدانوں میں آئے تو ایرانی خانہ بدوش کہلائے اور انہوں نے زرتشت کی

پذیرائی کی۔ جب انہوں نے بلوچستان کا رخ اختیار کیا تو وہ علاقے جسے کسی زمانے میں توران کہتے تھے آباد کیا۔ یہ قلات کہ ہمسائے میں تھا۔ آج کل توری کوہِ سلیمان کے آس پاس آباد ہیں۔ یہ خانہ بدوش کالا باغ اور کوہستان نمک تک آ کر بس جاتے تھے۔

یدو قبیلے کے بارے میں یہ رائے پائی جاتی ہے کہ وہ دور دراز علاقوں سے آ کر یہاں آباد ہوئے اور یہ لوگ خونی رشتوں کے حوالے سے ترواس لوگوں کے زیادہ قریب تھے۔ ان کی کہانی بہت دلچسپ ہے۔ یوں لگتا ہے کہ یدو قبیلہ اُس وقت کی یادگار ہے کہ جب داسیو اور آریاؤں کے درمیان نسلی اختلاط ہوا اور اُنہیں داسیو کے قریب سمجھا جانے لگا۔ رگ وید میں اُن کے بارے میں منفی اور مثبت آراء پائی جاتی ہیں۔ دو باتیں ایسی ہیں جن پر سب کو اتفاق ہے ایک تو یہ کہ دس راجاؤں کی جنگ میں اُنہیں آریائی بتایا گیا ہے جبکہ کرشن جو سیاہ فام ہے اُسے یدوؤں سے چپقلش ہے اور وہ گوکل کے مویشیوں کو اِندر کی تباہی سے بچاتا ہے۔ ایک خیال یہ بھی ہے کہ کرشن خانہ بدوشی سے زراعت کی طرف آنے کی علامت ہے۔ اور اِسی پر پنجاب جب زراعت کی طرف گامزن ہوا تو کرشن نے یہاں اِندر کی جگہ لے لی۔ کرشن کا بھائی بلرام سم کرشنا کہلاتا تھا جس کا مطلب ہے کسان (Ploughman)۔ اس بات کی طرف داری کوسامبی نے بھی کی ہے اور وضاحت سے اس کا ذکر کیا ہے۔(19)

دروہیو چناب اور راوی کے درمیانی علاقے میں آباد تھے جسے رچنا دوآب یا ساندل باد کا علاقہ بھی کہا جاتا ہے۔ یہ اس طرح ترواس کے ہمسائے تھے۔ رشید اختر ندوی کے مطابق وہ عرصہ دراز تک سوداس کے خاندان کے خلاف صف آراء رہے۔ سوداس کے قبیلے ترتسو اور ان کے درمیان سخت قبائلی رقابت موجود تھی۔ دس راجاؤں کی لڑائی کے بعد یوں لگتا ہے کہ مخاصمت ختم ہو گئی اور ساتھ دروہیو قبیلے کے لوگ گندھارا کے علاقے کی طرف چلے گئے۔ جہاں اُن کا ادغام گندھارا قبائل میں ہو گیا۔ پرانوں میں اس بات کا ذکر موجود ہے کہ بعض گندھارا راجاؤں کا تعلق دروہیو قبیلے سے تھا۔ کچھ حوالوں سے یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ دروہیو یایاوتی اور سرمستھ کی اولاد میں سے تھے۔

یہ تو وہ قبائل تھے جن کا نام نمایاں طور پر رگ وید میں آیا ہے اور خصوصاً دس راجاؤں کی لڑائی کے حوالے سے یہ بہت اہم ہیں۔ لیکن بہت سے ایسے قبیلے بھی ہیں جن کا ذکر نہ صرف رگ وید میں موجود ہے بلکہ سکندر اعظم کے ساتھ آنے والے واقع نگاروں نے بھی اپنے حوالوں سے اُن کا ذکر

کیا ہے اور مہابھارت میں اُن کا بیان درج ہے۔ جہاں تک کوروں اور پانڈوں کا تعلق ہے اُن کا ذکر کسی قدر تفصیل کے ساتھ آخر میں کیا جائے گا۔ لیکن اُس سے پہلے اُن قبائل کا ذکر ضروری ہے جن کا نسلی تعلق آج کی نسلوں سے بھی جوڑا گیا ہے۔

ان میں سے ایک اہم قبیلہ سیوا ہے۔ جنہیں یونانیوں نے سبی لکھا ہے۔ یہ وہی قبیلہ ہے جس نے سوی پورہ کا شہر آباد کیا تھا جس کا ذکر شورکوٹ کے کتبے میں بھی ہے پت انجلی نے بھی اس کا ذکر کیا ہے۔ بدھ پرکاش کے نزدیک سیوا قبائل دریائے راوی اور چناب کے درمیانی علاقے میں رہتے تھے۔ میکرنڈل نے سیوالوگوں پر خاصی روشنی ڈالی ہے۔ اُس کے نزدیک سنسکرت کا لفظ سِوی ایسے علاقے کے بارے میں ہے جہاں سِوایا آباد ہیں۔ جنہیں کریٹس اور ڈیوڈورس نے سبی کہا ہے۔ یہ لوگ جہلم اور سندھ کے درمیانی علاقے میں آباد تھے وہ چونکہ جانوروں کی کھال پہنتے تھے اور اُن کے ہاتھ میں ایک ڈنڈا بھی ہوتا تھا اس لئے اُنہیں ہیراکلس کی اولاد بھی کہا جاتا ہے۔ لیکن یہ خالصتاً مقامی قبیلہ تھا۔ (20)

جیسا کہ میں نے پہلے ذکر کیا تھا کہ رگ وید کے بعد ہمارے پاس دو بڑے ماخذ مہابھارت اور یونانی مورخین ہیں۔ لیکن وہ قبائل جو سرسوتی کے پار جا کر آباد ہو گئے انہوں نے پنجاب کے لوگوں کو حقارت کی نظر سے دیکھا۔ اور اُن کے بارے میں ایسی باتیں کیں جو ہوسکتا ہے سچ ہوں۔ لیکن چونکہ مخاصمانہ طرز سے پیش ہوئی ہیں اس لئے اُن پر مزید تحقیق لازم ہے۔

مثلاً ایس ایم لطیف نے یوں درج کیا ہے کہ وہ اس علاقے کی عورتوں کے بارے میں کچھ یوں کہتے تھے:

> ''اِن کی عورتیں عریاں حالت میں گلے میں پھولوں کے ہار ڈالے
> گلیوں اور کھیتوں میں گھومتی ہیں اور گھوڑوں کی طرح ہنہناتی ہوئی حماموں
> کی طرف بھاگتی ہیں۔'' (21)

لیکن قدیم قبائل میں سب سے خوبصورت بیان مدرالوگوں کا ہے۔ پالی جنگوں میں مدیا مدرا کا ذکر ہے اور اُن کا مرکزی شہر ساکلا بتایا گیا ہے جو موجودہ سیالکوٹ کی جگہ پر آباد تھا۔ بدھ پرکاش کے نزدیک یہ ویدی ثقافت کا گہوارہ تھا جہاں سے بہت سے برہمن عالم فیض یاب ہوئے۔ بدھ پرکاش یہ بھی کہتے ہیں کہ یہ دراصل ایرانی الاصل تھے کیونکہ مہابھارت کے مطابق یہ وادی وائی اوس

ٹسو کی اولاد میں سے تھے۔ یہ دارا کے باپ کے نام کی سنسکرت شکل ہے جو وتسپ کہلاتا تھا۔ مدرا عورتیں بلا کی خوبصورت تھیں۔ وہ دراز قد، گوری، حسین اور الہڑ تھیں۔ اُن عورتوں کی صحبت کی یادیں دور دور تک پھیلی ہوئی تھیں۔ لیکن کرن مہابھارت میں اِن لوگوں کو جن الفاظ میں یاد کرتا ہے وہ کچھ یوں ہیں:

> ''مدرا عورتیں دراز قامت، گوری، صحت مند اور خوش خوراک ہیں۔ وہ اپنے کندھوں پر ایک کمبل اوڑھ لیتی ہیں۔ وہ پاکباز نہیں بلکہ بے شرم ہیں۔ مدرا گھروں میں ماں باپ، بیٹے بیٹیاں، رشتہ دار، سالیاں، سالے، داماد، سسر، دوست یار اور مہمان ایک دوسرے کے ساتھ آزادانہ میل ملاپ کرتے ہیں۔ ان میں خادم اور خادمائیں بھی شامل ہوتی ہیں۔''(22)

بدھ پرکاش نے یہ بھی لکھا ہے کہ پراکرت میں لفظ مدرا بدل کر ''ملا'' ہو جاتا ہے۔ کیونکہ درلا میں بدل جاتا ہے۔ وہ سمجھتا ہے کہ ملاّ بھی یونانی مورخوں کے ملّوی ہیں اور رزمیہ کے ملّوا۔ یہاں یہ بات بھی ذہن میں رکھنی چاہیئے کہ بادشاہ اسوپتی کے بیٹے مَلّو کہلائے۔ ڈسٹرکٹ فیروز پور لدھیانہ، پٹیالہ، جند اور مالیر کوٹلہ کے سکھوں کو ملّو کہا جاتا ہے۔ اولیں صحیفے اس بات کی گواہی بھی دیتے۔ وہ مدرا لوگ کرداری سطح پر بلند کردار تھے بعدازاں جاٹوں کے آنے سے اِن میں کرداری تبدیلیاں آنا شروع ہوئی۔ جاٹوں اور راجپوتوں کا ذکر مناسب جگہ پر کیا جائے گا۔

ککئے قبیلے کے بارے میں مختلف آراء ہیں:

لیسن کہتا ہے کہ وہ دریائے راوی اور بیاس کے درمیانی علاقے میں آباد تھے۔ لیکن زیادہ حقیقت پر مبنی رائے یہ ہے کہ وہ دریائے سواں سے لے کر راوی تک پھیلے ہوئے تھے۔ اُن کے بادشاہ اسواپتی کا دارالحکومت راجگرھ یا گری راج تھا۔ جسے آج کل جلال پور شریف کہا جاتا ہے۔ یہ وہی جگہ ہے جہاں سے کنگھم کے مطابق سکندر اعظم نے دریائے جہلم پار کیا تھا۔ آج کل وہاں ایک یادگار بنادی گئی ہے۔ کہا جاتا ہے کہ اسواپتی کے زمانے میں وہاں بہت امن وامان تھا اور یہ شہر علم کا مرکز تھا۔ اس کے لوگوں کی بہت تعریف کی گئی ہے کہ وہاں بدکرداری، طوائف الملوکی اور ویشائیں نہیں تھیں۔ سب پڑھے لکھے تھے۔ اس بات کی تصدیق ست پت براہمن اور چھاندوگیا

اُپنشد سے بھی ہوتی ہے۔(23) یہ بھی کہا جاتا ہے کہ ترسنکو نے ایک کیکائی شہزادی سے شادی کی تھی۔ رام چندر کی سوتیلی ماں بھی کیکئی تھی جس کے ہاں بھرت پیدا ہوا۔ اور اسواپتی نے بعد ازاں بھرت کو اپنا جانشین مقرر کیا جس نے اپنی سلطنت کی حدود گندھارا اور سندھ تک پھیلا دیں۔

سکندر کے پنجاب میں قیام کے دوران یونانی تاریخ دانوں نے جن قبائل کا ذکر کیا ہے ان میں ایک قبیلہ کاٹھیا بھی ہے جو سکندر سے نبرد آزما ہوا تھا۔ میکرنڈل نے اُسے کاتھوئی لکھا ہے اور یہ کہ وہ دریائے راوی کے مشرق میں آباد تھے۔ بعض پرانے مصنفوں نے انہیں ہندوستان کی ایک طاقتور قوم بتایا ہے۔ اُن کے نام کاٹھیاواڑ کے حوالے سے بھی لیا جاتا ہے۔ آج کل یہ ملتان اور ساہیوال کے کچھ علاقوں میں پائے جاتے ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ یہ راجپوتوں کی پنّور شاخ سے تعلق رکھتے ہیں لیکن عام طور پر وہ جاٹ سمجھے جاتے ہیں۔ میکرنڈل یہ بھی سمجھتا ہے کہ یہ وہی لوگ ہیں جنہوں نے سانگلا کے مقام پر سکندر اعظم کا ڈٹ کر مقابلہ کیا۔ ابٹسن کیپٹن الفنسٹن کے حوالے سے بات کرتے ہوئے لکھتا ہے کہ تمام جاٹوں کی طرح یہ لوگ خود کو ایک راجپوت شہزادے کی اولاد بتاتے ہوئے فخر محسوس کرتے ہیں جو اکبر کے زمانے میں مسلمان ہوئے تھے۔ لیکن تحقیقات سے یہ پتہ چلتا ہے کہ ان کا یہ دعویٰ ٹھوس بنیادوں پر قائم نہیں ہے۔ یہ خوبصورت اور مضبوط جسم کے مالک ہیں۔ جیسا کہ راوی کے کنارے بسنے والے تمام جاٹ ہیں۔ وہ بالغ ہونے تک اپنے بچوں کی شادی نہیں کرتے۔ کیونکہ ایسا کرنے سے اُن کی نسل کمزور ہو جانے کا خطرہ ہے۔(24) کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ وہ بیکانیر سے ہوتے ہوئے سرسہ اور بہاولپور پہنچے جہاں سے دائرہ دین پناہ آ گئے۔ وہاں بلوچوں سے لڑنے کے بعد سیالوں کے علاقے میں آ گئے۔ اور اُن علاقوں میں رہنے لگے جو کمالیہ اور کھرلوں کا علاقہ ہے سکندر کے حملے کے وقت مَلوا یا ملوی دریائے چناب اور راوی کے جنوبی درمیانی حصہ میں رہتے تھے۔ ان کے قریبی سدرک راوی اور ستلج کے درمیان مشرق کی طرف آباد تھے جہاں آج کل بہاوٗلپور کا علاقہ ہے۔ ایک خیال یہ بھی ہے کہ مَلوا قبیلے کا پایہ تخت ملتان تھا اور اسی جگہ سکندر زخمی ہوا تھا۔

راجپوت اور جاٹ

اب ہم ایک اہم بحث کی طرف آتے ہیں کہ راجپوت اور جاٹ کون تھے۔ راجپوتوں کی

لوک داستانیں اُنہیں آریوں کی کشتری ذات سے منسوب کرتی ہیں۔ پنجاب کے بھاٹ اِن کی شادیوں پر اِن کا حسب نسب سورج بنسی، چندر بنسی اور اگنی کل سے ملا دیتے ہیں۔ لیکن یہ سب کڑیاں داستانوں سے زیادہ اہمیت نہیں رکھتیں۔ اور یہ بھی کہا جاتا ہے کہ ساتویں صدی عیسوی سے پہلے راجپوتوں کا ذکر کہیں بھی نہیں ملتا۔ ڈاہیا کا یہ بیان زیادہ قرین قیاس لگتا ہے کہ راجپوت قبائل وسط ایشیا کے حملہ آوروں کے ساتھ میل ملاپ کا نتیجہ ہیں۔ وسط ایشیا کے وہ قبائل جو صدیوں کی بود و باش کی وجہ سے ہندو بن گئے وہ جاٹ، گوجر اور آہیر کہلائے۔ گو وہ سنسکرتی ادب میں جرت، گورجار اور ابھیر کہلاتے تھے لیکن ان میں سے وہ لوگ جو برہمنوں کی آشیر باد سے ہندو بنے وہ راجپوت کہلائے۔ (25)

آیئے اب ذرا تفصیل سے اس بات کا ذکر کرتے ہیں۔ یہ بات اپنی جگہ سچ ہے کہ لگ بھگ پانچویں صدی ق م میں ایرانیوں نے ساکاؤں اور پارتھیوں کو مختلف صوبوں میں گورنر مقرر کیا۔ سرحد میں بھی یہی لوگ گورنر تعینات ہوئے۔ دارا اور سائرس کے کتبے اس بات کی شہادت دیتے ہیں کہ اس وقت (Amyrgians) آمو دریا کے کنارے آباد تھے۔ رزلے نے چینی رسالوں سے جو مواد اکٹھا کیا اس سے یہ پتہ چلتا ہے کہ کس طرح سِی (Sse) یعنی ساکا جو جنوبی چین میں آباد تھے یونانی باختری حکمرانوں کے دور (165.BC) میں ماورالنہر کے آس پاس آ کر آباد ہو گئے تھے۔ کیونکہ یو چی قوم نے انہیں وہاں سے نکال دیا تھا۔ جو ہنوں کے حملوں کی وجہ سے نکل بھاگے تھے۔ پھر ساکاؤں نے باختر پر حملہ کر دیا۔ جب اُنہیں وہاں سے بھی نکال دیا گیا تو وہ بجستان یا سیستان میں آ کر آباد ہو گئے۔ یہ علاقہ ساکستان بھی کہلاتا تھا۔ اس کے بعد ساکاؤں نے آ کر مغربی پنجاب میں اپنی سلطنت قائم کر لی۔ عام طور پر یہی خیال کیا جاتا ہے کہ ساکا گورنری رنگت کے قفقازی تھے۔ کچھ ماہر نسلیات اور تاریخ دان یہ بھی کہتے ہیں کہ وہ جھیل ارل اور کیپسین کے علاقوں سے آئے تھے۔ چینی اُنہیں سِی و ایرانی ساکا جبکہ یونانی اور رومی اُنہیں سکائی کہتے تھے۔ انہیں ستھین بھی کہا گیا ہے۔ مارگریٹ اور سٹنلے کے نزدیک دوسری صدی عیسوی میں ساکاؤں نے افغانستان کے کچھ حصے ٹیکسلا، اُجین، مالوہ اور دکن میں ناسک پر قبضہ کر لیا تھا۔ اور یہاں وہ عرصہ دراز تک حکمران رہے۔ ساکلا یعنی موجودہ سیالکوٹ کا شہر بھی انہوں نے آباد کیا تھا اور ایک ساکا حکمران چندر ومن نے لوہے کا مشہور مینار تعمیر کیا تھا جو مہرولی دہلی میں دوبارہ لگایا گیا

ہے۔اولف کیرو کے نزدیک ساکاؤں نے نہ صرف سرحد کے نسلی خدوخال میں تبدیلیاں کیں بلکہ ان کی زبان پر بھی اثر انداز ہوئے۔نئی تحقیقات کے مطابق پشتو زبان ایک ساکا بولی سے ماخوذ ہے جو شمال سے متعارف ہوئی تھی۔اولف کیرو یہ بھی سمجھتا ہے کہ گو پشتو زبان نے ساکاؤں سے بہت کچھ لیا لیکن اس کا ماخذ ایرانی بولیاں تھیں۔(26) پروفیسر Przyluski کا کہنا ہے کہ مدرا قبائل کے پایہ تخت ساکلا اور دریائے راوی اور چناب کے درمیانی علاقے کا ساکلا دیپ کہلانا ساکاؤں کے حملے کی یاد تازہ کرتا ہے۔(27) گوتم بدھ کا شاکیہ منی کہلانا بھی ساکاؤں سے نسبت ظاہر کرتا ہے۔

دراصل یوچی، ساکا، کوشان، چیونائٹ، ہپتالیوں اور سفید ہنوں کی اصل تلاش کرنا بھی ایک مشکل کام ہے۔اس لئے وسط ایشیا سے آئے ہوئے بہت سے قبائل کے مابین تمیز کرنا مشکل ہو جاتی ہے۔صرف ہپتالیوں کو چھوڑ کر ایسا لگتا ہے کہ جیسے سب ایک ہی ہوں۔ ہندوستان کے بعض محققین کشانوں اور یوچیوں میں کوئی تمیز نہیں کرتے۔مارگریٹ اور سٹنلے کے نزدیک کوشان اُس قبائلی گروہ کا نام ہے جو تورانی اور سیتھین قبائل پر مشتمل تھا جو شمال اور مغربی ایشیاء میں پھیلا ہوا تھا۔ اُن کے ہنر و شہسواری اور جنگجوانہ قابلیت کی بنا پر انہیں یوچی کہا جاتا تھا۔جس کا چینی زبان میں مطلب ہے''سخت جان''(Hard Pads)۔(28) لیکن اس بات سے دوسرے لوگ اتفاق نہیں کرتے۔مثلاً کارپینٹر کے نزدیک چینی زبان میں یوچی کا مطلب ہے''چاند لوگ''۔یاد رہے کہ یوچیوں کے مشہور بادشاہ کنشک کے القاب میں چن ٹو چن ٹ ان یعنی سوتر لنکر شامل تھے۔یہ القابات چاند کے لئے سنسکرت کے لفظ چندرا سے ماخوذ ہیں۔(29)

یوچیوں کو رزلے کا بھی ساکا سمجھتا ہے۔اس کے نزدیک ہندسیتھیائی یوچی جو بعد ازاں توخاری کہلائے مشرقی ترکستان میں پہاڑی سلسلے تیان شان کے جنوب میں آباد تھے۔اُنہیں ہنوں نے (265-201) ق م میں شکست دی۔چینی انہیں سیاؤ یعنی یوچی صغیر کے نام سے یاد کرتے تھے تاکہ انہیں یوچی کبیر سے ممتیز کیا جاسکے جو تایوچی کہلاتے تھے۔

بی ایس ڈاہیا میساجیٹائی کی وضاحت اِن الفاظ میں کرتا ہے۔''اپنی بے پناہ طاقت کے بل بوتے پر وہ یونانیوں کے نزدیک میساجیٹائی کہلائے اور چینیوں نے اُنہیں تایوچی کہا۔دونوں کا مطلب عظیم جاٹ ہے۔میسا پہلوی زبان میں عظیم کو کہتے ہیں اور چینی زبان میں تا کا مطلب بھی

بھی ہے۔(30)

ایس کونوف بھی یوچیوں کو ہی میسا جیٹانی کہتا ہے۔ ایس ایم لطیف نے بھی تاریخ پنجاب ستھین کے پنجاب میں آباد ہونے کے ذکر کے ساتھ میسا جیٹانیوں کا بھی ذکر کیا ہے جو کہ جیٹ کہلاتے تھے۔ جن سے جاٹوں نے جنم لیا۔ اِن سب باتوں سے ظاہر ہوتا ہے کہ جاٹ، گوجر اور راجپوتوں کی اصل ایک ہے اور یہ سب وسط ایشیا سے مختلف تاریخی ادوار میں ہندوستان میں داخل ہوئے۔

اب آیئے ایک انتہائی دلچسپ لوک داستان اور رزمیہ مہا بھارت کی طرف آئیں جس کے گرد اسرار کے کئی غلاف چڑھے ہوئے ہیں۔ اور کورو اور پانڈوں کی کہانی بھی اس کے گرد گھومتی ہے۔ میں یہاں اب جو کچھ کہہ رہا ہوں اس پر زیادہ تر بات بدھ پرکاش نے کی ہے۔

کئی عالم تو اس بات پر زور دیتے ہیں کہ یہ ازمنہ وسطی میں لکھی گئی۔ کئی اسے ماقبل از ہڑپہ اور موہن جوڈرو بتاتے ہیں۔ کئی ایک یہ کہتے ہیں جن میں لیسن اور ویبر بھی شامل ہیں کہ دراصل یہ لڑائی کوروں اور پنچالوں کے درمیان چپقلش کی کہانی ہے اور اس میں پانڈوں کو بعد ازاں شامل کیا گیا ہے۔ جو زیب داستان کے لئے ہے۔ لیکن ہاپکنز کا کہنا ہے کہ پانڈوں کے بغیر مہا بھارت ایسے ہی ہے جیسے اکلیز اور ایگا مینون کے بغیر ایلیڈ سنائی جائے۔ بعض کے نزدیک یہ کہانی 500 ق۔م میں لکھی گئی اور 200 ق۔م تک اس میں پانڈوں کا اضافہ کیا گیا۔

تاریخی طور پر ایک بات تو طے ہے۔ ویدی اور برہمن ادب میں پانڈوں کا ذکر نہیں ملتا جبکہ کورو پہلے سے موجود تھے۔ جیسا کہ پہلے ذکر کیا جا چکا ہے کہ کورو دراصل بھرت اور پورو کی اولاد میں سے ہیں۔ پریکشت کا ذکر ہمیں اتھر وید میں ضرور ملتا ہے۔ لیکن وہاں وہ کوروں سے منسوب ہے۔ اس کے بیٹے جنم جے کا حوالہ بھی ہمیں ایتریا اور ست پت برہمن میں ملتا ہے۔ لیکن اُن سے ظاہر نہیں ہوتا کہ وہ پانڈوں کی اولاد تھا۔

کورو اور پانڈو

بدھ پرکاش کا یہ کہنا ہے کہ پانڈوں کا ذکر زیادہ تر بدھ ادب میں پایا جاتا ہے جبکہ ویدی ادب میں اور بعد ازاں برہمن ادب اس کے بارے میں خاموش ہے، اس بات کا ثبوت ہے کہ وہ کوروں

کے بعد منظر عام پر آئے۔

وہ یہ بھی کہتا ہے کہ کچھ ایسی نسلی خصوصیات ہیں جو انہیں واضح طور پر کوروں سے ممیز کرتی ہیں۔ایک تو یہ کہ وہ زرد رنگ کے ہیں جو انہیں منگول نسل سے منسلک کرتا ہے۔کیونکہ بدھ ادب میں یہ بتایا گیا کہ وہ پہاڑی قبائل ہیں۔دوسرے یہ کہ اُن کے ہاں بہت سے بھائی ایک ہی عورت سے شادی کرتے تھے جیسا کہ درو پدی کے ساتھ ہوا جب پانڈوں نے یہ تجویز کیا تو درو پد حیران رہ گیا لیکن انہوں نے کہا کہ درو پد یہ ہمارے رسوم و رواج کے مطابق ہے۔ہیروڈوٹس بھی یہ بتاتا ہے کہ میساجیٹائیوں کے ہاں بھائیوں کا ایک ہی عورت سے شادی کرنے کا رواج تھا۔ہفتالی بھی ایسا کرتے تھے۔یہ اس بات کا ثبوت ہے کہ وہ وسطی ایشیا سے آئے تھے۔اور باختری ہونے کے ناتے اُن میں ستی کی رسم بھی تھی جو اس وقت کے پنجاب کے باسیوں میں نہیں پائی جاتی تھی۔

ایک لمبی اشتقاقی بحث کے بعد وہ اس نتیجے پر پہنچتا ہے کہ ارجن کا تعلق یوچیوں سے تھا۔ یوچیوں اور جاٹوں کی بات پہلے ہی کی جا چکی ہے۔کہا یہی جاتا ہے کہ آج کے بہت سے قبائل اور ذاتوں نے ان اولین قبائل سے جنم لیا جن کا ذکر رگ وید، مہابھارت، اسکندر مقدونی کے ساتھ آنے والے واقع نگاروں کی تحریروں میں درج ہے۔ہندو پاکستان کی تاریخ کا ایک بہت بڑا المیہ یہ ہے کہ اولیں دستاویز صرف دیو مالائی تحریروں میں درج ہیں جن کی صحت اور سند مشکوک ہے۔ تحریری سطح پر اگر کوئی مستند دستاویز ملتی ہے تو بدھ تحریروں میں درج ہے۔

میں اپنا بیان ختم کرنے سے پہلے کچھ ذکر آشور اور ورتر کا کرنا ضروری سمجھتا ہوں۔رگ وید اور براہمنوں بعض داسیو اور ورتر کے الفاظ ایک ہی قسم کے لوگوں کے لئے استعمال ہوئے ہیں۔ رگ وید میں اِندر کو داسیو ہان یعنی داسیو کا قاتل کہا گیا ہے۔ست پت براہمن میں داسیوں کو ہی ورتر کہا گیا ہے۔اسی طرح داسیو اور ورتر کو بعض جگہوں پر آشور کے نام سے یاد کیا گیا ہے۔اولیں ہندی ادب میں آشور کو دشمن کے روپ میں نہیں دیکھا گیا بلکہ ایک علیحدہ قوم اور لوگوں کے طور پر لیا گیا ہے۔اُن کی حکمت کی بھی تعریف کی گئی ہے۔اور لوہے کے کاریگروں کے حوالے سے اُن کے ہنر کو سراہا گیا ہے۔ان آشوروں کی شناخت اسیریوں کے حوالے سے کی گئی ہے۔رشید اختر ندوی نے تو سارا زور اس بات پر لگا دیا کہ یہ سامی النسل اسیری ہی ہندی ادب میں آشور کہلائے۔اور ہجرت کے اوّلیں دور میں ہی ان کی مڈھ بھیڑ آریاؤں سے ہوگئی تھی۔ بعد ازاں اِندر آشوروں

کے درمیان چپقلش کے کئی پیرائے ہمیں رگ وید میں ملتے ہیں۔ جہاں اندر نے اُن کے مضبوط قلعوں کو تباہ کیا۔ بعدازاں براہمنوں اور مہابھارت میں بھی اِن لوگوں کا ذکر ملتا ہے۔ بعض محققین اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ داسیو ہی آشور تھے اور وہ سامی النسل تھے۔

References

1. Gankovsky, Yu. V. *The People of Pakistan,* PPH, Lahore 1973 PP-224.
2. Nestrukh, M. *The Races of Mankind,* Progressive Publishers Moscow 1966 PP-18.
3. Sharma, R.S. Sudras in Ancient India (Urdu Translation "قدیم ہندوستان میں شودر" Taraqqi Urdu Board, New Delhi 1979 PP-19.
4. Singhal, V. *India*. Volume I, PP-39.
5. Buddha Prakash, *Political and Social Movements in Acient Punjab*--Aziz Publishers, 1976 PP-34 Citing Hidlebrandt "*Vedische Mythologie* I" PP-94-116.
6. Ibid. Citing T.Burrow PP-35.
7. Furquhar and Griwold, *Religion of the Rigveda*--Oxford University Press, 19213 PP-37 Citing Baines Enthnography (in *Grundriess* 1912).
8. Ibid, PP-21.
9. Durant, W. *Oriental Heritage,* N.Y.Simon and Schuster 1954 PP-397. Foot note Citing Monier William, *Indian*

Wisdom, London 1893 PP-227.

10. Joshi and Fauja Singh, *History of the Punjab* Volume I--Punjab University Patialia 1977 PP-11.
11. Margaret and James Stutley, *A Dictionary of Hinduism*, Routledge and Kegan Paul London 1977 PP-20.
12. Gamkovsky. Yu. V. PP-46.
13. Fairservis, W.A. Jr. *The Roots of Ancient India*, University of Chicago Press Chicago 1975 PP-345.
14. Chatterji, S.K. *Vedic Age* Bhartia Vidya Bhawan Bombay 1988 PP-145.
15. Nestrukh, M. PP-23.
16. Buddha Prakash PP-77.
17. Basham, A.L. *The Wonder That was India* --- Rupa & Co. New Delhi 1993 PP-35.
18. ''تاریخ پاکستان''۔ یحییٰ امجد Sang-e-Meel Publications Lahore 1989 PP-427-432.
19. Kosambi, D.D. *The Culture and Civilization of Ancient India an Historical Outline*--Vikas Publishing House, Delhi 1985 PP-118.
20. M 'Crindle, J.W., *The Invasion of India by Alexander the Great*-Indus Publications Karachi 1992 PP-336.
21. Latif.S.M. *History of the Punjab*. PPH, Lahore PP-34.
22. Joshi and Fauja Singh-Citing-*Mahabharta*. PP-173.
23. Chandogya *Upanisad* V.II,4 and Satapatha Brahmana,

X,6,1,2.

24. Ibbetson, D. *Castes of Punjab,* Sang-e-Meel Publications Lahore PP-176.
25. Dahiya, B.S--- Jats, Sterling Publishers New Delhi 1980 PP-3.
26. Caroe, Olaf. *The Pathans,* Maqcmillan & Company, London 1962 PP-21.
27. Buddha Prakash PP-117.
28. Margaret & Stutley PP-158.
29. Buddha Prakash PP-97 Citing Charpentier, J., Die *Ethnographische Stellung der Tocharer.* PP-347-388.
30. Dahiya, B.S. PP-3.
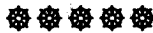
چولستان: مختصر تعارف

محمد افضل مسعود

چولستان پاکستان کا صحرائی علاقہ ہے جو بہاول پور ڈویژن کے اضلاع بہاولنگر بہاولپور اور رحیم یار خان سے صوبہ سندھ کے علاقہ تھر تک پھیلا ہوا ہے۔ چولستان کے نام کی وجہ تسمیہ یہ بیان کی جاتی ہے۔ کہ ''اِس علاقہ کے ریت کے ٹیلے ہوا کے جھکڑوں کی وجہ سے سرکتے رہتے ہیں۔ ہوا انہیں ایک جگہ سے دوسری جگہ تک پہنچاتی رہتی ہے۔ اس لئے چُلنا، جُھلنا (سرائیکی چُولن۔ چُلن اور جُھلن) کی وجہ سے علاقہ کا نام ہی چولستان پڑ گیا۔ قیام پاکستان سے قبل یہ علاقہ مسلمان ریاست بہاولپور کا حصہ تھا اس لئے اس زمانے میں بھی راجستھان سے منسلک ہونے کے باوجود اپنا الگ تشخص رکھتا تھا۔'' (1)

بہاولپور ڈویژن کا کل رقبہ تقریباً 110 لاکھ ایکڑ ہے۔ مگر زیر کاشت رقبہ کم وبیش 5ء37 لاکھ ایکڑ ہے۔ صحرائے چولستان 6665000 ایکڑ رقبہ پر محیط ہے جو کہ 480 کلومیٹر طویل اور 32 سے 192 کلومیٹر تک کے عرض کا ہے۔ اس کا جنوبی غیر آباد صحرائی حصہ 17770 مربع کلومیٹر رقبہ ریتلا اور غیر آباد ہے۔ جہاں زیر زمین پانی کی سطح 200 سے 300 فٹ تک گہری ہے۔ صحرائے چولستان کا شمالی نیم صحرائی علاقہ جو نہری علاقہ کے ساتھ منسلک ہے۔ 18130 مربع کلومیٹر ہے جہاں زیر زمین پانی کی سطح 70 سے 100 فٹ تک گہری ہے۔ (2) چولستان کے ساڑھے چھیاسٹھ لاکھ ایکڑ سے زائد رقبہ میں سے 29 لاکھ ایکڑ رقبہ پر مٹی ملی ریت کے ٹیلے ہیں۔ 24 لاکھ ایکڑ چولستانی رقبہ کی زمین ریتلی میرا اور کاشت کے لئے عمدہ کوالٹی کی ہے۔ جبکہ 13 لاکھ رقبہ میں ڈاہریں ہیں۔ یہ ڈاہریں قدرتی طور پر ایک دوسرے سے منسلک ہیں۔ ان ڈاہروں کو کبھی دریائے

نارا ہاکڑہ وگھا گھرا سیراب کیا کرتے تھے۔ دریائے ہاکڑہ وگھا گھرا نے اپنا رخ تبدیل کرلیا تو یہ علاقہ صحرا میں تبدیل ہو گیا۔ اب بھی اگر زائد بارش ہو جائے یا ستلج اور سندھ دریا کا سیلابی پانی صحرا میں درآئے تو انہی ڈاہروں میں پھیل جاتا ہے۔(3)

''بارش کے پانی سے ڈاہروں میں کئی کئی فٹ پانی جمع ہو جاتا ہے۔ عموماً گرمیوں کے موسم میں جولائی۔ اگست۔ ستمبر میں بارش ہو جاتی ہے۔ بعض اوقات سردیوں میں بھی معمولی بارش ہو جاتی ہے۔ قبل ازیں سالانہ اوسطاً بارش 10 سے 17 سینٹی میٹر تک ہو جایا کرتی تھی۔ اب گذشتہ دس سالوں سے تو اوسطاً 2 سینٹی میٹر تک بارش ریکارڈ کی جارہی ہے۔ ڈھائی سینٹی میٹر بارش ہو جائے تو ایک ایکڑ رقبہ میں ایک سوٹن پانی مہیا ہو جاتا ہے۔''(4)

ڈاہر دراصل ریت ملی مٹی کے ٹیلوں کے درمیانی علاقہ کو جو نسبتاً گہرا اور نشیبی ہوتا ہے اور یہ زمین کافی سخت ہوتی ہے ایسی زمین کو مقامی سرائیکی زبان میں ڈاہر کا نام دیا گیا ہے۔ ڈاہروں کی تین بڑی اقسام ہیں یعنی (i) چٹا ڈاہر (سفید ڈاہر) (ii) پُولا ڈاہر (نرم اور بھر بھرا ڈاہر) (iii) رتا ڈاہر (سرخ ڈاہر) یہ نام ڈاہروں کی خاص مناسبت کی وجہ سے دیئے گئے ہیں۔ چٹے ڈاہر کی زمین کا رنگ سفید اور اس کی مٹی میرا اور کلراٹھی ہے۔ بارش کا پانی ایسے ڈاہر میں جلدی جذب نہیں ہو پاتا۔ خودرو گھاس اور نباتات بھی اِس میں کم ہی ہوتی ہیں۔ یہ رقبہ ہموار اور چٹیل میدان ہے۔ اِس کی سطح زمین اتنی سخت ہے کہ اِس پر ہوائی جہاز کی فورسڈ لینڈنگ ہو سکتی ہے۔ یا اِس پر متبادل Air Strips بنائے جاسکتے ہیں۔ قریب اگر ریتلے ٹیلے نہ ہوں تو ہیلی کاپٹر آسانی سے یہاں اُتارے جا سکتے ہیں۔ پُولے یعنی نرم اور قدرے بُھر بُھرے ڈاہر کی مٹی ریتلی میرا ہے۔ مگر گہرائی میں اِس کی مٹی چکنی میرا ہے ایسے ڈاہروں میں متحرک ٹیلوں کی مٹی اور ریت بارش اور ہوا کے جھکڑوں کی وجہ سے ملتی (Mix) رہتی ہے۔ اِسی مِلاپ کی وجہ سے یہ ڈاہر نرم اور بُھر بُھرے بن گئے ہیں۔ رتے یعنی سُرخ ڈاہروں کی اوپر کی سطح کا رنگ سُرخ ہے۔ ان کی زمین قدرے ریتلی میرا اور چکنی ہے۔ رتے ڈاہروں کا رقبہ تناسب کے لحاظ سے سب سے زائد ہے۔ ایسے ڈاہروں کا رقبہ قابلِ کاشت اور زرخیز ہے۔ چولستان کے موجودہ اور قدیم ٹوبھے (تالاب) ڈاہروں کے قریب واقع ہوئے ہیں اور پُرانے قصبے ہوں یا قلعے (تعداد میں 22 کے قریب) یا قدیم شہر وہ بھی دریائے ہاکڑہ و گھاگھرا کی گذرگاہوں اور ڈاہروں کے قریب آباد ہوئے ہیں۔

چولستان میں ریت کے ٹیلوں کی دو اقسام ہیں۔

(i) پکے ٹیلے:

پکے ٹیلے بعض اوقات 500 فٹ تک بلند بھی واقع ہوئے ہیں۔ اِن کی مٹی زیادہ تر ریتلی میرا ہے جو بارش اور آندھیوں سے کم ہی متاثر ہوتی ہے۔

(ii) کچے ٹیلے:

کچے ٹیلوں کی مٹی زیادہ تر ریتلی میرا ہے جو بارش کے پانی میں حل ہوکر ڈاہروں میں پہنچتی رہتی ہے۔

چولستان کو ٹیلوں کی اونچائی یا جسامت کی بنیاد پر جہاں بڑے بڑے ٹیلے ہیں اس علاقہ کو وڈی روہی (بڑی روہی) اور جہاں ٹیلے قدرے چھوٹے اور ڈاہروں میں ملے جلے ہیں اور زیر کاشت اراضی کے قدرے قریب واقع ہیں نکی روہی (چھوٹی روہی) کہا جاتا ہے۔(5)

''بہاولپور ڈویژن کا تمام رقبہ جو نہری پانی کی آمد سے آباد ہو گیا ہے اور جہاں شہر اور قصبے آباد ہو گئے غیر چولستانی شمار ہوتا ہے۔ جبکہ ایسے علاقے جہاں نہری پانی نہیں پہنچ سکا یا نئی نہریں چولستانی علاقہ کو آباد کرنے یا زیر کاشت لانے کے لئے کھود دی گئی ہیں اور نئی آبادیاں ٹیلوں اور ڈاہروں کے قریب آباد ہیں چولستانی علاقہ کہلاتا ہے۔ نہروں کے ذریعہ زیر کاشت علاقہ کو وسیع کر کے چولستانی رقبہ کو آباد علاقہ کی شکل دیدی ہے۔ اب چولستان کے زیر کاشت یا بنجر علاقے کی ایک خاص حد کو ''چولستان ڈویلپمنٹ اتھارٹی کے حوالے کر دیا گیا ہے اور اِس کے ساتھ منسلکہ علاقہ ''کالونی ایریا'' کہلاتا ہے۔''(6)

چولستان میں دریائے ستلج دریائے گھاگھرا اور ہاکڑہ کی متروک گذرگاہوں کے قریبی علاقہ کو ہتھاڑ یا کچا اور مستقل یا نیم مستقل نہری نظام والے علاقہ کو اُتاڑ یا پکا کا نام بھی دیا جاتا ہے۔ یہ بات قابلِ ذکر ہے کہ ہتھاڑ یا کچا کے علاقوں کی ملکیت یا کاشت قدیم چولستانیوں یا سرائیکیوں کے پاس ہے جبکہ اُتاڑ یا پکا کے علاقے جو نہری نظام سے فیض یاب ہو رہے ہیں زیادہ تر پنجابی آبادکاروں کے پاس ہیں جس کو انہوں نے کسی نہ کسی طرح سے الاٹ کرا رکھا ہے یا قبضہ کر کے زیر کاشت لایا

ہوا ہے (چولستان ڈویلپمنٹ اتھارٹی اور کمشنر بہاولپور ایسے قبضہ گروپوں کے خلاف مُہم کے ہفتے منایا کرتے ہیں)۔'' (7) یہ عجیب اتفاق ہے کہ بہاولنگر سے سمہ سٹہ اور سمہ سٹہ سے بہاولپور ڈویژن کے آخری ریلوے اسٹیشن ریتی تک ایک قدرتی حد بندی سی ہوگئی ہے۔ دریائے ستلج اور پاکستان ریلوے کی لائن کے درمیانی علاقہ کا زیر زمین پانی میٹھا ہے۔ جو سندھ دریا اور ستلج کی تاریخی مشترکہ طغیانیوں کا ثمرہ ہے۔ چولستان میں زمین کا ڈھلان بھی پاکستان کے دیگر علاقوں سے قدرے مختلف ہے۔ دریائے ہاکڑہ و گھاگھرا کا پانی مشرق سے مغرب کی طرف بہتا تھا۔ جبکہ دریائے ستلج کا پانی شمال مشرق سے جنوب مغرب کی طرف بہتا ہے۔ اِس جگہ زمین کا قدرتی ڈھلان ہر فی میل کے بعد تقریباً ایک فٹ تک گہرا ہے۔

آبپاشی کے ہیڈ ورکس کے نظام سے قبل (یعنی 1922 سے قبل) گنڈا سنگھ والا۔ سلیمانکی۔ ہیڈ اسلام۔ ہیڈ پنجند کی گیارہ انہار سے بھی پہلے دریا ستلج کی دونوں اطراف نہریں موجود تھیں جو سیلاب یا بارش کے پانی کو لانے کا ذریعہ تھیں۔ اُسی نوے سال قبل تک۔ دریائے ستلج، دریائے ہاکڑہ اور پنجند سے وادی ہاکڑہ میں پانی مذکورہ دریاؤں میں آ جانے والی طغیانیوں کی وجہ سے پہنچ جایا کرتا تھا۔ ہر سال پانی میں مِل کر لاکھوں من ریت۔ سِلٹ اور چکنی مٹی چولستان میں بچھتی رہتی تھی۔ دریا اپنے راستے تبدیل کرتے رہے۔ جھکولوں آندھیوں اور بارشوں کی وجہ سے بھی چولستان کے علاقہ میں سطح زمین سے ریت اور مٹی ایک جگہ سے دوسری جگہ سفر کرتے رہے اور گذشتہ سات آٹھ سو سالوں میں زبردست اثراتی تبدیلیوں کی وجہ سے وادی ہاکڑہ و گھاگھرا کی سرسبز و شاداب وادی جہاں پانی کے وسائل، خوراک، چارہ کی فراوانی تھی چولستان کے بے آب و گیاہ علاقہ کی شکل اختیار کرگئی ہے۔'' اب یہاں مٹی کے ذرات سے بنی رَیت، سِلٹ، چکنی مٹی اور معدنی مرکبات موجود ہیں جو مختلف قسم کی معدنیات کی توڑ پھوڑ سے وجود میں آئے ہیں۔ مٹیالی اور ریتلی چٹانوں (ٹیلوں) پر بارش، ہوا، گرمی، سردی کی وجہ سے کیمیائی تبدیلیوں کا عمل لاکھوں سال سے جاری ہے۔ اس وادی ہاکڑہ میں مٹی کے ذروں کا سائز بارش، دریا کے پانی، نباتات اور بیکٹیریا کی بڑھوتری اور خاتمے سے کم سے کم تر ہوتا جا رہا ہے۔ عام زمین اور زرعی زمین میں یہ فرق ہوتا ہے کہ زرعی زمین ریت سِلٹ، چکنی مٹی کے علاوہ نامیاتی مادہ، ہوا، پانی، بیکٹیریا اور دیگر خفیہ جاندار مخلوق سے مملو ہوتی ہے۔ پانی کے قطرے اور خاکی ذرات کا بھی ایک مخصوص ربط ہوتا ہے جس کی

زرعی میدان میں گرانقدر اہمیت ہے۔"(9)

چولستان کے صحرائی خطہ ہونے کی وجہ سے اِس کا درجہ حرارت، ہوا کی رفتار، ہوا میں نمی کا تناسب، موسم، بارش اور آب و ہوا کی خصوصیات بھی جُدا گانہ ہیں۔ یہاں گرمیوں کے موسم میں دِن اور رات کے درجہ حرارت میں بڑا تفاوت ہے۔ رات کے آخری پہر میں کافی ٹھنڈک ہو جاتی ہے ریت کے ٹیلوں کی وجہ سے ہوتی ہے۔ گرمیوں میں اپریل سے ستمبر تک جنوب شمال کے رُخ (ڈکھن) تیز ہوا چلتی ہے جو ریت کے ٹیلوں کے توڑ پھوڑ کے عمل میں شدت پیدا کرتی ہے تو اِنسانوں اور جانوروں کا ریتلے گرم جھکڑوں کے چلنے کی وجہ سے جینا دوبھر ہو جاتا ہے۔ خوراک میں یہ ذرات سرایت کر کے مزید عذاب کا باعث بنتے ہیں۔ تیز آندھیوں اور جھکڑوں (ہوا جھکوڑوں) کی وجہ سے پُرانے ٹیلے ٹوٹتے اور نئے ٹیلے بنتے رہتے ہیں۔ اکثر پُرانے قدرتی راستے گم ہو جاتے ہیں اور نئے راستے وجود میں آتے ہیں۔ چونکہ چولستانی مٹی میرا اور بھاری میرا ہے۔ اِس پر ریت مٹی کی نئی تہہ جم جاتی ہے تو اِس کی طبعی خاصیت میں تبدیلی آ جاتی ہے زمین ریتلی میرا سے ریتلی بھاری میرا میں تبدیل ہو جاتی ہے۔ ہوا میں نمی کی مقدار بھی کم ہے اور اِس کے الگ اثرات مرتب ہوتے ہیں۔

"چولستان میں 800 کے قریب قدیم وجدید ٹوبھے (تالاب) ہیں۔ یہ نشیبی علاقوں میں پانی جمع کرنے کی انسانی ایجاد ہیں۔ چولستانی ٹوبھوں کی پانی جمع کرنے کی Storage Capacity 60 ملین گیلن پانی تک ہے۔ جن سے میٹھا پانی یا صرف پینے کے قابل پانی مہیا ہو جاتا ہے۔ حالانکہ بارشی پانی ڈاہروں اور ٹوبھوں میں جمع تو ہو جاتا ہے مگر پانی کے اِس اہم ترین ذخیرے کو سائنسی بنیادوں پر اسٹور نہیں کیا جاتا۔ ڈاہروں کی وٹ بندیوں کا صحیح انتظام نہیں کیا جاتا۔ نہ ہی ٹوبھوں کو مناسب طور پر زیادہ گہرا کھودا جاتا ہے اور نہ ہی اُن کے تل کو لیپا جاتا ہے تا آنکہ زمین کے پانی کو جذب کرنے کی قوت کو روکنے کے لئے کوئی مناسب بندوبست ہو۔ اِس طرح ذخیرہ آب میں کمی واقع ہو جاتی ہے۔ اِن ٹوبھوں کا پانی انسان اور جملہ جانور مشترکہ طور پر پینے کے کام میں لاتے ہیں۔"(10)

چولستان میں 90 کے قریب کنویں بھی موجود ہیں۔ جن کا پانی کھارا ہے جو جانوروں کے پلانے کے یا جنگلی خودرو نباتات کے اُگانے کے کام میں لایا جاتا ہے۔ زمینی سطح سے بعض اوقات

تین سو فٹ کی گہرائی تک کھدائی کے باوجود پانی کے کھارے ہونے کا مسئلہ برقرار ہے۔ البتہ موجگوھ۔ منصورہ اور چاپو کے مقامات پر واپڈا نے پندرہ جگہوں پر آزمائشی ڈرل کر کے نتیجہ نکالا ہے کہ اِن جگہوں کا پانی زراعت کے لئے Marginally fit ہے۔ مندرجہ بالا مقامات پر چولستان میں پائے جانے والے درختوں کی شجر کاری کر کے اور مقامی طور پر پائے جانے والے گھاسوں اور جھاڑیوں کی یا طبی طور پر استعمال میں لائی جانے والی جڑی بوٹیوں کی کاشت کر دی جائے تو صحرا کے نئے نخلستان وجود میں آ سکتے ہیں۔ اور اِن علاقوں کے قرب و جوار کا علاقہ بھی نیک صحرائی صورت اختیار کر جائے گا جس سے صحرائے چولستان کے موسم پر دوررس اثرات مرتب ہوں گے۔

چولستان کی آبادی

مردم شماری کے ایک اندازہ کے مطابق چولستان کی آبادی ایک لاکھ پچیس ہزار کے قریب ہے۔ جبکہ چار ہزار خاندان ہیں۔ آبادی کی غالب اکثریت مسلمان۔ کم تعداد میں ہندو اور بہت تھوڑے عیسائی موجود ہیں۔

چولستان کی زبانیں

چولستان میں سرائیکی۔ مارواڑی (مٹر پچکی) و پنجابی زبانیں بولی اور سمجھی جاتی ہیں۔

چولستان کے حیوانات و چرند پرند

چولستان کے جانوران کی ایک شماری کے مطابق جانور بارہ لاکھ شمار کئے گئے۔ جن میں پونے دو لاکھ گائیں۔ سات لاکھ بھیڑیں۔ تین لاکھ بکریاں اور چھ ہزار اونٹ تھے۔ سال گذشتہ اونٹوں کے سب سے بڑے بریڈر امیر آف بہاولپور نواب صلاح الدین عباسی نے ستائیس سو اونٹ اور ڈاچیاں فروخت کیں۔ بہاول پور گزیٹیر کے مطابق صحرائے چولستان میں پدبن ہارس کی پرورش اور پرداخت کا کامیاب تجربہ بھی کیا گیا تھا مگر اب وہ قصہ پارینہ بن گیا ہے۔ چولستان کی گائیں بیکانیری نسل کی ہیں جو بعد میں نیلی بار کی گائیں مشہور ہوئیں یہ رنگ میں سرخ و سفید اور سیاہ سفید ڈبے دار ہوتی ہیں۔ چولستان کے صحرا کی تمام سختیوں کو برداشت کرتی ہیں اور اگر اِن کو صحیح طور

پر کراس بریڈ کرایا جائے تو زیادہ سے زیادہ دودھ اِن سے حاصل کیا جاسکتا ہے۔ چولستانی بھیڑوں میں بچی۔ کھڈالی اور سپلی زیادہ معروف ہیں جن سے اون۔ دودھ۔ گوشت اور چمڑہ مہیا ہوتا ہے۔ چولستانی اونٹ بریلا۔ مٹر یچہ۔ مشہور ہیں دیگر اقسام بھی موجود ہیں۔ اونٹ چولستانی صحرائی جہاز ہے۔ اِنسانی سواری اور مال برداری کے کام میں لایا جاتا ہے نیز دودھ۔ گوشت۔ اون اور چمڑہ مہیا کرتا ہے۔ چولستان میں پاکستانی اقسام کی کم و بیش تمام بکریاں پائی جاتی ہیں مگر خاص روہیلی نسل مشہور ہے ان سے بھی اون۔ دودھ۔ چمڑا اور گوشت وافر مقدار میں مہیا ہوتا ہے۔ ''چولستان سے منسلک لال سوہانرا پارک اور بہاول پور ''شیر باغ'' یعنی Zoo دنیا بھر میں شیروں خاص طور پر پنجروں میں بند ببر شیروں کی افزائش کے لئے مشہور ہے۔'' (11)

چولستان کے جنگلی جانور

''اب چولستان میں قحط سالی اور خشک سالی کے باوجود ہرن کم تعداد میں موجود ہیں۔ اِن کی نسل کشی غیر ذمہ دار شکاریوں کی ہٹ دھرمی کا نتیجہ ہے۔ بہاول پور گزیٹیر کے مطابق صحرائے چولستان میں ہرن۔ پاڑے۔ نیل گائیں۔ سؤر۔ گیدڑ۔ صحرائی بھیڑیے وافر تعداد میں موجود تھے جو محکمہ شکار کی غفلت کا شکار ہوئے۔ چولستان میں پرند بھی سینکڑوں اقسام کے موسمی اور غیر موسمی پائے جاتے ہیں۔ مستقل یعنی ہر موسم میں پائے جانے والے پرندوں میں مُور۔ بُھورا اور کالا تیتر۔ بھٹیر۔ چڑیوں کی اقسام ہیں جبکہ خاص موسموں میں کشمیرا۔ باز۔ شاہین۔ کونج۔ غاسیاں۔ بٹیر۔ تلور۔ بگھڑا اور دیگر پرند بہت بڑی تعداد میں آجاتے ہیں۔'' (12) تلور کے شکار کے لئے ابو ظہبی۔ دبئ اور دیگر حکمرانوں یا اُن کے کارپردازوں کو نہ معلوم شرائط پر اجارے جاری کر دیئے گئے ہیں۔ اِس کے متبادل چولستان یا پاکستان کی مملکت یا حکومت کو کیا فوائد ملتے ہیں یہ عام لوگوں کو معلوم نہیں۔ مرغابی۔ کونج اور باز یا شاہین موسمی پرندے ہیں اگر اِن کا شکار نہ کیا جائے تو یہ واپس شمالی ٹھنڈے علاقوں میں واپس چلے جاتے ہیں۔ جن کا بھلا کسی کو کیا فائدہ ہوسکتا ہے۔ وائلڈ لائف کے عمائد ہی ان کا بھاؤ بھید جانتے ہیں۔

چولستان کے درخت اور جھاڑیاں و گھاس

چولستان کے درختوں میں سے جنڈ۔ اوکاں۔ کریٹر۔ کنڈا۔ جال (پیلو) پھوگ۔ لاٹا۔

جنگلی بیری اور کیکر مشہور ہیں۔ اِن درختوں کے پتے اونٹ۔ گائیں۔ بھیڑ۔ بکریاں کھاتی ہیں۔ لکڑی جلانے کے کام آتی ہے۔ البتہ نیم صحرائی علاقہ کے کیکر۔ شیشم۔ نیم۔ لسوڑا۔ سفیدہ کی لکڑی ٹمبر کے کام کی بھی ہے۔ جھاڑیاں کھار۔ چواہاں۔ پوئی۔ لائی۔ لاٹا مشہور ہیں۔ کھار سے کاربونیٹ سوڈا حاصل ہوتا ہے۔ جو بہت قیمتی شئے ہے اور دھلائی کے کام میں لایا جاتا ہے۔ گورکھ۔ چبھڑ۔ لمب نام کی بیلیں اور گھاس کی اقسام میں سے کترن، خس، کھوئی، تلا اور سرکنڈے پائے جاتے ہیں جو جانوروں کی اصل خوراک ہیں اور دیگر کاموں مثلاً کترن خوشبو اور خس خوشبو اور ٹیٹوں میں لگانے نیز واٹر کولروں میں لگانے کے کام آتی ہیں۔ سرکنڈوں سے چھتیں اور چقیں یا سرکیاں تیار ہوتی ہیں۔ حشرات الارض میں سے سانپ۔ بچھو۔ سانھے اور رینگنے والے کافی جاندار ملتے ہیں جو طبی ادویات میں استعمال ہو سکتے ہیں۔" (13)

چولستانی قلعہ جات

یوں تو چولستان میں ایک نقشہ کے مطابق چھوٹے بڑے بائیس قلعے موجود تھے مگر اب بھی۔ قلعہ ڈیراور۔ دین گڑھ۔ روٹ۔ موج گڑھ/ اسلام گڑھ۔ پھولڑہ۔ تاج گڑھ۔ ونجھروٹ۔ میر گڑھ۔ جام گڑ۔ ولھر۔ پتن منارہ کے آثار موجود ہیں۔ جبکہ جدید ترین قلعہ ابوظہبی محل کا اضافہ رحیم یارخاں کے قریب ہو گیا ہے۔

چولستان کے آثار قدیمہ

قلعہ جات بھی آثار قدیمہ کا نادر سرمایہ ہیں مگر چولستان کے بعض ٹھیڑوں (پکے ٹیلوں) کا تذکرہ حاصل مطالعہ ہے۔ "صحرائے چولستان میں گنویری والا کے مقام پر آثار قدیمہ کی تلاش سے دریافت ہوا کہ "وادی سندھ کی ہڑپائی تہذیب" کے آئینہ دار معلوم ہزاروں برس پرانے شہروں کی تعداد اب تین ہو گئی ہے۔ یعنی ہڑپہ۔ گنویری والا اور موہنجوڈارو۔ یہ ایک اہم حقیقت ہے کہ گنویری والا وادی سندھ کے تقریباً مرکز میں ہے جو کہ ہڑپہ اور موہنجوڈارو کے عین درمیان واقع ہے۔ گنویری والا اپنے عروج کے زمانہ میں کوئی چھوٹا موٹا گاؤں یا قصبہ نہیں تھا بلکہ کم از کم 81 ہیکٹر یعنی کوئی دوسوا ایکڑ رقبہ پر پھیلا ہوا عظیم الشان شہر تھا۔ اِس شہر کی وسعت کا اندازہ یوں لگایا جاسکتا ہے

کہ ہڑپہ سے تقریباً چالیس ایکڑ بڑا اور موہنجوڈارو سے صرف پانچ ایکڑ چھوٹا تھا۔ موہنجوڈارو کا رقبہ تراسی ہیکٹر یعنی دوسو پانچ ایکڑ اور ہڑپہ کا رقبہ پینسٹھ ہیکٹر یعنی ایک سو ساٹھ ایکڑ تھا۔ گنویری والا موہنجوڈارو کی طرح تمام خصوصیات کا حامل تھا۔ اس کا نقشہ بھی وادی سندھ کے قدیم شہروں کی طرز پر ہے۔ یعنی شہر کا ایک حصہ قلعہ نما بلندی اور دوسرا نشیبی شہری علاقے پر مشتمل ہے۔ یہاں سے ملنے والی مٹی کی تختیوں پر وادی سندھ کی تہذیب کی تصویری زبان کے شاندار نمونے بھی دستیاب ہوئے ہیں۔ دریائے ہاکڑہ۔ گھاگھرہ۔ کی خشک وادیوں کے ساتھ ساتھ چولستانی علاقہ میں ''ابتدائی ہڑپائی دور'' کے کوئی پچاس مقام دریافت ہوئے ہیں۔ ہڑپہ سے جو معلوم قدیم ترین مٹی کے برتن دستیاب ہوئے انہیں چولستان میں ''بھوت'' ملتان کے قریب جلیل پور، ٹیکسلا کے نزدیک سرائے کھولا، وادی گومل میں گوملا اور رحمان ڈھیری سے ملنے والے برتنوں کو قدامت کے لحاظ سے ایک ہی صف میں رکھا جا سکتا ہے۔ چولستان میں ہاکڑہ کی گذرگاہ کے ساتھ ساتھ جو سروے ہوا۔ وہ علمی اور آثاریاتی انکشافات اور وادی سندھ کی تہذیب کے ارتقاء پذیر ہونے کے ثبوت کے لحاظ سے انتہائی اہم ہے۔ ان خفتہ دریاؤں کے کنارے کنارے دس سے پندرہ میل تک کی چوڑی پٹی کے اندر اندر تین میل تک کل ملا کر چار سو سات پرانے مقامات کا پتہ چلا ہے۔ ان قدیم اُجڑے ہوئے مقامات سے پتہ چلتا ہے کہ چوتھی سے لے کر پہلی ہزاری قبل مسیح تک کے درمیانی عرصے میں وادی سندھ کی تہذیب طویل اور اٹوٹ ارتقائی عمل سے گزر رہی تھی۔

چولستان میں مختلف حصوں پر محیط 99 ایسے مقام ملے ہیں جو سب سے قدیم تمدنی آثار (3500 ق۔م 3000) کی باقیات اپنے دامن میں سمیٹے ہوئے ہیں۔ ساڑھے پانچ ہزار برس قبل سے لے کر پانچ ہزار برس قبل تک کے یہ قدیم آثار اونچے ٹیلوں کی صورت میں عام طور پر دستیاب ہوئے۔ جن کو ہاکڑہ آثار یا ہاکڑہ دور (4000 ق۔م تا 3000 ق۔م) کا علمی اور اصطلاحی نام دیا گیا ہے۔

اِن 99 بستیوں سے پائے جانے والے برتن بہت ممیّز اور جُداگانہ ہیں۔ ہاتھ سے بنے ہوئے اکثر برتن سُرخ رنگ کے ہیں۔ اِن میں بڑے اور موٹے برتن بھی ہیں چھوٹے اور پتلے بھی۔ بعض نوع کے برتن تو ایسے ہیں جو اس سے قبل وادی سندھ میں اور کہیں نہیں ملے اور کچھ اُن برتنوں سے مشابہہ ہیں جو جلیل پور (نزد ملتان) کے مقام پر آباد ہونے والی اولین قدیم بستی کے

آ ثار سے دستیاب ہوئے۔اور بعض برتن کوٹ ڈیجی اور انجیرہ سے ملنے والے برتنوں سے مشابہت رکھتے ہیں۔ چولستان کی ان سب قدیم بستیوں سے چھوٹی چھوٹی پیوست ٹانگوں والی جانوروں کی مورتیاں۔سیپ یا پکائی ہوئی مٹی کی چوڑیاں۔ پیسنے کے لئے پتھروں کے ٹکڑے اور بڑی تعداد میں اوزار و آلات بھی ملے ہیں۔ یہاں پتھر کی صنعت فروغ پا رہی تھی۔ چنانچہ پتھر کے چاقو۔ برمے۔ تیروں کے پھل اور کُھر چنے وغیرہ بھی ملے۔ پتھر کے ان اوزاروں کا موازنہ وادی سندھ کے عکاس دیگر علاقوں کے آ ثار سے بخوبی کیا جا سکتا ہے۔"(14) واحسرتا کہ نہ ایسے ورثہ کی حفاظت ہو رہی ہے اور نہ کما حقہ تشہیر۔فاعتبرو یا اولی البعار۔

چند تجاویز:

1- چولستان کے علاقہ پر مشتمل نیا ضلع تشکیل دیا جائے نیز چولستان کے عوام کو قومی، صوبائی اسمبلیوں، بلدیاتی اداروں میں الگ نمائندگی دی جائے۔

2- قومی اور بین الاقوامی اہمیت کے ورثہ (آ ثارِ قدیمہ) کی حفاظت کا قرار واقعی بندوبست کیا جائے۔ اِس ورثہ کی بین الاقوامی طور پر تشہیر، اور قومی میوزیم برائے چولستان قائم کیا جائے۔ ظاہر ہونے والے آ ثار قدیمہ کی اہمیت والے مقامات کو موہنجوڈارو اور ہڑپہ ایسا درجہ دیا جائے۔ بین الاقوامی اداروں کی توجہ اِس طرف مبذول کرائی جائے۔ایسے قومی ورثہ کی چوری اور لوٹ کھسوٹ کو بند کیا جائے۔اس کے متعلق معلوماتی کُتب، کتابچے اور نقشے شائع کرائے جائیں۔

3- سیاحت کے فروغ کے لئے چولستانی قلعوں کی تعمیر و مرمت کی جائے۔ٹورسٹ مقامات اور ہوٹل و موٹل پرائیویٹ اور پبلک سیکٹر میں مہیا کئے جائیں۔

4- چولستان میں سڑکیں بنا کر ٹول ٹیکس حاصل کیا جا سکتا ہے۔ چیدہ مقامات پر پیٹرول ڈیزل مہیا کیا جائے۔گاڑیوں کی موبائل سروس کا بندوبست کیا جائے۔

5- چولستانی معیشت کا فی الحال دار و مدار جانور پالنے (گلہ بانی) پر ہے۔اس لئے سبز خشک چارہ تیار کر کے فروخت کرنے۔اون کی خریداری، دودھ کی خریداری کے عمدہ مواقع یہاں موجود ہیں۔

6- اون، گتہ، شیشہ، چمڑہ۔ کھپ (پٹ سن ایسی قسم) کے علاوہ کھاد (سوڈا کاربونیٹ مہیا کرنے والی جھاڑی) اور دیگر خام مال کے مطابق کارخانے اور کاروبار شروع کرائے جاسکتے ہیں۔

7- سیر و سیاحت کے لئے۔ ٹورسٹ گائیڈ۔ گاڑیاں۔ اونٹ کام میں لائے جا کر بیروزگاری ختم کی جاسکتی ہے۔ چولستان ڈویلپمنٹ اتھارٹی۔ اینمل ہسبنڈری اور اسلامیہ یونیورسٹی بہاول پور کے ادارہ ''مطالعہ و تحقیق برائے چولستان'' کو مزید مربوط۔ منظم اور فعال بنانے کی ضرورت ہے۔

8- چولستانی اراضی کی الاٹمنٹ بند کر کے اِس کو بطور ''قومی ورثہ تہذیب'' اور ''مقام سیاحت'' کا درجہ دے کر فوائد حاصل کئے جائیں۔ چولستان کی ہیت اور حیثیت کو ''ماحولیاتی مقاصد'' کے لئے محفوظ کر لیا جائے۔ چولستانی اراضی آئندہ کسی فرد۔ ملازم یا ادارے کو الاٹ نہ کی جائے۔ زراعت صرف ملکی ضروریات کے لئے نہ کہ شمالی ممالک میں اسمگل کرنے کے لئے کی جائے۔

9- ہیڈ پنجند اور ہیڈ اسلام سے سیلاب کے دِنوں کے وافر نہری پانی چولستان کے ٹوبھوں ڈاہروں یا ہاکڑہ و گھاگھرا کی متروک گزرگاہوں میں اسٹور کر لیا جایا کرے۔

10- ہزاروں ٹن گوبر کھاد چولستان میں جانوروں کی وجہ سے پیدا ہوتی ہے اُس سے استفادہ کیا جائے۔

11- چولستان کی آبادی کے بڑے مراکز بجنوٹ۔ رسول سر۔ رینال۔ موجگڑھ۔ کندائی۔ مروٹ۔ فورٹ عباس۔ ڈیراور۔ چنن پیر اور چاپُو کے قریب ہیں۔ وہاں پینے کے صاف پانی کا بندوبست کیا جائے اور مناسب جگہوں پر پانی کی پائپ لائنیں مہیا کی جائیں۔

12- چولستان سے ملحقہ علاقوں کے اینٹوں کے بھٹوں میں توڑی۔ بھوسہ جلانے کی مستقل ممانعت کی جائے تاکہ جانوروں کے لئے چارہ وافر طور پر مہیا ہوتا رہے۔ ضرورت کے دنوں میں ونڈہ۔ چارہ۔ کانگڑی کے خصوصی بازار منعقد کرائے جائیں۔

حوالہ جات

1- مطالعہ ادارہ۔ بیرسٹر تاج لنگاہ۔ غیر شائع شدہ رپورٹ۔

2- Live Stock Condition in Cholistan ٹائپ مسودہ مرتبہ ڈاکٹر (وٹرینری) فیاض الحق۔

3- ''فصل کپاس کی جدید پروڈکشن''۔ مقالات زرعی جرنلسٹ چوہدری محمد سرور کمبوہ صفحہ 184۔

4- ایضاً صفحہ 186۔

5- ایضاً صفحہ 189۔

6- مطالعاتی دورہ۔ بیرسٹر تاج لنگاہ۔ غیر شائع شدہ رپورٹ۔

7- ایضاً۔

8- ایضاً۔

9- ''فصل کپاس کی جدید پروڈکشن'' مقالات۔ چوہدری سرور کمبوہ۔ صفحہ 189۔

10- ایضاً صفحہ 190۔

11- Live Stock Condition in Cholistan۔ ڈاکٹر فیاض الحق (ویٹرینری)۔

12- مطالعاتی رپورٹ۔ بیرسٹر تاج لنگاہ۔

13- فصل کپاس کی جدید پروڈکشن۔ چوہدری سرور کمبوہ صفحہ 189۔

14- سات دریاؤں کی سرزمین۔ ابنِ حنیف حوالہ جات/ رپورٹ ڈاکٹر محمد رفیق مُغل۔ صفحات 60-61۔ معہ پیش لفظ۔

❁❁❁❁❁
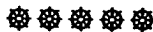
پنجاب میں مزارات اور اُن کا فنِ تعمیر

غافر شہزاد

قبر کا عام مفہوم جائے تدفین ہے اور اسی لئے اسے مدفن بھی کہا جاتا ہے مگر جب یہی قبر کسی بادشاہ یا سلطان کی ہو تو مقبرہ کہلاتی ہے، جب صوفی یا شیخ دفن ہو تو اسے مزار کہا جاتا ہے۔ مزار کا لفظ عربی زبان میں زیارت سے ماخوذ ہے گویا ایسی قبر جہاں لوگ زیارت کے لئے آئیں مزار کہلاتی ہے۔

ابتدائی طور پر انبیاء کے بارے میں کہا جاتا تھا کہ تدفین کے بعد زمین ان کے جسم کو اصل حالت میں رہنے دیتی ہے اور اس کی تطہیر نہیں ہوتی۔ اس نقطہ نظر کی توسیع شہداء کے جسد خاکی تک کر دی گئی، جب قرآن میں یہ کہا گیا کہ ان کو مردہ مت کہو یہ زندہ ہیں مگر تمہیں اس کا شعور نہیں ہے۔ اسی نسبت سے صوفیاء کو حضرت بھی کہا جاتا ہے۔ حضرت محمدؐ کے وصال کے بعد نبوت کا سلسلہ بند ہو گیا مگر بقول حضرت نظام الدین اولیاء ''صوفی اپنے مریدوں کے درمیان یونہی ہے جیسے حضرت محمدؐ اپنے صحابہ کے درمیان۔''

لہٰذا بعد از وفات جسد خاکی کی عدم تطہیر کا خیال صوفیاء کے ہاں بھی قبول کر لیا گیا اور صوفیاء کے لئے ''وصال'' کا لفظ استعمال کیا گیا۔ عقیدت مندوں اور مریدوں کا اس بات پر قوی یقین ہوتا ہے کہ وصال کے بعد بھی صوفی کی روح وہیں موجود رہتی ہے اور اس کا جسدِ خاکی قبر کے اندر اپنی اصل حالت میں جوں کا توں موجود رہتا ہے اسی لئے تو قبر کے لئے ''مرقد'' کا لفظ بھی استعمال کیا گیا جس کے معنی فارسی میں ''خوابگاہ'' کے ہیں یعنی ''سونے یا آرام کرنے کی جگہ'' اور حضرت کا لفظ جس کے معنی حاضر اور موجود ہونے کے ہیں، استعمال کیا جاتا ہے۔

صوفیاء کو ان کے حجرے میں دفن کرنے کی روایت کا آغاز حضرت محمدؐ سے ہوتا ہے جنہیں حضرت عائشہ کے حجرے میں دفن کیا گیا۔ قبر کی نشانی کو سطح زمین سے بلند کرنے کا عمل کوئی ایسا قابل تحسین نہ تھا اور قرآن کی آیات کے حوالے سے کہ ''ہم نے تمہیں اس میں سے پیدا کیا ہے اور اسی میں واپس جانا ہے اور اسی سے دوبارہ اٹھایا جائے گا'' ابتداء میں قبر کو زمین کے ساتھ ہموار کر دیا جاتا رہا۔

حضرت محمدؐ کی وفات کے چند عشروں کے بعد ہی ان کی قبر کو ارفع کر دیا گیا اور ان کے وصال کے سات عشروں بعد اس پر مزار بنا دیا گیا۔ اموی خلیفہ الولید اوّل نے مسجد نبویؐ میں آپؐ کے مزار کو نمایاں انداز میں تعمیر کرایا۔ یوں یہ مقام اہل اسلام کے لئے ایک زیارت گاہ بن گیا مگر صحابہ و اولیاء کے مزارات کی تعمیر کا سلسلہ اس کے فوراً بعد شروع نہیں ہوا۔ اسلام کی ابتدائی دو صدیوں تک تدفین بہت سادہ انداز میں ہوتی رہی تاہم نویں صدی عیسوی میں چند عباسی خلفاء کو ان کے گھروں میں دفن کیا گیا۔

چونکہ ابتداء میں قبروں کو نمایاں کرنے کی ممانعت تھی لہٰذا چند دیگر روایات نے جنم لیا۔ اہم اور صاحب حیثیت شخصیات کو ریشم واطلس کے کفن میں لپیٹ کر دفن کرنے کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ مختلف قرآنی آیات کی کڑھائی اعلیٰ قسم کے ریشم کے کفنوں پر کی جاتی اور صاحب حیثیت لوگوں کی تدفین کی جاتی رہی۔ بعدازاں اعلیٰ لکڑی کے تابوت جن پر منبت کاری کے خوبصورت نمونے بنائے جاتے تھے، شہداء اور دیگر اہم شخصیات کی تدفین کے لئے استعمال ہوتے رہے۔ اسی طرح قبر کے سرہانے کتبہ لگانے کا رواج عام ہوا۔ کتبے پر عموماً بسم اللہ، صاحب قبر کا نام، ولدیت، تاریخ پیدائش و وفات اور آخر میں مرنے والے کے لئے چند دعائیہ کلمات تحریر کئے جاتے رہے۔

ابتدائی مزارات جن کا ذکر کتابوں میں ملتا ہے وہ صحابہ کرام کی قبور پر تعمیر کئے گئے۔ بعدازاں شہدائے کربلا کی قبور پر بھی مزارات کی تعمیر کی گئی۔ مزار کی تعمیر کا مقصد محض جائے تدفین یا یادگار نہیں تھا بلکہ دوسروں کو یہ بتانا مقصود تھا کہ صاحب مزار کتنی حیثیت اور مرتبہ کا مالک ہے۔ مزارات کی تعمیر کے لئے کوئی حدود قیود بھی نہیں تھیں لہٰذا جو شخص، جس شخص کا چاہتا اور جیسے چاہتا مزار تعمیر کر سکتا تھا۔

صحابہ کرام کے مزارات کی نوعیت مذہبی نہیں تھی۔ شہدائے کربلا کے مزارات کی نوعیت

سیاسی اور مذہبی ہر دو حوالوں سے قابل تکریم و تقدیس رہی ہے لہٰذا تربت کے قریب خصوصاً پاؤں کی جانب دفن ہونے کو وجہ سعادت اور حصولِ برکت کی ضمانت سمجھا جاتا رہا ہے۔ اسی وجہ سے کہ صوفیاء، امام اور شیوخ کے مزارات وقت گزرنے کے ساتھ بہت بڑے قبرستان کی شکل اختیار کرتے رہے ہیں۔ جیسے بغداد میں امام احمد بن حنبلؒ کی جائے تدفین بعدازاں بہت بڑے قبرستان کی شکل اختیار کر گئی۔

جان اے سجان نے اپنی کتاب ''Sufism its Saints and Shrines'' مطبوعہ 1938ء میں ہندوستان میں صوفی ازم کے آغاز کے حوالے سے تین مزارات کا ذکر کیا ہے اول مزار حضرت بی بی پاک دامناں جو لاہور میں شملہ پہاڑی کے پاس محلہ محمد نگر میں ہے۔ دوئم سید سالار مسعود غازی میاں جن کی مرقد بہرائچ میں ہے اور سوئم درگاہ حضرت علی ہجویریؒ ہے جو لاہور میں بھاٹی دروازے کے باہر واقع ہے۔ حضرت بی بی پاک دامناں کا زمانہ (81-680ء) بتایا گیا ہے جبکہ سالار مسعود غازی میاں کا وصال 20-719ء میں ہوا اور حضرت علی ہجویریؒ کا یومِ وصال 1072ء کے لگ بھگ بتایا جاتا ہے۔

مزارات حضرت بی بی پاک دامناں میں سات قبور ہیں جن میں چھ بیبیاں حضرت علیؓ کے گھرانے سے متعلق ہیں ان میں بی بی رقیہ یا بی بی حاج حضرت علیؓ کی بیٹی تھیں جبکہ بی بی حور، بی بی نور، بی بی گوہر، بی بی تاج اور بی بی شہباز حضرت علیؓ کے بھائی عقیل کی بیٹیاں تھیں جبکہ ساتویں قبر بی بی تنور کی بنی جوان کی خانساماں تھی۔ یہ بیبیاں زندہ ہی زمین میں دفن ہو گئی تھیں جہاں جہاں ان کے دوپٹے نظر آ رہے تھے وہیں قبور بنا دی گئیں۔

حضرت علی ہجویریؒ کو ان کے حجرہ میں ہی دفن کر دیا گیا جبکہ غازی میاں ہندوؤں کے خلاف لڑتے ہوئے انیس سال کی عمر میں شہید ہو گئے۔ زہرہ بی بی نے غازی میاں کا مزار تعمیر کیا۔ حضرت علی ہجویریؒ نے کشف المحجوب میں صوفیاء کے بارہ گروہوں کا ذکر کیا ہے جن میں سے دس مقبول اور دو مردود قرار دیئے ہیں ان کے نزدیک اسلامی تصوف کا آغاز حضرت ابوبکر صدیقؓ سے ہوتا ہے۔ ہندوستان میں چار سلسلوں کا خصوصی ذکر ملتا ہے یہ سلاسل چشتیہ، سہروردیہ، نقشبندیہ اور قادریہ ہیں۔ دیگر سلاسل جیسے نظامی، شطاری وغیرہ انہی سلاسل کی توسیع ہیں۔

پنجاب میں سلسلہ چشتیہ کی اولین درگاہ حضرت بابا فریدالدین گنج شکر کی ہے جو اس سلسلے

کے پنجاب میں بانی بھی تھے آپ کا وصال 1265ء میں اجودھن موجودہ پاک پتن میں ہوا۔ شیخ نظام الدین اولیاء کے فرمان پر آپ کو قریبی قبرستان کے بجائے اپنے حجرہ میں ہی دفن کیا گیا۔ سلسلہ چشتیہ میں چلّہ کشی کو بنیادی اہمیت حاصل ہے اس کے علاوہ ان آستانوں پر سماع یا قوالی کو بھی خصوصی اہمیت حاصل رہی ہے اس سلسلے کے بزرگوں نے توکل پر بہت زور دیا ہے جو کچھ نذر نیاز میں اکٹھا ہوتا رات سونے سے قبل مستحقین میں بانٹ دیتے اور اس بات پر یقین رکھتے تھے کہ آنے والی صبح اپنے ساتھ ضروریات پورا کرنے کا سامان لے کر آئے گی۔

پنجاب میں اس سلسلے کے دیگر نمائندہ صوفیاء میں حضرت امام علی الحق سیالکوٹ (متوفی 1287ء)، شیخ کبیر شاہ دولہ دریائی گجرات (متوفی 1453ء)، خواجہ نور محمد مہاروی چشتیاں (متوفی 1719ء)، شاہ محمد سلمان تونسوی تونسہ شریف (متوفی 1851ء)، خواجہ شمس الدین سیالوی (متوفی 1883ء)، خواجہ غلام فرید کوٹ مٹھن (متوفی 1901ء)، پیر مہر علی شاہ گولڑہ شریف (متوفی 1937ء) شامل ہیں۔ چشتیہ سلسلے کی درگاہوں میں جماعت خانے اور لنگر خانے لازم جزو رہے ہیں سلسلہ چشتیہ کے صوفیاء دولت اور درِ حکومت سے ہمیشہ دور رہے ہیں۔ بابا فرید گنج شکر کے وصال پر امیر خورد کی دادی نے کفن کے لئے اپنی سفید چادر دی جبکہ ان کی قبر کے لئے کچی اینٹیں ان کے گھر کے دروازے کو اکھاڑ کر حاصل کی گئیں۔ یہی وجہ تھی کہ جب ان کو دفن کرنے کے لئے شہر سے باہر قبرستان لے جا رہے تھے تو ان کے بیٹے شیخ نظام الدین نے سختی سے روکا اور کہا کہ بعد میں اہل خاندان کا گزارہ کس طرح ہوگا۔ یہی بنیادی وجہ ہے کہ سلسلہ چشتیہ کی درگاہیں اپنی تعمیر میں سادہ، کم قامت اور نسبتاً کم تزئین و آرائش کی حامل رہی ہیں۔ چشتی صوفیاء خود بھی چونکہ جلالی طبیعت کے نہ تھے اور عوام و خواص میں ایک ہی سطح پر گھل مل جاتے تھے لہٰذا ان کے مزارات میں عمارتی ساخت سے زائرین پر جاہ و جلال اور رعب طاری نہیں ہوتا بلکہ زائرین کے لئے خانقاہ کا ماحول بہت دوستانہ اور گھریلو سا رہتا ہے۔ خانقاہ میں مزار کے بجائے صاحبِ مزار کی قبر کو ہی مرکزیت حاصل رہتی ہے۔

سلسلہ چشتیہ کے مزارات سائز اور قامت میں چھوٹے ہوتے ہیں لہٰذا زائرین کو بیٹھنے کی سہولت مہیا کرنے کے لئے مزار کے گرد برآمدہ، بارہ دری یا غلام گردش کی تعمیر لازم جزو بن گئی ہے۔ یہ جگہ سماع کے لئے بھی استعمال ہوتی ہے۔

پنجاب میں سہروردی سلسلہ کو حضرت بہاء الدین زکریا ملتانی نے متعارف و پروان چڑھایا۔ آپ نے 1267ء میں رحلت فرمائی۔ آپ نے اپنی زندگی میں ہی اپنا مزار تعمیر کر لیا تھا۔

سہروردی سلسلہ میں عوام اور خواص میں ہمیشہ امتیاز رہا ہے یہاں تک کہ سہروردی سلسلے کے صوفیاء کے حجروں میں داخل ہونے کے لئے عام لوگوں کو اجازت لینا پڑتی تھی۔ یہ صوفیاء ہمیشہ سے ہی حاکم وقت کے قریب اور اقتدار کے ایوانوں میں رہے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اس سلسلے سے متعلق صوفیاء کے مزارات عالی شان، ارفع، خوبصورت اور تعمیراتی جمالیات کے اعلیٰ نمونے رہے ہیں۔

سہروردی سلسلے کو پنجاب میں پروان چڑھانے میں دیگر صوفیاء میں حضرت جلال الدین بخاری سرخ پوش اچ شریف (متوفی 1291ء)، حضرت شاہ رکن عالم ملتان (متوفی 1335ء)، مخدوم جہانیاں جہاں گشت اچ شریف (متوفی 1383ء)، سید موسیٰ آہن گر لاہور (متوفی 1519ء)، حضرت موج دریا بخاری لاہور (متوفی 1604ء)، سید عبدالرزاق نیلا گنبد لاہور (متوفی 1638ء)، میاں وڈا لاہور (متوفی 1674ء) وغیرہ شامل ہیں۔

سہروردی سلسلے میں صاحب مزار کی شخصیت کی طرح ان کے مزار کی خوبصورتی، جاہ و جلال اور جمالیات زائرین پر ایک رعب طاری کرتے ہیں ان کو دیکھ کر خود ہی زائرین کے دلوں میں ایک فاصلے کا احساس پیدا ہوتا ہے جو حقیقی طور پر اس سلسلے کے صوفیاء اور عوام کے درمیان رہا ہے۔

سہروردی سلسلے کے یہ مزارات اس لئے بھی بڑے بنائے جاتے تھے تاکہ خاندان کے دیگر افراد کی تدفین کے لئے جگہ میسر آ سکے۔ چشتیوں کی درگاہوں کے برعکس سہروردی سلسلے کے مزارات کے اندر بے شمار قبور ہوتی ہیں اپنے آباء و اجداد کے پہلو میں دفن ہونے کی روایت دیگر سلاسل میں بہت ہی کم نظر آتی ہے۔ ملتان اور اچ شریف کے یہ مزارات قلعہ کے اندر شاہانہ مقام پر موجود ہیں۔

شیخ عبدالقادر جیلانیؒ کی وفات کے تین سو سال بعد پنجاب میں سلسلہ قادریہ کا تعارف سید محمد غوثؒ نے کرایا۔ کچھ عرصہ لاہور میں قیام کرنے کے بعد وہ 1428ء میں اچ شریف میں متمکن ہوئے جو پہلے سے سہروردی سلسلے کے صوفیاء کا مرکز بن چکا تھا۔ سید محمد غوثؒ کا انتقال 1517ء میں ہوا اور اچ شریف میں دفن ہوئے۔ اچ گیلانیاں انہی کی نسبت سے ہے۔

پنجاب میں اس سلسلے کے دیگر صوفیاء میں حضرت محمد غوث المعروف بالا پیر اوکاڑہ (متوفی 1552ء)، شیخ داؤد بندگی کرمانی شیر گڑھ (متوفی 1574ء)، حضرت موسیٰ پاک شہید ملتان (متوفی 1592ء)، حضرت شاہ ابوالمعالی لاہور (متوفی 1615ء)، میاں میر لاہور (متوفی 1635ء)، حضرت شاہ جمال لاہور (متوفی 1639ء)، خواجہ بہاریؒ لاہور (متوفی 1655ء)، عبدالرزاق شاہ چراغ لاہور (متوفی 1658ء)، حضرت سلطان باہو شورکوٹ (متوفی 1691ء)، شاہ عنایت قادری لاہور (متوفی 1728)، بابا بلھے شاہ قصور (متوفی 1758ء) شامل ہیں۔

سلسلہ قادریہ کے صوفیاء کے مزارات سہروردی سلسلے کے صوفیاء کے مزارات کی طرح تزئین و آرائش اور عظمت و سطوت نہیں رکھتے تاہم یہ سلسلہ چشتیہ کی طرح سادہ اور عام بھی نہیں ہیں اپنے سطحی نقشہ اور وقار میں تو سہروردیوں جیسے ہیں مگر سادگی اور عمومیت چشتیوں جیسی جھلکتی ہے چونکہ سلسلہ کے بانی سید محمد غوثؒ اچ شریف میں متمکن ہوئے جہاں سہروردی سلسلے کے خوبصورت عالی شان اور تزئین و آرائش سے بھرپور مزارات تھے لہٰذا اس تناظر میں قادری سلسلہ کے مزارات کو بھی ویسا تعمیر کرنا پڑا۔ دوسری اہم وجہ ان کا زمانہ ہے چونکہ یہ مزارات زیادہ تر پندرہویں اور سولہویں صدی میں تعمیر کئے گئے، یہ عہد مغلیہ کا دور تھا جب مغل حکمران ہندوستان کی سرزمین پر عالی شان عمارات تعمیر کر رہے تھے چونکہ کاریگر اچھے میسر تھے لہٰذا اس عہد میں قادری سلسلہ کے مزارات بھی اپنے تناسب اور قامت میں بہتر بنائے گئے۔ قادری سلسلے کے صوفیاء کے مزارات طرزِ تعمیر میں نہ تو مغلیہ عہد کی شایان شان عمارات کے معیار تک پہنچتے ہیں اور نہ ہی تزئین و آرائش اور جمالیات میں سہروردی سلسلے کے مزارات کو چھوتے ہیں۔ البتہ ان مزارات کی عمارات قامت میں بلند، تناسب میں اونچی اور ان میں ہلکی پھلکی تزئین و آرائش دیکھنے کو مل جاتی ہے۔

ہندوستان میں نقش بندی سلسلہ کا تعارف خواجہ باقی باللہ بیرنگ نے کرایا جو مرشد کے حکم پر دہلی آئے۔ تین سال بعد ان کا وصال ہو گیا۔ تاہم سید احمد سرہندی نے ہندوستان میں نقش بندی سلسلہ کو پروان چڑھایا۔ سید احمد سرہندی کو عبدالقادر جیلانی کی وصیت کے مطابق ان کا خرقہ پیش کیا گیا۔ سہروردی اور چشتی سلسلے کے صوفیاء کی ارواح نے بھی انہیں اپنے سلسلے کو آگے بڑھانے کی خواہش کا اظہار کیا۔ نقش بندی سلسلہ حضرت ابوبکر صدیقؓ سے جا ملتا ہے۔ سید احمد سرہندیؒ کا وصال 1625ء میں ہوا اور سرہند میں دفن ہوئے۔

پنجاب میں نقشبندی سلسلے کے نمائندہ شیخ طاہر لاہوری (متوفی 1630ء) اور خواجہ خاوند حضرت ایشان لاہور (متوفی 1642ء)، حضرت شیر ربانیؒ شرقپور (متوفی 1928ء) ہیں۔ ان صوفیاء کے زیادہ تر نمائندہ مزارات آزاد کشمیر اور سرہند میں ہیں۔

پنجاب میں تعمیر ہونے والے تمام سلاسل کے مزارات کو دو واضع گروہوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے اولین مربع یا مستطیل اور دوئم ہشت پہلو۔ یوں تو مربع پلان کے مزارات تقریباً تمام سلاسل کے صوفیاء کے ہاں مل جاتے ہیں تاہم قادری اور چشتی سلسلہ کے صوفیاء کے مزارات عموماً مربع یا مستطیل ہوتے ہیں۔ رابرٹ ہیلن برانڈ نے اپنی کتاب (Islamic Architecture) میں چار اضلاع سے تشکیل پانے والے اس پلان کو خلفائے راشدین کی نسبت سے جوڑا ہے مگر یہ محض قیاس آرائی ہے اور حقیقت میں ایسا کوئی التزام نظر نہیں آتا۔

مزار کے اندر داخل ہونے کے لئے دروازہ عموماً جنوبی جانب رکھا جاتا ہے تاہم موقع محل کی مناسبت سے یہ بعض اوقات شرقی یا غربی جانب بھی ہو سکتا ہے چونکہ شمالی جانب قبر کا سر ہوتا ہے لہٰذا اس جانب دروازہ نہیں بنایا جاتا۔ بہت کم مثالیں ایسی ہیں جہاں ہوا یا روشنی کے لئے شمالی جانب کھڑکی یا سنگ مرمر کی جالی نصب کی گئی ہو۔ بعض اوقات مربع پلان بالائی سطح پر ہشت پہلو شکل اختیار کر لیتا ہے تاکہ گنبد کے لئے گردنے کی تعمیر کی جا سکے۔ مغل عہد کے مزارات کم و بیش اسی انداز میں تعمیر کئے جاتے رہے ہیں۔

سہروردی سلسلے کے صوفیاء کے مزارات چونکہ حجم اور تناسب میں بڑے ہوتے تھے لہٰذا وہ مربع کے ساتھ ساتھ ہشت پہلو بھی سطحی نقشہ میں تعمیر کئے گئے۔ حضرت بہاءالدین زکریاؒ کا مزار مربع ہے جبکہ شاہ رکن عالم کا مزار ہشت پہلو ہے اچ شریف میں مربع یا مستطیل کے علاوہ ہشت پہلو مزارات کی تعمیر کی گئی۔

بصری سطح پر بھی مزارات کی تقسیم دو سطح پر کی جا سکتی ہے۔ مربع یا ہشت پہلو سطحی نقشہ والے مزارات جن پر گنبد کی تعمیر کی گئی اور دوسری قسم مربع یا مستطیل سطحی نقشہ والے مزارات جن کی چھتیں لکڑی کی ہیں اور لکڑی کے ستون ہی عمودی سہارے کے لئے استعمال کئے گئے ہیں ہر دو صورتوں میں چھت کی زیریں سطح فریسکو، نقش و نگار یا کاشی کاری سے مزین کی جاتی رہی ہے۔

سہروردی سلسلے کے صوفیاء کے مزارات کے داخلی دروازوں پر اور چشتی سلسلے کے صوفیاء کے

مزارات کے دو سے چار اطراف برآمدے کی تعمیر ایک اور امتیازی وصف کے طور پر سامنے آتی ہے کیونکہ قادری سلسلے کے صوفیاءؒ کے مزارات کے گرد برآمدے کی تعمیر شاید ہی کہیں کی گئی ہو۔ چشتی سلسلہ کے صوفیاء کے مزارات کے گرد یہ برآمدہ غلام گردش یا بارہ دری زائرین اور عقیدت مندوں کے بیٹھنے، نوافل پڑھنے یا سماع کے لئے استعمال ہوتا ہے۔ اور اس کی تعمیر سراسر ضروریاتی ہے نہ کہ جمالیاتی۔ اس کے برعکس سہروردی سلسلے کے صوفیاء کے مزارات کے داخلی دروازوں پر برآمدے کی تعمیر نہ صرف جمالیاتی سطح پر عمارت کا حصہ قرار پاتی ہے بلکہ یہ جگہ بھی خاندان کے افراد کی تدفین کے لئے استعمال ہوتی رہی ہے۔

قادری سلسلے کے صوفیاء کے مزارات کے ساتھ برآمدہ، غلام گردش یا بارہ دری کی تعمیر کا اہتمام نظر نہیں آتا البتہ جو امتیازی وصف ان مزارات کو دیگر سلاسل کے مزارات سے الگ کرتا ہے وہ یہ کہ قادری سلسلے کے صوفیاء کے کم و بیش سبھی مزارات کے گرد بلند پلیٹ فارم تعمیر کیا جاتا رہا ہے یہ پلیٹ فارم مزار کی عمارت کو نواح سے بلند کر دیتا ہے اور زائرین کے بیٹھنے کے لئے استعمال ہوتا ہے اس کی اونچائی بعض اوقات چار فٹ تک جا پہنچتی ہے۔ اور یہ عمارت کے لئے کرسی کا کام کرتا ہے۔ قادری سلسلے کے مزارات کی جمالیات ایسی ہے کہ مزار کے گرد برآمدہ یا غلام گردش اس کے بصری تاثر کو متاثر کرتے ہیں۔ اس اہتمام کے پیچھے کیا وجہ رہی ہے معاملہ تحقیق طلب ہے۔

صوفیاء کے سلاسل سے ہٹ کر پنجاب میں مزارات پر اگر طائرانہ نگاہ ڈالی جائے تو ہمیں چند مزارات ایسے ملتے ہیں جن پر عمارت تعمیر نہیں کی گئی اور محض قبر کی نشانی ہے جو کھلے آسمان تلے بغیر چھت کے صدیوں سے موجود ہے جیسے یزمان بہاولپور میں مزار حضرت چنن ؒ پیر ہے جو صحرا میں واقع ہے۔ اسی طرح فیصل صالح حیات کے آباءواجداد میں حضرت شاہ جیونہؒ کی قبر بغیر چھت کے موجود ہے۔

چند شہروں اور قصبوں کو یہ اعزاز حاصل ہے کہ ان کے نام ان کی زمین میر، دفن صاحب کرامات صوفیاء کے ناموں کی نسبت سے اپنا تشخص رکھتے ہیں جیسے میاں چنوں ،رگاہ حضرت میاں چنوںؒ کی نسبت سے ہے اسی طرح حضرت سخی سیدن شیرازیؒ کے مزار کی نسبت سے چوا سیدن شاہ اور حضرت ہو بہو کلر کہار کی نسبت سے کلر کہار کا شہر آباد ہوا۔ ساہیوال عارف والا روڈ پر بستی پناہ کمیر بھی حضرت پناہ کمیرؒ کے مزار کی نسبت سے پہچانی جاتی ہے۔

پنجاب میں چند مزارات کا امتیازی وصف ان کا جغرافیائی وقوع ہے۔صاحب مزار نے اپنی زندگی میں کسی پہاڑی مقام پر گوشہ نشینی اختیار کی،فطرت سے محبت یا عبادت الٰہی میں یکسوئی کی تلاش اگر کسی صوفی کو ایسے پہاڑی مقام پر لے گئی تو دفن ہونے کے بعد یہ ویرانہ عقیدت مندوں کی توجہ کا مرکز بن گیا جیسے مزار عبدالسلام چشتی بڑا بھائی مسرور سیالکوٹ،مزار حضرت شاہ کمال چشتی قصور،یا پھر دربار سخی سیدن شیرازی یا دربار ہو بھوکلر کہار،شہری آبادی و بستی سے باہر دور الگ تھلگ واقع ہیں۔اسی طرح اچ شریف اور ملتان کے مزارات شہر کے بلند ترین مقامات اور قلعوں کے اندر تعمیر کئے گئے یہ جگہیں آج بھی شہروں کی سطح سے بلند ہیں۔کئی مزارات ہیں جو تعمیر کے وقت شہری آبادی کے نواح میں واقع تھے جیسے درگاہ حضرت علی ہجویریؒ،مزار بابا بلھے شاہؒ،درگاہ حضرت میاں میرؒ،درگاہ شاہ دولہ دریائی،وغیرہ مگر شہروں کی توسیع اور آبادی میں اضافے کے سبب یہ مزارات آج شہری آبادی کے اہم مراکز کی حیثیت اختیار کر گئے ہیں۔

سامان تعمیرات کے حوالے سے دیکھا جائے تو چشتیہ سلسلے کے مزارات عمومی طور پر اینٹ اور گارے کی چنائی سے تعمیر کئے گئے ہیں جن پر بعدازاں چونے کا پلستر کیا گیا ہے جبکہ سہروردی اور قادری سلسلہ کے مزارات چھوٹی اینٹ اور چونے کی چنائی سے تعمیر کئے گئے ہیں چھتوں کے لئے لکڑی اور اینٹوں کے گنبد پر دو طرح سے مزارات کی تعمیر نظر آتی ہے،اندرونی دیواروں پر تزئین و آرائش کے لئے بیل بوٹے اور قرآنی آیات کے نمونے کاشی ٹائل اور فرانسیکو ہر دو انداز میں دیکھنے کو مل جاتے ہیں۔کئی مزارات میں سنگ مرمر کی جالیاں بھی خوبصورتی میں اضافہ کا سبب بنتی ہیں۔گنبد کی بیرونی سطح پر چونے کا پلستر اور پکا قلعی کیا جاتا ہے یا سبز ٹائل لگا دی جاتی ہے البتہ کچھ جگہوں پر سبز رنگ بھی گنبد خضریٰ کی نسبت سے کر دیا جاتا ہے۔گنبد کے اوپر دھات کا کلس اور زیریں سطح پر چونے کے پلستر میں بیل بوٹے یا پتے عموماً دیکھنے کو مل جاتے ہیں۔

پنجاب میں مزارات کی تعمیر کا سلسلہ کم و بیش نو صدیوں پر پھیلا ہوا ہے۔ابتدائی طور پر حضرت علی ہجویری کی درگاہ کی تعمیر لاہور میں ہوئی۔ان کا وصال 1072ء میں ہوا۔بابا فریدالدین گنج شکر کا وصال پاک پتن میں 1265ء میں ہوا۔بعدازاں ان کی قبر پر مزار کی تعمیر کی گئی۔ایک روایت کے مطابق حضرت نظام الدین اولیاء اپنے ہمراہ ساڑھے تین ہزار حفاظ لے کر پاک پتن آئے اور مزار شریف کی تعمیر میں استعمال ہونے والی ایک ایک اینٹ پر قرآن مجید پڑھا گیا۔

مزارات کی تعمیری روایت کا غالب تاثر سہروردی سلسلے کے مزارات کا بنتا ہے اس میں اولین مزار حضرت بہاء الدین زکریا کا ہے جن کا سن وصال 1267ء ہے۔ سولہویں اور سترہویں صدی میں پنجاب میں قادری سلسلہ کے مزارات کی تعمیری روایت خوب پھلی پھولی۔ ان عمارات کی جمالیات نے جہاں مغل عہد تعمیر سے اثرات قبول کئے وہاں سہروردی سلسلے کے مزارات کی روایت سے بھی استفادہ کیا۔ سکھوں اور انگریزوں کے عہد حکومت میں پنجاب میں مزارات کی تعمیر و توسیع کا کوئی سلسلہ نظر نہیں آتا بلکہ عدم توجہی اور بدتر سیاسی و سماجی حالات کے سبب عمارات کی حالت ابتر ہوتی چلی گئی۔ پاکستان کے قیام کے بعد فیلڈ مارشل محمد ایوب خان پہلا حکمران تھا جس نے سیاسی ضرورت کے پیش نظر پہلی مرتبہ مزارات کی جانب توجہ دی۔ اس نے وقف آرڈیننس 1959ء اور 1961ء کے تحت اوقاف کا محکمہ تشکیل دیا جس کا سربراہ چیف ایڈمنسٹریٹر اوقاف کہلاتا ہے اور اس کے فرائض میں مزارات کے انتظامی معاملات و تعمیر و مرمت کا اہتمام کرنا ہے یہ محکمہ ہر صوبے میں آزادانہ طور پر صوبائی حکومت کے تحت اپنی خدمات سرانجام دے رہا ہے۔ فیلڈ مارشل محمد ایوب خان نے مزارات پر منعقد ہونے والے عرسوں و دیگر تقریبات میں نہ صرف خود شمولیت کی بلکہ ڈپٹی کمشنر صاحبان کو پابند کیا کہ وہ اپنے ضلعوں میں مزارات پر ہونے والے عرسوں کی افتتاحی تقریب میں چادر پوشی کی رسم خود ادا کریں۔ ایوب خان کے بعد جنرل محمد ضیاء الحق نے عملی طور پر مزارات کی تعمیرِ نو میں دلچسپی لیتے ہوئے اس کمیٹی کی سربراہی قبول کی جس کے ذمہ حضرت علی ہجویری کی درگاہ پر تعمیرات کے ڈیزائن کا حتمی فیصلہ کرنا تھا۔ اس منصوبے کے لئے جنرل محمد ضیاء الحق نے پچاس ہزار روپے اپنی جانب سے پیش کئے اور وفاقی اور صوبائی حکومت کو پابند کیا کہ وہ تمام تعمیراتی اخراجات اٹھائیں۔

1988ء میں جب جنرل محمد ضیاء الحق نے بابا فرید پاک پتن کے مزار پر حاضری دی تو خواہش کا اظہار کیا کہ حضرت داتا گنج بخش کے کمپلیکس کی طرز پر یہاں بھی تعمیرات کا سلسلہ شروع کیا جائے۔ اس سلسلے میں بعد ازاں 26- مئی 1993ء میں محمد نواز شریف نے مسجد کی تعمیر کا سنگ بنیاد بھی رکھا۔ بعد ازاں 2- مئی 1994ء میں محترمہ بے نظیر بھٹو نے لاہور کا دورہ کیا اور گورنر ہاؤس میں دربار حضرت بی بی پاک دامناں اور دربار بابا فرید الدین گنج شکر پاک پتن میں زائرین کی سہولیات اور ترقیاتی کاموں کی خواہش کا اظہار کیا اور احکامات جاری کئے۔ محکمہ اوقاف نے 52

لاکھ دربار بی بی پاک دامناں کی تعمیرات پر صرف کئے جبکہ محترمہ بے نظیر بھٹو نے وزیراعظم ہاؤس میں بابا فرید کمپلیکس کے لئے نیس پاک (NES PAK) کے تیار کردہ ڈیزائن کی منظوری 23-جولائی 1995ء کو دی اور اس کی تعمیر کے لئے بارہ کروڑ روپے کے فنڈز مختص کئے۔
محمد نواز شریف نے 31- مئی 1999ء کو داتا دربار کمپلیکس کی تکمیل کا افتتاح کیا۔ یہ منصوبہ مجموعی طور پر اڑتیس کروڑ روپے میں پایہ تکمیل تک پہنچا۔
بابا بلھے شاہ کمپلیکس کی مجموعی تعمیراتی لاگت کا تخمینہ ساڑھے چار کروڑ روپے ہے۔ اس کے اولین فیز، جس میں مسجد کی تعمیر شامل ہے، کا افتتاح گورنر پنجاب خالد مقبول نے فروری 2002ء میں کیا مسجد کی تعمیراتی لاگت ایک کروڑ ستاون لاکھ روپے ہے جبکہ 18- ستمبر 2003ء کو وزیراعظم پاکستان میر ظفر اللہ جمالی نے نہ صرف بابا بلھے شاہ کمپلیکس کے ماسٹر پلان و ڈیزائن کی منظوری دی بلکہ اعلان کیا کہ اس کی تعمیر کے لئے ڈیڑھ کروڑ روپے وفاقی حکومت اور ڈیڑھ کروڑ روپے صوبائی حکومت مہیا کرے گی۔

مزار و مسجد حضرت داتا گنج بخش علی ہجویری کی تعمیر و توسیع کے لئے باون کنال رقبہ خریدا گیا اور اس پر چار لاکھ ساٹھ ہزار مربع فٹ کی تعمیر کی گئی ہے۔ دربار بابا فریدالدین گنج شکر کی توسیع کے لئے محکمہ اوقاف نے 1988ء میں دس مرلے پانچ لاکھ روپے کے عوض خریدے۔ 30- مئی 1997ء کو مزید توسیع کے لئے ایک کنال سولہ مرلے کی اراضی مبلغ تیس لاکھ روپے میں خریدی۔ وزیراعظم محترمہ بے نظیر بھٹو کی ہدایات کے مطابق داخلی راستے کی توسیع و زائرین کو سہولیات مہیا کرنے کے لئے جنوبی جانب دو کنال کا رقبہ ایک کروڑ سات لاکھ روپے میں خریدا گیا۔ دربار و مسجد حضرت شاہ دولہ دریائی گجرات کی تعمیر و توسیع کے لئے حکومت پنجاب نے 26- دسمبر 2002ء کو 6 کنال اور 4 مرلہ ملحقہ رہائشی و کمرشل رقبہ خریدنے کے لئے گزٹ نوٹیفیکشن جاری کیا اور فیز اول میں 2 کنال 18 مرلہ کا رقبہ خریدنے کے لئے ایک کروڑ تینتالیس لاکھ روپے کا تخمینہ لگایا ہے۔ اسی طرح دربار بابا بلھے شاہ کے توسیعی منصوبہ کے لئے ملحقہ دو کنال زمین کی خریداری کے لئے ایک کروڑ سے زائد رقم درکار ہے۔

آج مزار محض صوفی یا شیخ کی جائے تدفین نہیں بلکہ زائرین کی ہزاروں لاکھوں تک پہنچتی تعداد نے اس کی اہمیت معاشرے میں ایک سماجی ادارے کے طور پر مسلمہ کر دی ہے مسجد تو ابتداء

سے ہی مزار کا لازمی حصہ رہی ہے اس کے علاوہ کئی دیگر عناصر زائرین کی کثیر تعداد کی بدولت اہمیت اختیار کر گئے ہیں۔

آج اس امر کی شدید ضرورت ہے کہ پنجاب میں مزارات کے فن تعمیر کی روایت اور تشخص کا سنجیدگی سے مطالعہ و تجزیہ کیا جائے اور اکیسویں صدی میں مزارات کے فن تعمیر کے خد و خال واضح کئے جائیں۔ شہری و دیہی آبادی جہاں مزارات موجود ہیں ان کی تزئین و آرائش کی بحالی اور تعمیرِ نو کرتے وقت زائرین کی بڑھتی ہوئی تعداد، ان کی ضروریات اور بنیادی آسائشوں کی فراہمی کو تسلی بخش معیار پر پورا کرنے کے لئے منصوبہ بندی کی جائے ایک جانب مزارات کا تقدس و تکریم قائم رہے اور دوسری جانب ان کے تعمیراتی تشخص کی روایت آگے بڑھے اور زائرین و عقیدت مندوں کو جسمانی و روحانی ہر دو سطحوں پر اطمینان نصیب ہو۔

❁❁❁❁❁

پنجاب کا ابتدائی برطانوی دور: آبادکاری اور نہری نوآبادیاں

پرویز وندل/سعود الحسن خان

شروع میں ہی یہ کہہ دیا جائے کہ اس مضمون کے لکھنے میں ڈاکٹر مبارک علی اور پرویز ظفر علی خان کی مدد کا میں بے حد مشکور ہوں۔

سیٹلمنٹ (Settlement) کے مطلب کی وضاحت ضروری ہے۔ یہ عوام کی زمین پر آبادکاری نہیں ہے۔ انگریز کے آنے سے پہلے سرکار کا حصہ یعنی مالیہ واضح نہیں تھا۔ گویا Unsettled تھا۔ انگریز مالیہ اور مالیہ کی بنیاد کو واضح کرتے اور ایک خاص رقم فکس کرتے تھے اور یہ بھی کہ یہ رقم کس شخص کو دینا ہوگی اور یوں ایک خطہ زمین کی ملکیت ایک دور کے لئے اُس شخص کی ہو جاتی۔ جب سیٹلمنٹ (Settlement) پکی ہوتی تو وہ آدمی مالک ہو جاتا۔ یوں زمین کی ملکیت کی ایک نئی بنیاد پڑی۔ اسے مالیہ کے ساتھ ملا دیا گیا۔

''Illustrated London News'' لندن کا ایک ہفتہ وار رسالہ تھا۔ اس کے 28۔ مارچ 1846ء کے شمارے میں ایک مضمون میں لکھا گیا تھا کہ ''اگر پنجاب کو تاج برطانیہ کی عملداری میں فوری طور پر لے لیا جائے تو وہ ایک نہایت قیمتی اثاثہ بن سکتا ہے۔ پنجاب میں بہت زیادہ معدنی دولت ہے اس کی زراعتی پیداوار کو ایک سوچے سمجھے آبپاشی نظام کے تحت ایک غیر معینہ حد تک بڑھایا جا سکتا ہے۔ یاد رہے کہ یہ زمانہ ابھی کمپنی کی حکومت کا دور تھا۔ لکھنے والے نے ایک

جانب تو کمپنی کی حکومت کے خاتمہ کی طرف اشارہ کیا اور دوسرے جانب اس نے ثابت کیا کہ وہ پنجاب کے حالات سے واقف ہے اور وہاں کے زرعی پیداوار میں اضافہ کے امکانات کے بارے میں پورا علم رکھتا ہے۔ گویا انگریز پنجاب کی امکانی دولت سے بخوبی واقف تھا۔ وہ صرف رنجیت سنگھ کی وفات کا منتظر تھا۔ اس کی پنجاب پر قبضہ کی تاویلیں کوئی مطلب نہیں رکھتیں۔ وہ اس پر ہمیشہ سے نظر رکھے ہوئے تھے۔ بلاشبہ پنجاب پر اپنے ایک سو سالہ قبضے کے دوران برطانیہ نے ''زرعی پیداوار کی غیر معینہ بڑھوتری'' کے ذریعے اپنی آمدنی میں بے پناہ اضافہ کیا۔ یہ سب کچھ مغربی پنجاب کے ان دوآبوں میں نہری آبپاشی کے کرنے سے ہی ہوا۔ یہ دوآبے اس وقت پاکستانی پنجاب میں ہیں۔ برطانیہ کے اس عمل یعنی نہروں اور نہروں کے حوالے سے نئی آبادیوں کے قیام کے نتیجہ میں مقامی آبادی کی بڑی تعداد گھر سے بے گھر اور نقل مکانی پر مجبور ہوئی اور اس علاقے کی معیشت، ماحولیات اور ثقافت مکمل طور پر بدل گئی۔ یہ مقالہ کچھ ایسے اثرات کا جائزہ لیتا ہے۔

برطانیہ نے 1846ء میں پنجاب کو مؤثر طور پر فتح کر لیا اور اس وقت یہاں پر ایک ریذیڈنٹ (resident) کا تقرر کیا گیا جو سکھ حکومت کی نگرانی کیا کرتا تھا۔ البتہ 1849ء کی جنگ کے بعد میں اس کا مکمل الحاق کر دیا گیا۔ مقامی لوگوں کی حکومت کی تمام اشکال مٹا دی گئیں۔ مہاراجہ دلیپ سنگھ کو معزول کر دیا گیا اور حکومت کمپنی بہادر یعنی ایسٹ انڈیا کمپنی کی ہو گئی۔

پنجاب میں جو نظام لاگو کیا گیا وہ بنگال و بہار کے ان نظاموں سے کافی مختلف تھا جو ان علاقوں کی فتح کے وقت وہاں پر لاگو کئے گئے تھے یعنی بجائے کوئی واحد حکمران یا گورنر مقرر کرنے کے لیفٹیننٹ کرنل سر ہنری ایم لارنس (Lt. Col. Sir Henry Lawrance) کی صدارت میں ایک انتظامی بورڈ بنایا گیا۔ کرنل لارنس کو امور پنجاب میں کافی تجربہ تھا وہ لاہور کے سکھ دربار میں ہندوستان کے برطانوی گورنر جنرل کے نمائندے رہے تھے، انہوں نے 1846ء کے بعد نوعمر مہاراجہ دلیپ سنگھ کے دور میں ریذیڈنٹ کے طور پر بھی فرائض سرانجام دیئے تھے۔ بورڈ کے دیگر اراکین اس کا بھائی جان لارنس جو جالندھر دوآبہ کے کمشنر کی حیثیت سے امور پنجاب میں بڑا تجربہ کار تھا اور مسٹر چارلس مینسل تھے جو کمپنی کا سول سرونٹ تھا اور آگرہ میں شعبہ مالیات میں خدمات سرانجام دے چکا تھا۔ اسے اب یہاں پر مالیاتی رکن کے فرائض سونپے گئے تھے۔ یوں پنجاب ایک بورڈ کے سپرد ہوا۔

گورنر جنرل نے بورڈ کے چلانے کے لئے عمومی ہدایات جاری کیں۔ایک خط میں اس نے لکھا ''گورنر جنرل مقامی اداروں و رسومات کو قائم رکھنے کا خواہشمند ہے۔'' اور یہ بھی کہ ''ہر سول ادارے کو یعنی بورڈ سے لے کر کاردار تک سب کو عدالتی، مالیاتی اور مجسٹریسی (انتظامی) اختیارات عطا کئے جانے چاہئیں''، ''پولیس کے حوالے سے گورنر جنرل اس بات کا خواہشمند نہیں ہے کہ ہمارے ملک کے طول وطویل قوانین کو اس ملک میں متعارف کروایا جائے'' اور ''ہمارے پرانے صوبوں میں (افسران کو) جو صوابدیدی اختیارات حاصل ہیں اس سے زیادہ اختیارات یہاں پر دیئے جائیں'' اور اسی طرح کی اور بہت سی باتیں۔ بنیادی مقصد ضوابط کو سادہ بنانا اور مقامی افسر کے اچھے شعور پر منحصر ایک استبدادی (Autocratic) نظام قائم کرنا تھا۔یوں افسروں کی صوابدید بلا روک ٹوک تھی اور وہ شخصی سطح پر وفاداریوں کا جائزہ لے کر ان کا سودا کر سکتے تھے۔نظام سادہ تھا۔ انگریز افسر ایک گورا راجا تھا۔اور جب تک وہ نیک طینت تھا تو مؤثر تھا۔گورنر جنرل کو 1846ء میں کیا اندازہ تھا کہ 1947ء کے بعد یہ صوابدیدی نظام کیا کیا رنگ دکھائے گا!

بہر حال اپنے اقتدار کو یکجا کرنے کی غرض سے برطانیہ نے 1852ء میں لاہور میں چھاؤنی تعمیر کی اور پنجاب میں ''انعام اور جبر'' کی پالیسی اپنائی۔لالچ اور انعام کے ذریعے بااثر لوگوں سے وفاداری کی یقین دہانی لی جاتی تھیں اور ساتھ ساتھ وہ چھڑی یا ڈنڈے کا بھی سختی سے استعمال کیا کرتے تھے۔سکھوں نے جن لوگوں کو جاگیریں اور جائیدادیں عطا کی تھیں ان میں سے صرف ان لوگوں کا احترام کیا گیا اور ان کی ملکیتوں کی توثیق کی گئی جنھوں نے وفاداری کا یقین دلایا۔اور جو لوگ مشکوک تھے ان کی زمینیں ضبط کر لی گئیں۔یہ ''انعام اور جبر'' کی پالیسی اتنی کامیاب رہی تھی کہ الحاق پنجاب کے صرف 8 سال کے بعد 1857ء میں برطانیہ کے سابقہ پنجابی دشمنوں نے برطانیہ کو دہلی دوبارہ فتح کرنے میں مدد دی۔

پنجاب کی نو آبادکاری

سیٹلمنٹ (Settlement) سے مراد ہے کہ مالیہ کی تشخص اور اس کا تعین کیا جائے اور اس حوالے سے اراضی پر ملکیتی حقوق کی توثیق کی جائے۔یہ حقوق یکساں طور پر عطا نہیں کئے جاتے تھے۔یہ مدت تین برس سے لے کر ہمیشہ تک ہو سکتی تھی اور وہ متعلقہ شخص کے کردار کے مطالعے پر

منحصر ہوتی تھی۔صریحی طور پر جن لوگوں نے سکھوں کی جنگ میں برطانیہ کی مدد کی (اور یوں سکھوں سے غداری کی) ان کو بہت زیادہ انعام دیا گیا۔ان میں سب سے اول سکھ دربار کے ڈوگرا برادران تھے جن کو کشمیر دے دیا گیا اور برطانیہ نے ڈوگروں کو کشمیر سپرد کیے جانے کو یقینی بنانے کے لئے وہاں کے سابقہ حکمران گورنر شیخ عمادالدین کو زبردستی بے دخل کر دیا۔

برطانیہ نے جو نوآبادکاری کا عمل شروع کیا تھا اس کے مقاصد درج ذیل تھے:

اول: مقامی آبادی کے درمیان موجود نظامہائے مراتب (hierarchies)، سماجی تعلقات اور ان کی ساخت کو کم سے کم ممکنہ حد تک تبدیل کرنا اور صرف ان لوگوں کو منظر عام سے ہٹانا جو مزاحمت کرتے اور جن سے مزاحمت کا خطرہ ہوتا۔

دوم: سب پر یہ واضح کر دینا کہ برطانوی حکمران حقیقی ''مائی، باپ'' ہیں جو کہ جاگیرداروں اور سرداروں کو بنا بھی سکتے ہیں اور ختم بھی کر سکتے ہیں۔ برطانوی نوکر شاہیہ نے اپنی واحد صوابدید پر ہی جائیداد سے ہونے والی آمدنی کی تشخیص کی اور اسی عمل میں انہوں نے ملکیت کی شرائط طے کیں۔موجودہ سماجی ڈھانچے میں جن سرداروں اور بااثر اشخاص نے برطانوی حکومت کو قبول کر لیا اور ان سے اتفاق کیا ان کو واجب انعام دیا گیا اور جن لوگوں کا رویہ باغیانہ تھا ان کو سزا دی گئی۔یوں ایک ڈی۔سی تمام سرداروں پر حاوی تھا۔

ان مقاصد کے حصول کے لئے برطانیہ نے ایک ایسا باقاعدہ انتظامی ڈھانچہ بھی تشکیل دیا جس میں مخالف فریق کو عدالت میں اپیل کرنے کی اجازت تھی تاکہ شامل مقدمہ فریقین اگر کسی ابہام یا ناانصافی کا شکار ہوں تو اس کا حل نکالا جائے۔مزید انہوں نے ایسے انفرادی برطانوی آفیسروں کی ذاتی کوششوں کو بھی روشن و نمایاں کیا کہ جن کے فیصلے انصاف پر مبنی ہوتے تھے اور وہ لاقانونیت کے خلاف سختی سے عمل کرتے تھے۔نوجوان افسران کو مکمل اور کامل اختیارات کے ساتھ بڑے بڑے اضلاع سپرد کیے گئے اور انہوں نے ہی بدعنوانیت سے آزاد ''گورا صاحب'' کا تصور قائم کر دیا۔

لارنس 19 سال کی عمر میں انگلستان سے آیا تھا 24 سال کی عمر میں پانی پت کے ضلع کا حاکم بنا جس میں 5 لاکھ آبادی 1800 مربعہ میل تھی۔

اس چیز کی ایک مثال کا تذکرہ یہاں ضروری ہے۔ جان نکلسن 61-1852ء کے دوران بنوں میں ڈپٹی کمشنر تھا اور اس کا کام ضلع میں امن و انصاف کی فراہمی کو یقینی بنانا تھا۔ ایک قانون رائج تھا کہ وہ کسی اراضی کے مالک کو اس کی زمین پر ہونے والے ظلم کا بھی ذمہ دار قرار دیتا تھا۔ اس کی وجہ سے یکدم واقعات کی تعداد میں کمی ہوگئی کیونکہ ہر مالک اراضی جرم روکنے والا چوکیدار بھی بن گیا تھا۔ اس طرح کا ایک معاملہ بنوچی گاؤں کے مالدار الہٰ داد خان کا بھی تھا جو اپنے بھائی کی وفات کے بعد اپنے بھتیجے اور اس کی جائیداد کا محافظ بن گیا تھا۔ یہ بات طے تھی کہ جائیداد لڑکے یعنی بھتیجے کے بالغ ہونے پر اس (بھتیجے) کو مل جائے گی لیکن الہٰ داد خان نے ایسا کرنے سے انکار کر دیا بلکہ لڑکے کو گاؤں سے ہی نکال دیا۔ لڑکے نے اپنے حق کے حصول کے لئے دعویٰ دائر کیا مگر الہٰ داد خان جو کہ ایک بااثر شخص تھا کے خلاف کوئی شخص گواہی دینے کو تیار نہ ہوا۔ نکلسن نے گاؤں میں مختلف باتیں ضرور سنیں مگر وہ عدالت میں مناسب شہادت کی موجودگی کے بغیر کچھ کرنے سے قاصر تھا۔ جبکہ سارا گاؤں انصاف کی امید کئے بیٹھا تھا۔ نکلسن نے اس کا بڑا سادہ سا اور براہ راست جواب دیا۔ ایک روز صبح سویرے وہ متنازعہ جائیداد کی جانب سوار ہو کر چل پڑا اور اپنے ملازم سے کہا کہ وہ اسے ایک درخت سے باندھ کر خود واپس چلا جائے۔ دیہاتی جب باہر آئے تو وہ ڈی۔ سی نکلسن کو درخت سے بندھا دیکھ کر حیران رہ گئے۔ کچھ اسے کھولنے کو آگے بڑھے۔ اس سے قبل کہ وہ اس کے پاس پہنچتے اس نے چلا کر انہیں روک دیا اور ان سے کہا کہ وہ یہ بتائیں کہ کس کی زمین پر یہ جرم سرزد ہوا ہے۔ ان سب نے خوفزدہ الہٰ داد کی جانب اشارہ کیا مگر اس (الہٰ داد) نے انکار کر دیا۔ اس نے کہا کہ یہ زمین اس کی ملکیت نہیں ہے بلکہ اس کے بھتیجے کی ملکیت ہے۔ اس کا اس سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ نکلسن نے اس کی بات پر یقین کرنے سے انکار کر دیا۔ اس نے کہا کہ وہ تب تک قبول نہ کرے گا جب تک کہ الہٰ داد برسرِ عام قسمیہ اپنی بات کا اعلان نہ کرے۔ الہٰ داد نے فوراً اس بات کا اعلان کر دیا اور مقدمے کا فیصلہ اس کی سماعت سے قبل ہی ہو گیا۔ یہ اس طرح کے معدودے چند واقعات ہیں کہ جنہوں نے برطانوی حکومت کا مثالی تصور قائم کرنے میں مدد دی۔ کچھ ایسے واقعات جو مشہور کئے گئے اور گورے کی برتری منوائی گئی۔

پنجاب آبپاشی کی ترقی کے لئے موزوں تھا

جیسا کہ اس مقالے کے آغاز میں بیان کیا گیا ہے کہ برطانوی پنجاب میں آبپاشی امکانات سے واقف تھے۔ الحاق کے بعد چند سال تو پنجاب کی سیاسی و معاشی نوآبادکاری میں لگ گئے اور اس کے بعد برطانوی فوج کی ہندوستانی یونٹس (Units) نے بغاوت کر دی اور پوری برطانوی حکومت کو ہلا کر رکھ دیا۔ پھر 1860ء کی دہائی تک برطانوی وہ ذہنی سکون حاصل نہ کر سکے کہ جس سے وہ پنجاب میں آبپاشی کے منصوبوں پر غور کر سکتے۔ برطانیہ نے یہ منصوبے ان بااثر پنجابیوں کو صلہ دینے کے طور پر بھی اختیار کر لئے کہ جنہوں نے دہلی کے حصول میں ان کی بہت بڑی مدد کی تھی اور وہاں ان کی حکومت قائم کی تھی۔

شروع میں پہلا کام یہ لیا انہوں نے تمام غیر کاشت شدہ اراضی کو تاج کے ملکیتی بنجر اور بیکار اراضی قرار دیا۔ اس واحد قدم نے دوآبوں میں چراگاہوں میں آباد لوگوں کو چراگاہوں کے حقوق سے محروم کر دیا اور ان کا طرز زندگی متاثر ہوا۔ اس طرح سے صحیح معنوں میں ترقی کے نام پر زمین کے حقیقی آبادکاروں کو ان کی زمین اور ذرائع آمدنی و بسر اوقات سے محروم کر دیا گیا۔ یہ وہی چیز ہے کہ جس کے نام پر امریکہ، آسٹریلیا، نیوزی لینڈ اور افریقہ کے اصلی باشندوں یعنی سرخ ہندیوں کو زمینوں سے محروم کیا گیا تھا۔ بلاشبہ نئے آلاٹی بہت خوش تھے اور انہوں نے مقامی لوگوں کا اخراج کرنے میں برطانوی حکمرانوں کا ساتھ دیا۔ اپنی مختلف ثقافتوں اور اقدار کے حامل مقامی چرواہے اپنے روایتی طرز پر زندگی گزارتے تھے۔ وہ منظم قبائل کی جگہ برادری کی شکل میں رہتے تھے اور ان میں جو نسلیں اُوڈ، چنگڑ، گجر اور سانسی وغیرہ تھیں۔ انہیں مجموعی طور پر جنگلی قرار دے دیا گیا اور ان کے ساتھ ہر طرح کی بدسلوکی جائز تصور کی جانے لگی۔ ان کے طرز حیات کا مذاق اڑایا جاتا تھا۔ ان کے ریوڑ کے ریوڑ مر جایا کرتے تھے اور ان کی زبان کو بدتمیزی کی زبان کہا جاتا تھا تو ان حالات میں ان کے پاس زندہ رہنے کے لئے چوری چکاری کے علاوہ اور کوئی راستہ نہ تھا۔ اس پر برطانیہ نے بھی ان کو ''جرائم پیشہ'' قبیلہ قرار دیا تھا اور یوں ان کی مزید تذلیل و تعصیب کی۔

حکومت نے یوں اپنی مرضی کے لوگوں میں اپنی صوابدید پر لاکھوں ایکڑ اراضی تقسیم کرنے کے لئے حاصل کر لی۔ مندرجہ ذیل گوشوارے سے برطانیوں کی نہری نوآبادیوں کی تعداد اور ان کی

وسعت کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔کل رقبہ تقریباً پانچ لاکھ ایکڑ بنتا ہے۔

نمبر شمار	نام	سال آغاز	دوآبہ	رقبہ بلحاظ ایکڑ
1	سدھنائی	1886ء	باری	250,000
2	سہاگ پاڑہ	1886ء	باری	86,300
3	چونیاں	1896ء	باری	102,500
4	چناب	1892ء	رچنا	1824745
5	جہلم	1902ء	چج	444942
6	زیریں باری دوآب	1914ء	باری	1192000
7	بالائی چناب	1915ء	رچنا	78800
8	بالائی جہلم	1916ء	چج	42300
9	نیلی بار	1926ء	باری	1065000
ٹوٹل				5086587

نہری آبپاشی نے درج ذیل طریقے سے پنجاب کو متاثر کیا۔

ٹیکنالوجی کی منتقلی

یہ ریلوے سے پہلے انگلینڈ میں صنعتی انقلاب کے ابتدائی برسوں میں کانوں سے صنعت تک خام مواد کی منتقلی کی غرض سے نہریں تعمیر کی گئیں تھیں۔ برطانیہ نے ایک لمبے عرصے میں نہر کھودنے، پانی کی فراہمی، بیراجوں کے نظام، ہیڈ ورکس، سلوس گیٹوں (Sluise gates) وغیرہ کی سائنس اور ٹیکنالوجی کو ترقی دی تھی۔ انہوں نے دہلی اور آگرہ کے شمال مغربی صوبوں میں بھی ایک منصوبہ شروع کیا تھا جسے ''گنگا نہر'' کا نام دیا گیا۔ پنجاب میں انجینئروں کو وسیع پیمانے پر اپنی معلومات اور تجربے کو مزید ترقی دینے کا موقع ملا۔ مقامی لوگ چونکہ ہمیشہ برطانوی انجینئروں سے

کم تر رہے تھے لہٰذا برطانوی اسٹاف کو انگلینڈ سے بلایا گیا خاص طور پر اس نیٹ ورک کو تفصیل سے تعمیر کرنے کی غرض سے۔ بعد ازاں ان اداروں کو اعلیٰ درجے کا بنایا گیا تا کہ مقامی طلبہ کو انجینئرنگ کی تعلیم دی جا سکے۔ مثلاً لاہور میں ریلوے کے ہیڈکوارٹرز اور ورکشاپوں کی تعمیر سے مکینیکل اینڈ الیکٹرک انجینئرنگ کی تربیت کا تکنیکی اسکول قائم ہوا جو آج یونیورسٹی آف انجینئرنگ اینڈ ٹیکنالوجی کی شکل اختیار کر گیا ہے اور اسی طرح سے آبپاشی کے ہیولانی منصوبوں سے رُڑکی میں سول انجینئرنگ کا ایک ادارہ قائم ہوا جو اب ہندوستان میں انجینئرنگ اینڈ ٹیکنالوجی کا سرکردہ ادارہ بن چکا ہے۔

معاشی گرم بازاری

ایک جانب بڑے انجینئرنگ منصوبوں نے ہزاروں مزدوروں کو فوری ملازمت فراہم کی اور مقامی لوگوں کے لئے اوسط درجے کی انجینئرنگ اور انتظامی ملازمتیں پیدا کیں تو دوسری جانب اس سے نئے حکمرانوں کی بڑی عظیم ساکھ (good will) بن گئی۔ پیداوار میں اضافے کے دوررس فوائد نے پنجاب کو خوشحال علاقہ بنا دیا۔ دوآبوں میں رہنے والے باشندوں یعنی چرواہوں کہ جن کو جنگلی کہہ کر ان کی تذلیل کی جاتی تھی ان کے علاوہ ہر شخص ترقی یافتہ نظر آتا تھا۔ چرواہوں کو بھلا دیا گیا بلکہ نہروں سے حاصل ہونے والے فوائد سے دودھ کی صنعت پر منفی اثرات مرتب ہوئے۔ ریلوے فوجی مقاصد کے ساتھ ساتھ منڈیوں تک اور پھر وہاں برطانیہ تک پیداوار منتقل کرنے کے لئے بھی استعمال کی گئی۔ اس سے پنجاب کی پیداوار کراچی تک لانے سے اس شہر کو بھی قابل ذکر بندرگاہ کا اعزاز حاصل ہو گیا۔ پنجاب ہندوستان اور سلطنت برطانیہ کے لئے گودام بن گیا اور خصوصاً جنگ عظیم اول میں پنجاب نے خوراک بھی فراہم کی اور آدمی بھی فراہم کئے۔

سماجی انجینئرنگ

برطانیہ نے تقسیم اراضی پر اپنے قبضے کے ذریعے بڑے محتاط انداز میں نہری نوآبادیات میں سماجی بناوٹ کو بھی تشکیل دیا۔ جن لوگوں کو یہ زمین عطا کی گئی ان میں سے اکثر وسطی پنجاب کے انبالہ، لدھیانہ، جالندھر، لاہور اور سیالکوٹ وغیرہ کے اضلاع سے تعلق رکھتے تھے۔ برطانوی

دوآبہ کے مقامی لوگوں کی نسبت ان اضلاع کے لوگوں پر زیادہ بھروسہ کرتے تھے۔ مقامی لوگوں کی خودمختاری ان کی وفاداری کو متنازعہ بنا دیتی تھی۔ چرواہوں میں زمین تقسیم نہ کرنے کی وجہ یہ تھی کہ وہ زراعت سے واقف نہ تھے اسی لئے وہ غیر پیداواری کاشتکار تھے۔ ایسی کوئی بات ثابت نہیں کی جا سکتی کہ مقامی چرواہے اچھے کاشتکار ثابت نہیں ہو سکتے۔ زرعی انقلاب سے قبل سارے ہی انسان خوراک اکٹھی کیا کرتے تھے جو موقع ملنے پر بہترین کاشتکار ثابت ہوئے۔ یوں انسانوں میں جینیاتی بنیادوں پر برطانیہ کی یہ دلیل غلط نکلتی ہے۔ سادہ سی بات ہے کہ یہ ایک سیاسی فیصلہ تھا۔ اراضی وصول کرنے والوں نے اپنے مفادات کی خاطر برطانیہ کی حمایت کی اور اس منصوبے کو کامیاب کرایا۔ پنجاب کے جاگیردار طبقوں کی اس روایت سے اسٹیبلشمنٹ مضبوط ہوئی کیونکہ انہوں نے اپنے معاشی مفادات کو نوکرشاہی، سول اور فوجی کی ساکھ کے ساتھ وابستہ دیکھا۔ اس چیز سے ان لوگوں کی آئندہ نسلوں کے سیاسی نقطۂ نظر کا تعین ہوگیا جو آج تک جاری ہے۔ جن لوگوں کو اراضی عطاء کی گئی ان کا بڑی احتیاط سے انتخاب کیا گیا۔ اس سارے عمل میں سماجی ترقی کا کوئی مقصد پیش نظر نہ تھا اور صنعت کی حوصلہ شکنی کی گئی تھی۔ اس کا نتیجہ موجودہ سماجی ڈھانچہ ہے کہ جس میں تبدیلی اور ترقی کے لئے بہت کم جگہ ہے۔

نئی اراضی کی تقسیم کو سابقہ حیثیت کے مطابق عمل میں لایا گیا اور یوں پنجاب کے چھوٹے زمینداروں کو کہ جنہیں آبادکار کہا جاتا تھا نصف سے لے کر دو مربعہ تک اراضی دی گئی۔ درمیانے درجے کے مالکان اراضی کو سفید پوش کا نام دیا گیا اور ان کو 4 سے لے کر 5 مربعہ تک اراضی دی گئی اور سرمایہ دار مالکان اراضی جو رئیس کہلاتے تھے کو 6 سے لے کر 20 مربعہ تک اراضی دی گئی۔ سرمایہ دار مالکان اراضی نے خود کبھی بھی زمین کاشت نہ کی البتہ تقسیم اراضی کے اصول کا مذاق اڑانے کے لئے ان کو زیادہ سے زیادہ اراضی آلاٹ کی گئی۔

ثقافتی تشکیل نو

پنجاب کی ثقافت پر سب سے بڑا اثر ہندوستانی یا اردو زبان کا تعارف تھا۔ اڑیسہ اور لکھنو میں برطانوی افسران پہلے ہی مقامی زبان سیکھ چکے تھے جسے اس وقت ہندوستانی، ریختہ یا اردو کہا جاتا تھا اور جب وہ مغرب کی جانب دہلی اور آگرہ سے آگے آئے تو مشرقی پنجاب کی ریاستوں

میں کہ جو رنجیت سنگھ کے ماتحت نہیں تھیں یہی زبان استعمال ہوتی تھی۔ 1846ء کے بعد برطانیہ نے جالندھر دو آبہ پر بھی قبضہ کر لیا اور جان لارنس جو دہلی اور مشرقی پنجاب کی ریاستوں میں خدمات سرانجام دے چکا تھا وہ انہی زبانوں سے کام چلاتا تھا، جب انہوں نے پنجاب کا الحاق کر لیا اور اس کا انتظام سنبھال لیا تو انہوں نے اپنے افسران کو پنجابی زبان سیکھنے کے لئے نہیں کہا کیونکہ انہوں نے دیکھا کہ وہ بڑی سہولت سے ہندوستانی (ریختہ یا اردو) یہاں پر بھی استعمال کر سکتے تھے۔ سرکاری عدالتی زبان فارسی کی جگہ پر انگریزی لائی گئی البتہ زیریں نوکر شاہیہ حلقوں میں ہندوستانی کو متعارف کروایا گیا۔ اسی دور میں یہ زبان اردو کے نام سے مشہور ہوگئی۔ یوں یہ امر فطری ہوگیا کہ جس کسی کو برطانیہ کی حمایت حاصل کرنی ہوتی ہے اسے اردو سیکھنی پڑتی اور یوں جلد ہی اردو پنجاب میں پڑھنے اور بولنے کی زبان بن گئی اور جو لوگ صرف پنجابی بولا کرتے تھے ان کو برطانیہ کی سماج میں بنائی گئی پچھلی نشستوں پر ہی اکتفاء کرنا پڑتا۔ قدرتی طور پر مقامی لوگوں میں سب سے اعلیٰ درجہ ان لوگوں کا تھا جو کہ انگریزی لکھ اور بول سکتے تھے اس کے بعد اردو آتی ہے اور سب سے نیچے پنجابی ہے۔ سرکاری افسران آج بھی پنجابی کو نظر انداز کرتے ہیں اس کی وجہ غالباً پنجاب کے ابتدائی برطانوی عہد میں موجود بنیادیں ہیں۔

سیاسی اور سامراجی مقاصد

نہری آبادکاریوں کا مشکور پنجاب ایک وفادار اور تابعدار صوبہ بن گیا۔ زمینداروں کا ایک ایسا طبقہ وجود میں آ گیا جس نے خود کو مکمل طور پر اس غیر ملکی حکمران کا اتحادی بنالیا۔ اس تعلق کو مزید بہتر بنانے کی غرض سے برطانیہ نے ان ہی علاقوں سے سپاہیوں کی بھرتی پر توجہ دی اور یوں سابقہ فوجی افسران و سپاہیوں کو انعام دینے کا ذریعہ بھی نکل آیا۔ ریٹائرڈ اور برسر ملازمت فوجی افسران کو جہلم کی نو آبادیوں میں بڑے بڑے اقطاع اراضی دیئے گئے اور زمین کی آلاٹمنٹ وفاداری کی صورت میں انعام حاصل کرنے کا باقاعدہ ذریعہ بن گئی۔ اس وقت تک فوج رسالوں (Cavalry) کے اچھے گھوڑوں پر انحصار کرتی تھی یوں بہتر نسل کے انتخاب کے ذریعے ان (گھوڑوں) کی صلاحیت بہتر بنانے کو بھی بڑی اہمیت حاصل ہوگئی۔ ان لوگوں کو خصوصی طور پر اراضی الاٹ کی گئی جو اچھے نر گھوڑوں کے مالک ثابت ہوا کرتے تھے کیونکہ یوں وہ اچھی نسل کے

گھوڑوں کی دیکھ بھال کر سکتے تھے۔ یہ ''گھوڑی پال'' الاٹمنٹ فوج میں جدید تبدیلیوں کے بعد بھی جاری رہی۔

شہروں کا فزیکل ڈیزائن

برطانیہ نے چک کے نام سے دیہاتوں کا اور ''منڈی ٹاؤن'' کے نام سے چھوٹی منڈی والے قصبہ جات کے معیاری ڈھانچے کو ترقی دی۔ یہ روایتی گلیوں والے دیہاتوں کہ جن کو (Labyrinthine) طرز کا حامل قرار دیا جاتا تھا ان کے برعکس گریڈیرون طرز پر قائم کئے گئے۔ نئے طرز کو جدید اور زیادہ سائنسی قرار دیا گیا جبکہ پرانے طرز کو غیر منصوبہ شدہ، غیر عملی اور غیر منطقی کہا گیا۔ پنجاب کے شدید گرم و سرد موسموں میں پرانی طرز کی (meandering) گلیوں میں دھوپ اور چھاؤں کے مقامات ہر وقت موجود رہتے تھے تاکہ گلیوں میں سے گزرنے والا شخص گرمی یا سرد ہوا سے مسلسل متاثر نہ ہو۔ چھاؤں کے یہ مقامات گرمیوں میں قدرے ٹھنڈے اور سردیوں میں قدرے گرم ہوا کرتے تھے یوں یہ ان کے نیچے کھڑے ہونے والے لوگوں کے لئے کافی پُر سکون ہوتے تھے۔ نئے طرز کے قائم شدہ دیہاتوں کی گلیاں لوگوں کے لئے بہت تکلیف دہ ہوتی تھیں اور اس کے لئے گلی کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک چلنا بہت مشکل ہو جاتا تھا خاص طور پر سخت گرمیوں میں کہ جب پوری گلی سورج کی گرمی سے تپ رہی ہوتی تھی اور کسی جگہ سایہ مہیا نہیں ہوتا تھا۔ برطانوی منصوبہ ساز روایتی طرز حیات میں موجود کسی بھی اچھی بات کو تسلیم کرنے میں بہت ہچکچاہٹ محسوس کیا کرتے تھے اور ثقافتی برتری کے طور پر ہندوستانی عمارتوں کے طرز کو ''رجعت پسندی'' کی نشانی قرار دیتے تھے۔

اختتام:

پاکستانی پنجاب میں ہم مسلسل ایک ایسے نظام میں رہ رہے ہیں جو کہ برطانویوں کی میراث ہے۔ کچھ تبدیلیاں کی گئیں ہیں، جو کہ ساری ہی بہتر نہیں ہیں، لیکن اپنی ماہیت میں ایک ایسا اقتدار ابھی تک قائم ہے جس پر وہ آٹوکریٹک بیوروکریسی قابض ہے کہ جس کا دعویٰ یہ ہے اسے ہی وہ باتیں معلوم ہیں جو کہ لوگوں کے لئے بہتر ہیں۔ برطانوی دور کے ان لوگوں کو اب بھی راہنمائی کی

ضرورت ہے۔عوام کی ترقی اور فلاح سے قبل حکمرانوں کے مفادات اور صاحب اقتدار طبقے کے مفادات کو برقرار رکھنے کی کوشش کی جاتی ہے۔اس نظام کو قائم رکھنے کے لئے بہت سے نظریات قائم کئے گئے ہیں جو بنیادی جمہوریت سے لے کر (Devolution) تک ہمارے سامنے موجود ہیں لیکن دراصل یہ سب نوآبادیت ازم کی پست اشکال ہی ہیں، کچھ اس کو نیوکالونیل ازم کہتے ہیں لیکن یقیناً یہ مابعدالنوآبادیات نہیں ہے کیونکہ ہم ہنوز نوآبادیت کے عہد میں رہ رہے ہیں۔

❁❁❁❁❁

جدید پنجاب کی تشکیل اور مستشرقین کا کردار

ندیم عمر

جدید پنجاب کے خدوخال کی سرکاری تشکیل کا عمل، برطانوی حکومت کی پنجاب کی پرانی تاریخ کے کھوج سے شروع ہوا۔ یہ عمل 1849ء میں پنجاب پر انگریزوں کے جبری قبضے سے کئی سال پہلے شروع ہو چکا تھا۔ رنجیت سنگھ کی وفات کے بعد سے انگریزوں کا پنجاب کی عملی سیاست اور انتظامیہ میں عمل دخل بڑھا جس نے جدید پنجاب میں شہری اور دیہی تاریخ نویسی کی بنیادیں ڈالی۔

پنجاب کے سماجی، اقتصادی اور سیاسی نظام اور ڈھانچے کو سمجھنے کے لئے، 19 ویں صدی کی برطانوی حکومت نے جن نظریات و خیالات کا استعمال کیا۔ سرکاری علم کے اس ڈھانچے کو حالیہ دور میں Orientalism یعنی مستشرقیت کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ Orientalism سے مراد وہ مخصوص خیالات و نظریات یعنی تھیوریز ہیں جن کے ذریعے مغلوب عوام کی تاریخ اور سماج کو یورپی یا حکمران قوم کی تاریخ اور فلسفہ کے پس منظر میں رکھ کر پرکھا جاتا ہے۔

پنجاب کے بنیادی خدوخال کی تشکیل، پنجاب پر عملی حکومت قائم کرنے کے لئے بے حد ضروری تھی۔ انگریز سرکار کے لئے یہ بے حد آسان تھا اور مشکل بھی۔ آسان اس لئے کہ 17 ویں صدی سے ہی یورپ میں ایک عالمی ارتقائی سماجی تاریخ مرتب کرنے کے لئے بنیادی ڈھانچہ تشکیل کیا جا چکا تھا لہٰذا ہندوستان یا پنجاب کی تاریخ کے تحریری ماخذ کمیاب تھے اور تاریخی مواد و تہذیبی بانی کلامی صورت میں بنگال کے پنڈتوں اور پنجاب کے مراثیوں اور جوگیوں کی متفرق اور "کمتر" زبانوں میں گم تھا۔

پنجاب کے سماجی خدوخال کی تشکیل

ہندوستان کی تاریخ کو عالمی ارتقائی تاریخ سے منسلک کرنے کا عمل بنگال میں Sir William Jones کی قیادت میں 18 ویں صدی میں شروع ہوا۔ جنہوں نے ہندوستان کی تاریخ کے تاریک گوشوں کو منور کیا۔ اس عمل نے ہندوستان کے تہذیبی اور سیاسی زوال کی ایک ایسی تاریخ مرتب کی جسے آج بھی ہم دہرانے پر مجبور ہیں۔

ان خیالات کی تشکیل میں جان سٹیوارٹ مل کے نظریات و افکار نے بنیادی کردار ادا کیا۔ جان سٹیوارٹ مل کے بقول انسانی نسلیں بتدریج ارتقاء کے مراحل سے گزری ہیں۔ اس نے انسانی نسلوں کو دو حصوں میں تقسیم کیا یعنی یورپی اور غیر یورپی۔ حکومت کرنے کا حق ایک بنیادی اخلاقی مسئلہ ہے جو کہ نسلی طور پر برتر لوگوں کو حاصل ہوتا ہے۔ اس دلیل سے یہ نتیجہ نکالا جاتا ہے کہ چونکہ یورپی نسلی طور پر برتر ہیں اس لئے مقامی لوگوں پر حکومت کرنا ان کی اخلاقی ذمہ داری ہے۔ ان خیالات کے مطابق یورپ تہذیبی طور پر سائنسی فکر اور تحریری علوم کی بنیاد پر دوسروں سے برتر ہیں۔ جے۔ ایس مل کے خیالات کی بازگشت ہمیں میکالے کے ہاں بھی ملتی ہے جس نے تمام مشرقی علوم کو یکسر رد کر دیا۔ انسانی نسلوں کے بارے میں اس طرح کے نفسیاتی اوصاف کا بیان نہ صرف یورپی حاکمیت ثابت کرنے کے لئے نہایت اہم تھا بلکہ یہ انہیں علم کی پیداوار کے حوالے سے سند اور اختیار بھی فراہم کرتا تھا۔ مل کی تحریروں سے محسوس ہوتا ہے کہ وہ ڈارون کے سماجی نظریئے پر بھی یقین رکھتا ہے جس کے مطابق انسانوں کی کچھ اعلیٰ درجے کی نسلیں دیگر انسانوں کے مسائل حل کر سکتی ہیں۔ ہمارے آج کے اس مقالے کا مقصد برطانوی مستشرقین کی ان سرکاری تحریروں کا جائزہ ہے جو نہ صرف پنجاب کی تاریخ میں مستند ماخذ کی حیثیت رکھتی ہیں بلکہ ان تحریروں نے پنجاب کے سماجی خدوخال کو جن مخصوص نظریات و خیالات کے زیر اثر مرتب کیا وہ آج بھی ہمارے تاریخی شعور کو متعین کر رہے ہیں۔

اس ضمن میں میری یہ رائے ہے کہ نظریات و خیالات کا یہی منبع ہے جس نے پنجاب پر انگریزوں کی سامراجی حکومت کا جواز پیش کیا اور وہ جواز یعنی Orientalism آج بھی بغیر کسی بڑے چیلنج کے، ہماری تاریخی شناخت اور شعور کو جکڑے ہوئے ہے۔

اس بحث کو آگے بڑھانے کے لئے آج کے اس مقالے میں اُن دو برطانوی مستشرقین کی تحریروں کا جائزہ لیا گیا ہے، جنہوں نے اپنی تمام تر ملازمت پنجاب میں کی اور پنجاب کی سماجی، اقتصادی اور سیاسی تاریخ کو اپنی سرکاری تحریروں کا موضوع بنایا۔

سر ڈینزل ایبٹسن گینٹر بوروف، انگلینڈ میں 1847 میں پیدا ہوئے ان کے والد ڈینزل جان ہالٹ ایبٹسن ایک پادری تھے۔ انہوں نے ابتدائی تعلیم ایڈیلیڈ جنوبی آسٹریلیا میں حاصل کی اور بعد ازاں وہ سینٹ جونز کالج، کیمبرج چلے آئے۔ 1870 میں وہ انڈین سول سروس میں شامل ہو کر پنجاب میں تعینات ہوئے۔ تحصیل کرنال میں بحیثیت سیٹلمنٹ آفیسر ان کے ابتدائی انتظامی تجربے نے انہیں پنجاب کے بارے میں علم حاصل کرنے میں مدد دی۔

انہیں عمرانیات، لوک ورثے اور شماریات سے خاص شغف تھا۔ انہی مشاغل کی بنیاد پر انہوں نے مردم شماری کے کام میں لامحدود خدمات سرانجام دیں۔ پنجاب کے پہلے کمشنر کی حیثیت سے انہوں نے مردم شماری پر ایسی رپورٹ تیار کی جسے آج بھی مثال کے طور پر پیش کیا جاتا ہے۔ علاوہ ازیں انہوں نے پنجاب گزیٹیر کے حوالے سے بھی اپنی خدمات انجام دیں۔

مردم شماری اور عمرانیات میں ان کی دلچسپی کی وجہ سے پنجاب کی سماجی تاریخ کے بارے میں جو بے پناہ معلومات میسر آئیں ان کے باعث برطانوی حکمرانوں کو پنجاب پر قبضے کے وقت بہت مدد ملی۔ ان کے کام اور تصنیفات کو نہ صرف انتظامی حوالے سے بلکہ ادبی اور سائنسی نقطہ نظر سے بھی نہایت معتبر سمجھا جاتا ہے۔ 1907 میں انہیں پنجاب کا گورنر بنایا گیا لیکن ان کی صحت نے ساتھ نہیں دیا اور وہ 1908 میں انگلستان میں وفات پا گئے۔

Ibbetson کا تعلق مستشرقین کی اس لڑی سے تھا جو ہندوستان میں سماجی ڈھانچے کے آغاز کو پیشہ وارانہ ذاتوں یعنی Occupational Groups کی باقیات تصور کرتے تھے جو جدلیاتی تبدیلی کے عمل سے نہ گزر سکیں۔ اس کے برخلاف ولیم جونز ہندوستان کی ذاتوں Castes کو آریائی حکمرانوں کا سماجی نظام سمجھتے تھے جس کی تفصیل Code of Menu میں ملتی ہے جس کو 18 ویں صدی میں Asiatic Society of Bengal نے سنسکرت سے انگریزی میں ترجمہ کیا۔

1881 میں جب Denzil Ibbetson نے پنجاب کی پہلی تفصیلی مردم شماری یعنی

Census کا کام مکمل کیا تو اس وقت ہندوستان کی تہذیبی اور سماجی تاریخ کے بنیادی خدوخال کو Castes یعنی ذات کے تصور سے ہی جانا جاتا تھا اور برطانوی حکمرانوں کی سرکاری تحریروں میں ہندوستان کے ہر نسل کے قبائل اور ذاتوں کے متعلق بے پناہ معلومات اکٹھی کی جا چکی تھیں۔ یہاں اس بات کا بھی ذکر ضروری ہے کہ 80-1870ء کے دوران سرکاری علمؒ کے ماخذوں میں بے پناہ اضافہ ہوا اور یہی وہ دور تھا جب بندوبست رپورٹ، ڈویژنل گیزیٹیئر اور مردم شماری کے بے شمار کام کیئے۔ لیکن بندوبست کی رپورٹیں پنجاب کے روایتی نظام کی ہی تصویر کشی نہیں کرتیں بلکہ ان کا اہم مقصد ہندوستانی زراعت کے نظام کو قومی اور بین الاقوامی معیشتوں کے نظام سے منسلک عمل کا جائزہ لینا تھا۔ انہیں رپورٹ تاثر کی مدد سے نئے صوبائی پیداواری منصوبہ جات کی تشکیل اور ان پر کنٹرول کیا جانا تھا لہٰذا یہ کوئی اچنبھے کی بات نہیں کہ Denzil Ibbetson کی مردم شماری کی رپورٹ، جو پہلی مرتبہ 1883 میں شائع ہوئی، کو بے حد سرکاری اور عوامی پذیرائی حاصل ہوئی چونکہ بقول Ibbetson پنجاب کی قدیم تاریخ کے ماخذ کمیاب اور زبانی کلامی ہیں، لہٰذا اس مردم شماری کی رپورٹ کا اہم مقصد مردم شماری کی مدد سے اکٹھے کئے ہوئے مواد کو ایک عالمی تاریخ تسلسل میں پرونا تھا جس کے بنیادی خدوخال کو، وہ اپنے تئیں متعین کر چکے تھے۔ 18 ویں صدی کے برطانوی مفکرین اور فلاسفہ کے بقول انسانوں کی عالمی تاریخ میں یورپی سماج کو ترقی یافتہ ہونے کی وجہ سے ایک امتیازی حیثیت حاصل ہے۔ یورپی سماج میں ترقی کا عمل، 17 ویں صدی کی نشاۃِ ثانیہ کی تحریکوں سے ہوا جس کے جدلیاتی عمل نے یورپی سماج کو ایک زبردست تبدیلی کے عمل سے گزارا۔ تمام ہندوستانی مستشرقین اور برطانوی مفکر اس بات پر مصر تھے کہ ہندوستانی سماج اس جدلیاتی تبدیلی کے عمل سے نہیں گزر سکا لہٰذا یہ سماج کئی صدیوں سے رکا ہوا ہے۔ اور اب یورپ کے اعلیٰ تہذیبی اور سماجی رتبے کی یہ ذمہ داری ہے کہ وہ کم تر سماجوں کو اپنی حکومت کے زیر اثر Reform کرے اور انہیں بھی عالمی تاریخ میں تہذیب یافتہ اقوام کی حیثیت سے روشناس کرائے۔ Rudyad Kipling نے جسے White Man's Burden کہا یہ وہی اخلاقی بوجھ ہے جس کی ذمہ داری برطانوی مستشرقین کے کندھوں پر آن پڑی۔ جب انہوں نے پنجاب پر اپنی حکومت قائم کی۔ اس تناظر میں Denzil Ibbetson کی Contribution یہ ہے کہ انہوں نے سرکاری کوائف کی مدد سے ان مخصوص خیالات کو ایک تاریخی حقیقت بخشی۔ اور

یہ وہ حقیقت ہے جسے آج بھی ہم اپنا تاریخی سچ سمجھتے ہیں۔

ان مفروضوں کے ساتھ اب میں آپ کی توجہ Punjab Castes کی طرف دلوانا چاہتا ہوں جس کا آغاز 1881 کی مردم شماری کی رپورٹ سے ہوا جو 1883 میں پہلی دفعہ چھپی اور پھر اگلے سوا سو سال تک بیسیوں دفعہ سرکاری خرچ پر اس رپورٹ کے کئی حصے خصوصاً وہ حصہ جو پنجاب کی ذاتوں، قبائل اور رسم و رواج کے متعلق تھا برابر چھپتے رہے اور جو 1916 میں دوبارہ کتابی شکل میں Punjab Castes کے نام سے چھپا۔

1881 کی مردم شماری کے نتیجے میں پنجاب کے جغرافیائی اور سماجی خدوخال واضح ہوئے جس کے مطابق پنجاب فیوڈیٹری سٹیٹس، نارتھ ویسٹرن فرنٹیئر پرونس اور ان سے منسلک ایجنسیاں اور قبائلی علاقے پر مشتمل ایک آبادی تھی جو 175, 248 sq m پر پھیلی ہوئی تھی اور 28,006,777 نفوس پر مشتمل تھی جو برطانوی سلطنت کا گیارہواں حصہ تھا۔ ڈینزل ایبٹسن کے بقول شمال مغربی صوبہ، پنجاب کی نسلوں کے متعلق علوم سے دلچسپی رکھنے والے طالب علموں کے لئے بے حد اہمیت کا حامل تھا۔

Ethnographic Survey of India جس کا آغاز 1903ء میں ہوا، کے نتیجے میں پنجاب کے متعلق سماجی و معاشرتی معلومات مرتب کی گئیں جس کا ایک بڑا حصہ Ibbetson کی 1883ء کی رپورٹ پر مشتمل تھا۔ اس Survey کی تحقیقات A glossary of tribes, castes, nature of Punjab کے نام سے 1919ء میں چھپی۔

مزید برآں پنجاب کے تمام District Gazetteer ابتدائی معلومات کے حوالے سے Ibbetson کی رپورٹ پر مشتمل ہیں۔ حال ہی میں فکشن ہاؤس لاہور کے اہتمام سے اسے اردو کے قالب میں ڈھالا گیا۔ اس رپورٹ کے آغاز میں Ibbetson نے پنجاب کی ذاتوں کے آغاز کے بارے میں اپنے مفروضے اور عالمی اور ارتقائی تاریخ کے تسلسل کو یوں بیان کیا کہ پنجاب انواع و اقسام کی نسلوں پر مشتمل ایک قبائلی معاشرہ ہے جو ذات پات کے نظام میں جکڑا ہوا ہے۔ یہاں یہ بات نہایت اہم ہے کہ عالمی ارتقائی تاریخ کے پس منظر میں پنجابی ہندوستانی اقوام، کوئی منفرد نہیں تھی۔ تمام اقوام اس دور سے گزری ہیں۔ فرق صرف یہ ہے ہندوستانی سماج اس جدلیاتی تبدیلی کے عمل میں رک گیا جس میں سے یورپی اقوام گزر گئیں۔ یہ مخصوص نقطہ نظر Unilineal

Evolution کے ان مفروضوں کی نشاندہی کرتا ہے جو 18 ویں صدی کے برطانوی ماہر عمرانیات Lious Henry Morgan, Herbert Spencer and E.B.Taylor کی تحقیقات پر مبنی تھیں۔ Ibbetson کے مطابق ہندوستانی براہمن اس ذات پات کے نظام کے ذمہ دار ہیں۔ انہوں نے اپنے مخصوص طبقاتی مفاد کے لئے خاندان سے باہر شادی کرنے سے گریز کیا اور یوں ایک ایسا سماجی ڈھانچہ وجود میں آیا جو مختلف طبقات میں بٹا ہوا تھا۔ گویا Caste جو پنجاب کے سماج کی راہ میں بنیادی رکاوٹ ہے اس نے ارتقائی تبدیلی کے عمل کو صدیوں سے جکڑے دیکھا۔

ان نظریات کے نتیجے میں یہ فرض کر لیا گیا کہ تہذیبی اعتبار سے پنجاب کی نسلیں یورپ کے ماضی کی نمائندگی کرتی ہیں لہٰذا ان کا علم ناقص ہے اور یورپی حکومت کے انتظام کے زیر اثر ہی پنجابی سماج ارتقائی تبدیلی یعنی جس کی بنیاد ذات پات کے نظام کے انحطاط پر ہے کے عمل سے گزر کر ترقی یافتہ اقوام کی صف میں کھڑا ہو سکتا ہے۔

سر رچرڈ ٹمپل نے پنجاب کو عالمی ارتقائی تاریخ کے پس منظر میں سمجھنے کے لئے زبانی علم کے ماخذوں کو کھنگالا اور آج ہم انہیں پنجاب کے لوک ورثہ کے علم کے بانی کے طور پر یاد کرتے ہیں۔

رچرڈ ٹمپل 15 اکتوبر 1850ء میں الہ آباد میں پیدا ہوئے۔ جہاں ان کے والد انڈین سول سروس کے ایک جونیئر افسر تھے۔ ہیرو اور ٹرینیٹی ہال کیمبرج میں تعلیم حاصل کرنے کے بعد رچرڈ ٹمپل نے ہندوستانی فوج کی بنگال کور میں ملازمت اختیار کی۔ 79-1878ء کی دوسری افغان جنگ میں اعلیٰ کارکردگی کے صلے میں اعلیٰ اعزاز سے نوازا گیا چنانچہ انہیں پنجاب میں کنٹونمنٹ مجسٹریٹ کے طور پر تعینات کر دیا گیا۔ یہ وہی وقت ہے جب انہوں نے حکایات پنجاب کا تمام مواد اکٹھا کیا اور اسے اپنی بعد کی تحریروں میں استعمال کیا۔ اس ضمن میں سب سے اہم Legends of the Punjab قرار دی جا سکتی ہے جس کا ترجمہ مجلس ترقی ادب نے حکایات پنجاب کے نام سے کیا ہے اس کی اولین اشاعت 1884ء سے 1900ء کے درمیان تین جلدوں میں ہوئی۔ اسی طرح Punjab notes and Queries میں چھپنے والی تحریریں جو کہ 1883ء سے 1887ء کے درمیان شائع ہوئیں، رچرڈ ٹمپل کے دور تعیناتی میں اکٹھے کئے جانے والے مواد پر مشتمل تھیں۔ Journal of Indian Antiquity جس کے ساتھ ٹمپل 52 برس تک منسلک رہے، کے 1931ء کے شمارے میں ان کی شخصیت کے متعلق تعزیتی نوٹ میں ان کی تمام تصانیف کا

تفصیلی تذکرہ موجود ہے۔

Asiatic Society of Bengal نے Indology کے جن شعبوں کو متعارف کروایا انہی سے رچرڈ ٹمپل کو فکری مواد حاصل ہوا جو کہ Folklore of Punjab کی صورت میں موجود ہے۔ ای۔ بی۔ ٹیلر (1832-1917)، ایل۔ ایچ۔ مورگن (1818-1881) جیسے ماہرین بشریات انسانی معاشروں کے ارتقائی عمل کی انیسویں صدی کی تھیوری میں مزید اضافے کا باعث بنے۔ ان کاوشوں نے علم بشریات کی تعریف کچھ اس طرح کی جس کا مقصد ارتقاء کے مختلف ادوار کے بارے میں علم حاصل کرنا ہے تاکہ وحشی اور جابر لوگوں کے علم حاصل کر کے ایسے شواہد اکٹھے کئے جائیں جن سے معلوم نہ ہو سکے کہ انسان پہلے دور میں کیسا ہوا کرتا تھا۔

Legends of the Punjab ٹمپل کی سب سے معروف تصنیف سمجھی جاتی ہے۔ ٹمپل کے نظریاتی پرورش انہی خیالات کے زیر اثر ہوئی جس کا ہم تفصیل سے جائزہ لے چکے ہیں۔ چنانچہ ٹمپل کے نزدیک وہ لوک ورثہ جسے اس نے ایک پُر پیچ اور سائنسی طریقے سے مقامی مراثیوں، جوگیوں اور بھاٹوں سے ریکارڈ کیا، مقامی قبائل کی کمتر ذہنی عادت کا آئینہ دار ہے جو نہ صرف پنجاب بلکہ ہندوستان کے دوسرے حصوں کے لوک ورثہ سے بھی مماثلت رکھتے ہیں۔ اس کی ان تحقیقات یا تصانیف کا مقصد وہ نہیں جس کے لئے آج ہم ٹمپل کو ''پنجابی پیارا'' سمجھتے ہیں بلکہ یہ تھا کہ پنجاب کے زبانی علم یعنی لوک ورثہ ایک ایسی گتھی ہے جس کو سلجھانے سے پنجابی قبائل کا عالمی ارتقائی تاریخ میں مقام متعین کیا جا سکتا ہے۔ کیونکہ زبانی علم کی قدامت، قدیم مظاہر فطرت نیز ماضی اور انسانی ذہن کو سمجھنے میں مدد دیتی ہے لہٰذا پنجاب کا زبانی علم اور اس کی روایات، محض ایک قدیم قبائلی روایت ہے، جس کا درجہ سماج کی یادداشت یعنی Relic کے طور پر ہے۔ اس کا کوئی علمی یا ادبی درجہ نہیں اور نہ ہی یہ علم تاریخی حوالہ جات کے لئے، بغیر احتیاط کے استعمال کیا جا سکتا ہے۔ مزید برآں اس علم کی روایت میں تبدیلی کے عمل کی گنجائش نہیں۔

المختصر مستشرقین نے یہ ثابت کیا کہ نہ ہی ہندوستان کا سماج جدلیاتی تبدیلی کے عمل سے گزرا اور نہ ہی اس کے علم کی روایت میں کسی تبدیلی کا عنصر ہے۔ لہٰذا پنجابی سماج اور اس کا علم جمود کا شکار

ہے۔ جسے انگریزوں کے دورِ حکومت میں زبردست تبدیلی کے عمل سے گزارا گیا۔

برطانوی مستشرقین نے سرکاری علم کے ذریعے پنجاب کے خدوخال کو جس طرز پر تشکیل دیا۔ اسے ہم پنجاب کی سماجی اور تہذیبی تاریخ کا آئینہ دار سمجھتے ہیں۔ لیکن شاید ہمیں وہ سرکاری علم کا آئینہ توڑنا پڑے گا۔ جس میں ہمیں اپنا حال یورپ کا ماضی لگتا ہے اور مستقبل یورپ کا آج کل۔

❋❋❋❋❋

یونینسٹ پارٹی اور فضلِ حسین کا کردار

طاہر کامران

قیام پاکستان کے بعد تاریخ نویسی چند محدودات کا پابند ہو کر رہ گئی ہے۔ پابندی اور حدود کی فضا میں کہ جس نے تاریخ کے علم کو محصور کر رکھا ہے صرف ایک ہی سیاسی فکر و نظریئے کی ترویج ممکن ہے کیونکہ یہاں کی ریاست و اصحابِ حل و عقد کے اغراض و مقاصد کے لئے یہی فکر و نظریہ مدد معاون رہا ہے۔ علمی تحقیق و تخلیق کے عمل پر قبضہ کر کے یہاں علم اور طاقت (Power) کا رشتہ کچھ اس طور سے وضع کر لیا گیا کہ ایک رہنماء، ایک مفکر ایک ہی نظریئے اور ایک سیاسی جماعت کے علاوہ سب کچھ باطل غدار اور ملک و ملت کے ماتھے پر بدنما داغ قرار پائے۔ نصابی کتب پرنٹ میڈیا اور ملک بھر کی یونیورسٹیوں سے ملحق تحقیقی مراکز نیز سرکار کی معاونت سے چلنے والی دانش گاہیں ہر دم انہی شخصیات، نظریئے یا پھر سیاسی تنظیم کے ہر قول و فعل پر مہر اثبات ثبت کرتے رہنے کے مسلسل عمل میں مبتلا نظر آتی ہیں۔ اس طرح تمام تر فکری و عملی متبادلات سے یہاں کے علمی نظام (Knowledge System) کو یکسر محروم کر دیا گیا ہے۔ زیر نظر مقالے میں علم تاریخ و سیاست پر طاری اِسی یک رخ پن کو جھٹک کر ایک ایسے دریچے کو وا کرنے کی سعی کی گئی ہے جس سے تحریک پاکستان اور جدوجہدِ آزادی سے متعلق موضوعات پر عائد کر دیئے گئے فکری جمود کا کچھ مداوا ہو سکے۔ خاص طور پر پنجاب کی سیاست اور معیشت و معاشرت کی تفہیم کے لئے یہ از حد ضروری معلوم ہوتا ہے کہ مروجہ نظریات سے قطع نظر نو آبادیاتی عہد کی تاریخ از سرِ نو تجزیاتی مطالعہ کیا جائے تاکہ اُن رجحانات کی ابتداء کا تعین کیا جا سکے جو عہد حاضر کی معاشرتی و سیاسی تشکیل کا باعث بنے۔ اس کے لئے جیسا کہ اِس مقالے کے عنوان سے ہی ظاہر ہے یونینسٹ پارٹی۔ اس

کے قیام اور اغراض و مقاصد کو زیرِ بحث لانا بہت ضروری ہے اور اس سے بھی زیادہ ضروری اس شخصیت کا تذکرہ ہے جو 1920ء کی دہائی میں اس سیاسی تنظیم کے خالق کی حیثیت سے نہ صرف پنجاب بلکہ تمام تر برصغیر میں معتبر ٹھہری۔ عہد حاضر میں فضل حسین کے سیاسی قد و کاٹھ سے متعلق معلومات حاصل کرنے کے لئے ماضی کے گم گشتہ اوراق کو کھنگالنا پڑے گا کیونکہ کل کے اس معتبر کو آج معتوب گردانا گیا ہے۔ فضلِ حسین کی سوانح جو کہ غلام حسین ذوالفقار نے چند سال پہلے مرتب کی موصوف پر تحقیقی دستاویز سے زیادہ عائد کی گئی فردِ جرم معلوم ہوتی ہے۔ فضل حسین پر پُرمغز تبصرہ عاشق حسین بٹالوی نے اپنی معروف تصنیف ''اقبال کے آخری دو سال'' میں کیا ہے۔ اگرچہ حتمی نتیجے میں فضل حسین کو بٹالوی صاحب بھی کٹہرے میں کھڑا کر دیتے ہیں اور کم و بیش سید کلبِ عابد اور زاہد چوہدری کی تصانیف بھی معروضیت کے پلو کو جھٹکتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔ لہٰذا آئندہ سطور میں زیادہ تر انحصار ''عظیم حسین'' اور ''سید نور احمد'' کی تصانیف پر کیا گیا ہے۔ علاوہ ازیں سید عمران علی کے مقالات اور آئن ٹالبوٹ کے تجزیوں سے بھی استفادہ کیا گیا ہے۔

یونینسٹ پارٹی کی باقاعدہ طور پر ابتداء یوں تو 1- جنوری 1924ء میں ہوئی جب پہلی صوبائی کونسل کی مدت ختم ہوگئی تھی گو کہ غیر رسمی طور پر اس تنظیم کا ڈھانچہ 1920ء ہی میں تشکیل پا چکا تھا۔ جب جنوری 1924ء میں صوبائی کونسل کی بعد از انتخابات نئے سرے سے تشکیل ہوئی تو اس میں ڈاکٹر گوکل چند نارنگ کی زیر قیادت نو سوراجی ارکان منتخب ہو کر آئے۔ سوراج پارٹی کو مرکزی سطح پر پنڈت موتی لال نہرو اور مسٹر سی آر داس کی رہنمائی اور آشیر باد حاصل تھی۔(1) علاوہ ازیں چوہدری افضل حق، رانا فیروز الدین اور مولوی مظہر علی اظہر پر مشتمل خلافت کمیٹی کے تین ارکان بھی کونسل کے رکن بن چکے تھے۔ ان کے علاوہ ہندو سبھا پارٹی جس کے لیڈر راجہ نرندر ناتھ تھے پانچ ارکان کے ساتھ شہری متوسط طبقے کی نمائندگی کر رہی تھی۔(2)

یاد رہے کہ نرندر ناتھ ہی نے 13- مارچ 1923ء کو فضل حسین کے خلاف عدم اعتماد کی قرارداد پیش کی تھی جس کا تفصیلی ذکر ذیل کی سطور میں کیا جائے گا۔ کونسل میں چھ زراعتی پس منظر رکھنے والے ہندوؤں کا الگ سے گروپ تھا اور روہتک سے تعلق رکھنے والے رکن راؤ بہادر لال چند اس گروپ کے روحِ رواں اور قائد تھے۔ ''یہ وہی لال چند تھے جو جدید اصلاحات سے پہلے بھی پنجاب کونسل کے ممبر رہ چکے تھے اور شہری و دیہاتی تفریق کے اس قدر معاون تھے کہ اُنہی کی

کوششوں سے شہری اور دیہاتی آبادی کے تناسب سے نئی کونسل میں نشستوں کی تعداد بھی مقرر کی گئی تھی۔ اسی سلسلے میں چوہدری لال چند نے یہ تجویز بھی پیش کی تھی کہ جب دیہاتی آبادی کے تناسب سے کونسل کی نشستیں مخصوص ہو جائیں گی تو دیہات کے انتخابی حلقے سے صرف وہی امیدوار کھڑے ہوسکیں گے جو قانونِ انتقال اراضی کی وجہ سے زراعت پیشہ اقوام سے تعلق رکھتے ہیں۔"(3)

کونسل میں سات ارکان اپنے آپ کو مسلم لیگی کہتے تھے حالانکہ انتخابات میں لیگ نے سیاسی پارٹی کے طور پر حصہ نہ لیا تھا اور گیارہ ارکان کا تعلق شرومن گوردوارہ پربندھک کمیٹی سے تھا۔(4) سارے ایوان میں چھ ممبر ایسے جن کا کسی پارٹی سے تعلق نہ تھا۔ ان سب کے علاوہ بیس بائیس ارکان ایسے تھے جو سرکاری بلاک سے تعلق رکھتے تھے۔ جب جنوری 1924ء میں مانٹیگو چیمسفورڈ اصلاحات (1919ء) کے تحت رائج ہونے والے نظامِ دوعملی کے نفاذ کے بعد وزارت سازی کا لمحہ آیا تو سر فضل حسین نے 24 مسلمان زمینداروں اور چھ ہندو جاٹوں کو اکٹھا کر کے "نیشنل یونینسٹ پارٹی" کی بنیاد رکھی(5) جو اپنی ہیت ونظریہ کے اعتبار سے غیر فرقہ وارانہ تھی اور زراعتی طبقے یا یہ کہنا زیادہ مناسب ہوگا کہ زمیندار طبقے کے مفادات کی امین تھی اور ساتھ ہی ساتھ شہری متوسط طبقے کی جو کہ تعداد اور تناسب کے حوالے سے قومیتی طور پر زیادہ تر ہندو تھا سخت مخالف تھی۔ اس طرح یونینسٹ پارٹی کے ظہور کے باعث 19 ویں صدی کے دوران پنجاب میں کی جانے والی دورخی تقسیم جس کے تحت نہ صرف مذہبی بنیادوں پر پنجاب کے عوام منقسم ہو گئے تھے بلکہ ایس ایس تھوربرن۔ چارلس ریواز اور ایبٹن جیسے مستشرق منتظمین کی پالیسیوں کی وجہ سے شہری دیہی بنیادوں پر بھی اس معاشرت میں دراڑیں نمودار ہونا شروع ہوگئی تھی جو 1920ء کی دہائی تک مزید وسیع اور پختہ تر ہو چکی تھیں۔ بعدازاں پنجاب کے عوام میں اس دورخی تقسیم نے یونینسٹ پارٹی کے سیکولر کریکٹر کو بھی فرقہ واریت سے ہم آہنگ کر دیا تھا۔ اغلباً اس کی وجہ یہ تھی کہ مغربی پنجاب میں دیہات میں بسنے والوں کی اکثریت مذہباً مسلمان تھی لہٰذا دیہی یا زرعی مفادات کی نمائندہ جماعت چاہتے ہوئے بھی مکمل طور پر غیر فرقہ وارانہ نہ ہو سکتی تھی۔ یونینسٹ پارٹی کے قیام کے طولانی پس منظر کی ابتداء کا کھوج لگانا مقصود ہو تو 1849ء میں الحاق پنجاب کے بعد سے انگریز سرکار کی زرعی پالیسیوں اور ان کے اثرات کا جائزہ لئے بغیر چارہ نہیں اسی لئے 19 ویں صدی کے

نوآبادیاتی پنجاب کواختصار کے ساتھ زیر بحث لانا ضروری ہے۔

تھوربرن۔میلکم ڈالنگ اور سیتا رائے کی کتب کا حوالہ دے کر یہ کہا جاسکتا ہے کہ پنجاب میں کسان نجی حقوق ''جائیداد''۔دولت کی قوت خرید اور قرقی وفروخت جیسے تصورات سے قطعاً نابلد تھا۔(6) کاشتکار کواس کی مزروعہ اراضی سے بیدخل کرنے کا سوچا بھی نہیں جاسکتا تھا۔جہاں تک قرضہ کی بات تھی تو اس کی کوئی قانونی ضمانت نہ ہوتی تھی اور قرض دہندہ مقرض کاشتکار کی زمین کا اپنے نام انتقال نہ کرا سکتا تھا چنانچہ کاشتکار قرض کی رقم تبھی ادا کرتا تھا جب اُس کے پاس فالتو رقم ہوتی تھی۔نہ ہی قرضے کی رقم کی وصولی کے لئے سرکاری اہلکاروں کی مدد لی جاسکتی تھی لہٰذا ساہوکار دیہات میں بسنے والے لوگوں کی اجتماعی قوت کے سامنے بے بس ہوتا تھا۔وہ قرض کی رقم کی واپسی کے لئے حکومت کے کردار کی بجائے اپنے ذاتی اثر ورسوخ پر ہی انحصار کرتا تھا۔

1850ء کے بعد ہنری لارنس کے اِس عرصہ ہائے دراز سے چلتے آرہے نظامِ اراضی میں بنیادی نوعیت کی تبدیلیاں کیں جن میں سے ایک تبدیلی کی رو سے ساہوکار کے قرضے کی دستاویز کو قانونی تقدس بخش دیا گیا اور اسے بعض شرائط کے تحت زمین رہن رکھنے یا اُسے خرید لینے کا حق حاصل ہوگیا۔اس طرح ہر گاؤں میں ساہوکار کی بالادستی قائم ہوگئی اور گاؤں والوں کی اجتماعی قوت میں کمی آ گئی۔

اس کے علاوہ ساہوکاروں اور تاجر پیشہ افراد کی زرعی اراضی کے حصول میں بڑھتی ہوئی دلچسپی کی کچھ دیگر وجوہات بھی تھیں۔الحاق پنجاب کے بعد زیر کاشت رقبے میں غیر معمولی اضافہ دیکھنے میں آیا مثلاً 1968ء سے 1970ء کی درمیانی مدت میں تقریباً 20 سے 23 ملین ایکڑ اراضی کو قابلِ کاشت بنایا گیا۔(7) اسی طرح ایسی زمین کے تناسب میں بھی خاطر خواہ اضافہ ہوا جسے آبپاشی کے لئے پانی میسر تھا کیونکہ انگریزوں کی جانب سے نہری نظام نے مغربی پنجاب کی بے آب وگیاہ چراہیں سیراب کرنے کا اہتمام کر دیا تھا۔1868ء میں تقریباً 6 ملین ایکڑ اراضی کو سیراب کرنے کے لئے پانی میسر تھا کہ پانی زیادہ تر کنوؤں سے حاصل کیا جاتا تھا لیکن 1900ء تک 5 ملین غیر مزروعہ اراضی کے لئے نہروں کا پانی مہیا کر کے انہیں کاشت کے قابل بنایا گیا تھا۔(8) اس طرح جس قدر قابلِ کاشت زمین کے تناسب میں اضافہ ہوتا گیا اسی طرح ہی سرکاری مالیے میں رقوم بھی بڑھتی رہیں۔علاوہ ازیں نقل وحمل کے وسائل میں اضافے سے بھی

زمین کی وقعت مزید بڑھ گئی تھی کیونکہ پنجاب کی زرعی اجناس کوطول وعرض کی منڈیوں میں بھیجا جانا ممکن ہوگیا تھا مثلاً 1883ء میں ریلوے کے ذریعے سے 10 ملین من زرعی اجناس جن کی مالیت 37 ملین روپے تھی دوسرے علاقوں کو برآمد کی گئیں۔(9) اب زرعی پیداوار میں اس قدر ترقی کے بعد جیسا کہ ایک عصری مصنف کا کہنا ہے کہ پنجاب میں گندم کی قیمت خرید کا انحصار لیور پول میں اس کی قیمت پر تھا۔(10) اب کاشتکار نے اپنی ضروریات سے زیادہ زرعی پیداوار حاصل کرنا شروع کر دی تھی اور وہ بین الاقوامی تجارت کا حصہ بن گیا تھا۔ اس پیش رفت کی وجہ سے پنجاب نوآبادیاتی معیشت کا جزو لاینفک بن گیا۔ یہاں سے خوراک اور خام مال برآمد کئے جاتے اور دیگر مصنوعات اور قیمتی دھاتیں درآمد کی جانے لگیں۔(11)

اِن حالات میں زرعی اراضی ایک قیمتی ''شے'' بن گئی۔(12) 1870ء میں فی ایکڑ زرعی اراضی کی قیمت 10 روپے تھی لیکن 1891ء میں یہ قیمت بڑھ کر 60 روپے ہوگی۔(13) چونکہ زمین کی قدر و قیمت میں اضافہ ہونے لگا تھا لہٰذا اس کی فروخت کا رواج بھی بڑھنے لگا۔ 1857ء سے قبل زمین کو فروخت کرنے کا رجحان نہ ہونے کے برابر تھا لیکن 1872ء کے بعد اس رجحان میں خاطر خواہ اضافہ دیکھنے کو ملا۔ 75-1874ء فروخت کی جانے والی زمین 179,000 ایکڑ تھی جو کہ 85-1884ء میں بڑھ کر 209,000 ایکڑ ہوگئی اور 95-1894ء میں یہ مزید بڑھ کر 321,000 ایکڑ تک جا پہنچی۔ بالکل اسی طرح زمین کو رہن رکھنے کے رجحان میں بھی اضافہ ہوا۔ یعنی 75-1874ء میں رہن رکھی جانے والی زمین 204,000 ایکڑ تھی جو بڑھ کر 323,000 ایکڑ (85-1884ء) میں اور 603,000 ایکڑ (95-1894ء) ہوگئی۔(14) صوبہ پنجاب میں کسی بھی صنعتی ترقی کے نہ ہونے کی وجہ سے زرعی زمین میں سرمایہ لگانے کا نادر موقع میسر آیا۔ چنانچہ بینکاروں اور ساہوکاروں کی تعداد میں تیزی سے اضافہ ہونے لگا۔(15) جو کہ زیادہ تر پنجاب کے تجارتی گھرانوں اور قومیتوں سے تعلق رکھتے تھے یہی وہ لوگ تھے جنہیں سول انتظامیہ اور کچہریوں میں اثر و رسوخ حاصل تھا۔ اسی جدیدیت نے جہاں کچھ لوگوں کے لئے ترقی کی راہیں کھولیں وہی نام نہاد تہذیبی مراکز سے دور اپنی ہی دنیا میں مگن کاشتکاروں اور کسانوں کے مقدر بھی اسی نے پھوڑ ڈالے۔ یہ آزاد معیشت کا شاخسانہ تھا جو کہ نوآبادیاتی آقاؤں کی دین تھی اور آزاد معیشت کے مضر اثرات سے آگاہی بھی نوآبادیاتی آقاؤں کے قابل و اہل کار پردازوں

ہی کو ہوئی جب ایس ایس تھوربرن نے 1880ء کی دہائی میں Musalmans of Money Lenders in the Punjab میں بڑھتے ہوئے انتقالِ اراضی میں پیش آمدہ سیاسی اضطراب محسوس کیا۔ اس کا کہنا تھا کہ ''سرحدی صوبے کے فوجی بھرتی کے موافق اضلاع میں کسانوں کو بیدخل کر کے ایسے لوگ زمینوں پر قابض ہو رہے ہیں جن کا زمین اور اس سے جنم لینے والی روایات سے دور پار کا بھی واسطہ نہیں اور جو کہ حکومت کے بھی خیر کار نہیں۔ زمینوں سے بیدخلی کے نتیجے میں کسانوں میں ہیجان بڑھتا جا رہا ہے اور ضرورت اس امر کی ہے کہ بروقت اقدام کیا جائے۔''
چنانچہ تھوربرن کے ساتھ ساتھ برانڈرتھ اور ریواز جیسے افسران کی بھرپور حمایت سے ''دی پنجاب ایلینیشن آف لینڈ ایکٹ'' 1900ء میں منظور کر کے اس سے اگلے سال سے لاگو بھی کر دیا گیا۔ اِس قانون کی رو سے کسانوں کو قرضہ حاصل کرنے سے تو نہ روکا گیا البتہ زمین کے غیر زرعی افراد کے نام انتقال پر حدود عائد کر دی گئی۔ 1900ء کے بعد سے زمینداروں اور کاشتکاروں کو ہر طرح کا قانونی تحفظ فراہم کیا گیا۔ اس دوران پنجاب کا شہری متوسط طبقہ سراپا احتجاج بنا رہا۔ زمیندار ہی نوآبادیاتی حکمرانوں کے دست راست بنے اور وفاداری کا ثمر بھی انہی نے پایا۔ اس کے برعکس یہاں کے متوسط طبقے کی ترقی کے ذرائع کو محدود کر کے رکھ دیا گیا۔ پنجاب کے شہروں میں 20ویں صدی کے ابتدائی سالوں میں آریہ سماج اور راشٹر سیوک سنگھ جیسی مذہبی انتہا پسند تنظیموں کی بڑھتی ہوئی مقبولیت کو حکومتی پالیسیوں کا ردعمل بھی قرار دیا جا سکتا ہے جو سراسر دیہی ناخداؤں کو تحفظ فراہم کرنے کے لئے وضع کی گئی تھیں۔

جب 1920ء میں پنجاب قانون ساز کونسل کے لئے پہلی مرتبہ انتخابات کرائے گئے تو نوآبادیاتی حکمرانوں نے اِسے ضروری محسوس کیا کہ وہ ''زرعی پس منظر کے حامل'' اپنے معاونین کے لئے کونسل کی زیادہ سے زیادہ رکنیت کو ممکن بنائیں۔ نہ صرف یہ کہ مسلمانوں کے جداگانہ انتخابات کا اہتمام عمل میں آیا بلکہ سکھوں کو بھی یہ رعایت دیدی گئی۔ مزید برآں شہریوں اور دیہاتیوں کے لئے الگ الگ حلقہ ہائے نیابت کی شرط بھی عائد کر دی گئی۔ چنانچہ زراعت پیشہ اقوام سے تعلق رکھنے والے ہی دیہی علاقوں سے انتخاب لڑ سکتے تھے۔ ووٹ ڈالنے والوں کا تناسب کل آبادی کا تین فیصد تھا جس میں تمام کمشنڈ نان کمشنڈ آرمی افسر، جاگیردار، ذیلدار، لمبردار اور سفید پوشوں کو ووٹر تسلیم کیا گیا تھا۔ ان کے علاوہ مالکانِ اراضی یا مزارعین میں سے بھی وہ

جو 25 روپے یا اس سے زیادہ سالانہ مالیہ ادا کرتے تھے ووٹ دینے کے اہل تھے۔ پنجاب میں اس انتخاب میں کل ووٹر تقریباً 500,000 تھے جن میں 420,000 دیہی علاقوں سے تعلق رکھتے تھے۔(16) اس تناظر میں یہ نتیجہ بآسانی اخذ کیا جا سکتا ہے کہ مجلسِ قانون ساز میں ارکان کی بھاری اکثریت زمینداروں پر ہی مشتمل تھی جو 1924ء میں منظم ہو کر یونینسٹ پارٹی کی شکل میں سیاسی منظرنامے پر ابھری۔ جس کی قیادت متوسط طبقے سے تعلق رکھنے والا وکیل یعنی فضل حسین کر رہا تھا۔ فضل حسین 1924ء تک کارزارِ سیاست کے داؤ پیچ اچھی طرح سے جان چکا تھا۔ ایک عرصہ تک کانگرس سے وابستہ رہنے کے بعد اُس نے پنجاب کی سیاست میں اپنے لئے ایک نئے کردار کا تعین کر لیا تھا اور یونینسٹ پارٹی کا قیام فضل حسین کے سیاسی کیریئر میں سب سے بڑا سنگِ میل ثابت ہوا۔ لیکن فضل حسین کے سیاسی کیریئر پر کوئی بھی تبصرہ کرنے سے پیشتر یہ ضروری دکھائی دیتا ہے کہ اس کے خاندانی پس منظر پر روشنی ڈالی جائے۔

(2)

فضل حسین 14- جون 1877ء کو میاں حسین بخش اور بی بی امیر النساء کے ہاں پشاور میں تولد ہوا۔ جہاں میاں حسین بخش ایکسٹرا اسسٹنٹ کمشنر کے عہدے پر فائز تھے۔(17) فضل حسین کا خاندان بھٹی راجپوتوں کا تھا جن کا آبائی علاقہ ہندوستان کی ریاست بیکانیر تھی لیکن 1500ء میں یہ قبیلہ جنوبی اور وسطی پنجاب تحصیل بٹالہ ضلع گورداسپور میں آن بسا تھا۔ مغلوں کے زمانے میں اعلیٰ فوجی خدمات سرانجام دیں اور جب پنجاب میں سکھوں کا عروج ہوا تو فضل حسین کے اجداد کی جاگیریں اور تمام تر Priveleges ضبط کر لئے گئے۔ استبدادِ زمانہ کے ہاتھوں مجبور میاں امام بخش اور ماکھے خان نے جو کہ مغل فوج میں غیر معمولی جنگی تجربہ رکھتے تھے رنجیت سنگھ کو اپنی خدمات پیش کیں اور اعلیٰ عہدے حاصل کرنے میں بھی کامیاب اور اجنالہ ضلع امرتسر میں چیمیاری اور کوٹلہ محمد قائم کی جاگیریں بھی ملیں۔ بعد ازاں ماکھے خان جنرل شیر سنگھ کے ماتحت کی حیثیت سے چلیانوالہ کی جنگ میں کام آیا جبکہ میاں امام بخش کھڑک سنگھ کی کمان میں لڑتا ہوا قیدی بنا اور انگریزوں کے ہاتھوں موت کی سزا پائی۔ انگریزوں کی حکومت کی ابتداء ہوئی پہلے پہل تو فضل حسین کے اجداد کو اپنی انگریز دشمنی کے سبب بہت سے مصائب جھیلنے پڑے لیکن اس کے دادا میاں

دین محمد نے انگریز دشمنی کی اس روایت کو خیر آباد کیا اور اپنے بیٹے کو انگریز سرکار کی نوکری کرنے کی ترغیب دی۔ اس طرح فضل حسین کے والد نے 15 روپے ماہوار پر نائب منصرم کی حیثیت سے اپنے کیریئر کا آغاز کیا اور 1904ء میں ڈیرہ غازی خان کے ڈسٹرکٹ جج کی حیثیت سے ریٹائر ہوئے۔ میاں حسین بخش کی بحیثیت ایک سول سرونٹ یہ فطری خواہش تھی کہ ان کا بیٹا آئی سی ایس کر کے بڑا عہدہ پائے۔ میاں فضل حسین نے میونسپل بورڈ سکول ایبٹ آباد اور گورنمنٹ ہائی سکول پشاور سے تعلیم حاصل کر کے گورنمنٹ کالج لاہور میں داخلہ لیا اور علامہ اقبال کے ہم مکتب و ہم جماعت ہوا۔ ڈگری لینے کے بعد انگلستان میں آئی سی ایس کا دو مرتبہ امتحان دیا مگر دونوں مرتبہ ناکامی ہوئی چنانچہ Greys in سے بیرسٹری کر کے 1901ء میں وطن آئے اور سیالکوٹ میں وکالت شروع کی۔ سیالکوٹ میں فضل حسین نے کم وبیش چار سال تک وکالت کی اور گاہے بگاہے انجمنِ اسلامیہ اور انجمنِ حمایت اسلام کے لئے بھی خدمات سرانجام دیں۔ 1905ء میں فضل حسین لاہور منتقل ہو گئے البتہ اگلے دو سال تک کسی سیاسی سرگرمی میں حصہ نہ لیا اس دوران وہ اسلامیہ کالج کے آنریری پرنسپل اور بعد میں انجمنِ حمایت اسلام کی کالج کمیٹی کے سیکرٹری رہے۔ یہ عہدہ اگلے پندرہ برسوں تک ایک آدھ وقفے کے ساتھ فضل حسین ہی کے پاس رہا۔(18)

فضل حسین کی سیاسی زندگی کا آغاز 1915ء سے ہوا جب انہوں نے پنجاب یونیورسٹی کے حلقہِ انتخاب سے پنجاب کونسل کا الیکشن لڑنے کی ٹھانی۔ اِسی دوران فضل حسین کو پنجاب میں کمیونلزم کے عفریت کے بارے میں جاننے کا موقع ملا۔ جب ووٹ مانگنے کے لئے فضل حسین نے ہندو ووٹروں سے رابطہ کیا جن کے بارے میں انہیں گمان تھا کہ وہ ان کی قوم پرستی اور اہلیت سے پوری طرح واقف ہوں گے لیکن ان کی توقعات کے برعکس 30 ہندو ووٹروں میں 27 نے یہ تسلیم کرتے ہوئے کہ فضل حسین ہی اس سیٹ کے لئے سب سے مناسب امیدوار ہیں ان کے حق میں ووٹ دینے سے معذوری ظاہر کر دی۔ حالانکہ ان دنوں فضل حسین کانگرس کے سرگرم رکن تھے۔ اگرچہ فضل حسین یہ انتخاب بہت ہی معمولی فرق سے جیت گئے لیکن اِس تجربے نے (جو انہیں انتخاب کے دوران ہوا) انہیں اس بات پر قائل کر دیا کہ مخلوط انتخابات کی تمام خوبیوں کے باوجود جداگانہ انتخابات کی اہمیت اور ضرورت سے انکار ممکن نہیں اور مخلوط انتخابات سے مسلمانوں کو کبھی آگے آنے کا موقع نہیں ملے گا جو کہ ووٹروں کی حیثیت سے پنجاب میں اقلیت میں تھے۔

(19) لیکن اس سے یہ مطلب ہرگز اخذ نہیں کرنا چاہئے کہ فضل حسین جداگانہ انتخاب یا پھر سرکاری نوکریوں میں قومیتی امتیاز کے اصول کو آخری منزل سمجھتے تھے بلکہ حقیقت تو یہ ہے کہ فضل حسین کا منتہائے مقصود متحدہ ہندوستان اور اس کی بھلائی اور فلاح تھی لیکن عارضی بندوبست کے طور پر وہ یہ ضروری سمجھتے تھے کہ مسلمان جو کہ تعلیم میں اپنے ہموطنوں سے کہیں پیچھے رہ گئے تھے انہیں کم از کم کچھ عرصے کے لئے ہینڈی کیپ دینا ضروری ہے خاص طور پر وہ مسلمان جو مقابلے کی دوڑ کے لئے کمر کس چکے ہیں ورنہ وہ چند قدم میں ہی پٹ کر دوڑ سے باہر ہو جائیں گے۔ یہی وہ سوچ تھی جنہوں نے فضل حسین کی بطور وزیر یا پھر سیاستدان فکری اساس کا کام کیا۔ 20 ویں صدی کی دوسری دہائی کے دوران متعدد کانگرسی لیڈر بھی اسی سوچ کو متحدہ ہندوستان کی تشکیل و تعمیر کا واحد ذریعہ سمجھتے تھے کہ مسلمان بھی قانون ساز اداروں میں جائیں سرکاری نوکریوں پر فائز ہوں اور عوامی سرگرمیوں میں جوش و خروش سے حصہ لیں۔ اسی لئے 1916ء میں لکھنو کا معاہدہ ممکن ہو سکا جو کہ 20 ویں صدی کے دوران ہندوستان میں قومی نوعیت کا واحد معاہدہ تھا اور جس میں میاں فضل حسین نے کلیدی کردار ادا کیا تھا۔ یاد رہے کہ 1916ء کے بعد وہ نہ صرف پنجاب کانگرس کے صدر تھے بلکہ پنجاب مسلم لیگ کے سیکرٹری جنرل کا عہدہ بھی انہی کے پاس تھا۔(20)

(3)

1919ء میں مانٹیگو چیمسفورڈ اصلاحات کے بعد ہونے والے انتخابات سے ذرا پہلے رولٹ ایکٹ اور اس کے نتیجے میں ہونے والے احتجاج نیز سانحہ جلیانوالہ باغ نے پنجاب میں صورتحال کو برانگیختہ کر دیا اسی دوران عدم تعاون کی تحریک نے حالات کو مزید غیر یقینی بنا دیا۔ چونکہ کانگرس عدم تعاون کی تحریک میں پیش پیش تھی لہٰذا فضل حسین کے لئے ایک اور فیصلے کی گھڑی آن پہنچی۔ آئین اور قانون کی حدود سے تجاوز کرنا فضل حسین کے نزدیک غیر ضروری اور اوچھی حرکت تھی وہ افہام و تفہیم کے ذریعے متحدہ ہندوستان کو پنپتا ہوا دیکھنا چاہتے تھے۔ جب انتخابات کا انعقاد ہوا تو کانگرس اور مسلم لیگ کے اِن میں حصہ نہ لینے کے فیصلے کو بالائے طاق رکھتے ہوئے فضل حسین نے انتخاب لڑا اور کامیابی حاصل کی۔ پنجاب میں بننے والی وزارت کے دو ارکان میں سے ایک فضل حسین تھے جس کا انہوں نے 3- جنوری 1921ء کو حلف لیا۔ انہیں تعلیم، صحت اور لوکل سیلف

گورنمنٹ کے محکمے تفویض ہوئے۔(21) دوسرے وزیر لالہ ہر کشن لال تھے جنہیں گورنر ایڈورڈ میکلیگن نے فضل حسین ہی کی سفارش پر وزارت کا قلمدان دیا تھا۔وہ زراعت کے محکمے کے وزیر بنے۔

اس ضمن میں عاشق بٹالوی کا کہنا ہے کہ ''میاں فضل حسین سرے سے عوامی تحریکوں کے مخالف تھے۔وہ صرف اپنی فراست اور بساط سیاست کے چند ممبروں کو اُدھر سے اِدھر اور اِدھر سے اُدھر حرکت دے کر بازی جیتنے کے قائل تھے۔''(22)

ان کے علاوہ نئی وجود میں آنے والی کونسل میں 23 سرکاری وغیر سرکاری نامزد ارکان اور 71 منتخب ارکان تھے جن میں 35 مسلمان، 15 سکھ اور 21 ہندوٗ تھے۔ 35 مسلمانوں میں 30 دیہاتی جبکہ 5 شہری حلقوں سے آئے تھے۔مسٹر ایم ایس بٹلر کو اس کونسل کا صدر مقرر کیا گیا جبکہ مسٹر جان مینارڈ اور سردار سندر سنگھ مجیٹھہ بالترتیب فنانس اور ریونیو ممبر زتقرر عمل میں آیا۔(23)

وزارت پر متمکن ہوتے ہی فضل حسین نے زرعی مفادات کے حامل اراکین کو جمع کر کے ''زمیندارہ پارٹی'' تشکیل دی جو 1924ء میں یونینسٹ پارٹی کی شکل اختیار کر گئی تھی۔لیکن یہاں پر یہ سوال جنم لیتا ہے کہ فضل حسین جیسے شہری بورژواہی تمام تر زرعی ودیہی ارکان کا لیڈر کیونکر بن گیا اور اگر اس سوال کو تھوڑا طول دیا جائے تو یہ استفسار بھی کیا جا سکتا ہے کہ 1920ء میں بننے والی دونوں وزارتیں ہی شہری بورژوا طبقے کے نمائندوں کو دی گئیں۔ جہاں تک فضل حسین کی تمام دیہی ارکان کونسل کو اپنی قیادت تلے جمع کر لینے کا معاملہ ہے تو عاشق حسین بٹالوی کہتے ہیں کہ ''فضل حسین کا یہ کمال تھا کہ ایک طرف انہوں نے اپنی رائے کی پختگی اور ارادے کی مضبوطی سے گورنر کو مرعوب کر لیا اور دوسری طرف کونسل کے دیہاتی ممبروں کو عملاً یقین دلا دیا کہ وہ جو چاہتے ہیں کر گزرتے ہیں۔گورنر اُن کی مخالفت نہیں کر سکتا۔پنجاب کے دیہاتی زمیندار جنہیں انگریز کی عظمت وجبروت کے سامنے کبھی دم مارنے کی ہمت نہیں ہوئی تھی۔فضل حسین کے ان کارناموں سے بہت متاثر ہوئے چنانچہ کچھ میاں صاحب کے اثر ورسوخ سے مرعوب ہو کر اور کچھ اس خیال سے کہ ایک مسلمان نے پوری قوم کا نام روشن کر دیا ہے۔تمام دیہاتی مسلمان ممبر دل وجان سے فضل حسین کے حامی بن گئے۔(25) اور جہاں تک دیہاتی ارکان کی اکثریت رکھنے والے ایوان میں دونوں بورژوا وزیروں کا سوال تھا تو اس کا جواب پنجاب میں اس وقت کے حالات پر تبصرے سے دیا جا

سکتا ہے کیونکہ ترک موالات کے زمانے میں پنجاب کے شہروں میں بھی انگریز سرکار کو بہت ہی گمبھیر مسائل کا سامنا تھا لہٰذا شہری متوسط طبقے کو رام کرنے کی یہی ترکیب سوچی گئی کہ وزارتوں پر انہی کے نمائندوں کو فائز کر دیا جائے۔

جب فضل حسین وزیر بنے تب تک کانگرس میثاق لکھنو سے دست کش ہو کر ترک موالات کی پالیسی پر عمل پیرا ہو چکی تھی لیکن پرانے کانگرسی اور مسلم لیگی کی حیثیت سے میاں فضل حسین کو یقین تھا کہ میثاق کی شقوں پر عمل کر کے ہی صوبے میں قومی توازن لایا جا سکتا ہے چنانچہ انہوں نے پہلا کام تو یہ کیا کہ لاہور کے میڈیکل کالج اور گورنمنٹ کالج میں مسلمان طلباء کے لئے 40 فیصد نشستیں مختص کر دیں۔ جن میونسپل کمیٹیوں میں مسلمانوں کو اپنی آبادی کے تناسب سے کم نشستیں حاصل تھیں۔ ان کی نمائندگی تناسبِ آبادی کے مطابق بڑھا دی۔ اور سرکاری ملازمتوں میں مسلمانوں کا چالیس فیصد حصہ مقرر کر دیا۔ (26)

ان اقدامات نے جہاں مسلمانوں کے لئے ترقی کی تھوڑی بہت راہ ہموار کی وہاں ہندوؤں میں فضل حسین کی ساکھ اور مقبولیت کو سخت نقصان پہنچا۔ انہیں فرقہ پرستی کا بانی، ہندو مسلم اتحاد کا دشمن، ہندوؤں کا قاتل اور ہندوستان کا بدخواہ قرار دیا جانے لگا۔ حتیٰ کہ 13- مارچ 1923ء کو راجہ نرندر ناتھ نے پنجاب کونسل میں ان کے خلاف عدم اعتماد کی قرارداد پیش کی جو پانچ نکات پر مشتمل تھی:

الف۔ پنچایت ایکٹ میں اقلیتوں کے حقوق کی حفاظت نہیں کی گئی۔

ب۔ سرکاری ملازمتیں فرقہ وارانہ بنیادوں پر دی گئی ہیں۔

ج۔ گورنمنٹ کالج اور میڈیکل کالج میں طلباء کو داخلہ فرقہ وارانہ اصول پر دیا جانے لگا ہے۔

د۔ بعض میونسپل کمیٹیوں میں فرقہ وارانہ نمائندگی کا اصول رائج کر دیا گیا ہے۔

ڈ۔ گوردوارہ ایکٹ منظور کر کے ہندوؤں اور سکھوں میں نفاق کا بیج بو دیا گیا ہے۔ (27)

اس قرارداد کو منظور نہ کیا جا سکا اور فضل حسین کامیاب ٹھہرے لیکن اس قرارداد کے حوالے سے ان کی طرزِ فکر میں تبدیلی رونما ہوئی اور انہیں یہ بھی پتہ چل گیا کہ مسندِ وزارت کو محفوظ رکھنے کے لئے انہیں اپنی پالیسی میں بنیادی تبدیلیاں کرنا ہوگئیں۔ یہی وجہ تھی کہ دوسری وزارت کی تشکیل

کے وقت انہوں نے راؤ بہادر لال چند کو وزیر بنوایا جو کہ زرعی اور دیہی طبقے کا نمائندہ تھا۔

فضل حسین کے بطور وزیر اس قدر مؤثر ہونے کی بڑی وجہ ان کے گورنر پنجاب ایڈورڈ میکلیگن سے تعلقات تھے یقیناً اُن تمام اقدامات کو عملی جامہ پہنانے کے لئے میکلیگن نے ان کی غیر مشروط حمایت کی تھی اور جب جون 1924ء میں میکلیگن کی بجائے میلکم ہیلی گورنر پنجاب بنا تو فضل حسین کے لئے مشکلات نے سر اٹھانا شروع کر دیا کیونکہ ہیلی فضل حسین کو شہری متوسط طبقے کا نمائندہ سمجھتے ہوئے انگریز سرکار کے لئے نہایت خطرناک تصور کرتا تھا۔ چنانچہ ہیلی اور فضل حسین کے درمیان تضاد کا پہلا مظاہرہ جنوری 1925ء میں ہوا جبکہ صوبائی کونسل کے صدر کے انتخاب کا مسئلہ درپیش ہوا۔ گورنر چاہتا تھا کہ اسی انگریز ہی کی مدت بڑھا دی جائے جسے جنوری 1921ء میں ایک مقررہ معیاد کے لئے نامزد کیا گیا تھا۔ فضل حسین سر عبدالقادر کو کونسل کا صدر بنوانا چاہتے تھے۔ چنانچہ انہوں نے پہلے تو پارٹی سے اس مضمون کی قرارداد منظور کرائی اور بعدازاں ہیلی کو بھی اس قرارداد کے زور پر آمادہ کر لیا۔ چنانچہ یونینسٹ پارٹی کے سر عبدالقادر اور سوراج پارٹی کے ڈاکٹر گوکل چند نارنگ کے درمیان مقابلہ ہوا جس میں سر عبدالقادر 41 جبکہ گوکل چند نارنگ کو 32 ووٹ ملے۔ گو کہ سوراج پارٹی کے مقابلے میں یونینسٹ پارٹی کی فتح ہیلی کو زیادہ مرغوب تھی پھر بھی اُسے یہ بات ہرگز نہ بھائی تھی کہ فضل حسین کی بورژوا قیادت جاگیرداروں کے سہارے مضبوط سے مضبوط تر ہوتی چلی جائے۔ سر عبدالقادر بھی شہری متوسط طبقے سے تھا اور وکالت کے پیشے سے منسلک تھا لہٰذا گورنر ہیلی نے اُسے اس کا مقام یاد دلانا مناسب سمجھا۔ اسی دوران جون 1925ء میں وائسرائے کی ایگزیکٹو کونسل کا ایک مسلمان رکن سر حبیب اللہ تین ماہ کی چھٹی پر چلا گیا تو اس کی جگہ عارضی طور پر فضل حسین کا تقرر کر دیا گیا اور فضل حسین کی وزارت پر سر عبدالقادر کی تقرری عمل میں آ گئی۔ تین ماہ بعد فضل حسین واپس آیا تو اُسے حسب وعدہ وزارت کا عہدہ دوبارہ سے دیدیا گیا اور سر عبدالقادر بالکل ہی فارغ ہو گیا وہ نہ تو وزیر رہا اور نہ ہی کونسل کا صدر۔ (28) جب جنوری 1926ء کونسل کی صدارت کے لئے کاغذات نامزدگی داخل کرنے کا وقت آیا تو ظاہر ہوا کہ یونینسٹ پارٹی فضل حسین کی جیب میں نہیں بلکہ ہیلی کے اشارہ اَبرو کی تابع ہے۔ اس مقابلے میں ملک فیروز خان نون چوہدری شہاب الدین اور میاں محمد شاہنواز نے کاغذات نامزدگی داخل کئے لیکن ہیلی ہی کی مداخلت پر نون مقابلے سے دستبردار ہو گیا اور شہاب الدین اور شاہنواز میں مقابلہ

ہوا تو شہاب الدین کو چھ ووٹوں سے کامیابی حاصل ہوگئی۔(29)

ہیلی اور فضل حسین کا ساتھ 1926ء سے آگے نہ بڑھ سکا کیونکہ اسی سال کے ابتداء ہی میں فضل حسین کو سندر سنگھ مجیٹھہ کی جگہ پانچ سال کے لئے اپنی ایگزیکٹو کونسل کا ریونیو ممبر نامزد کر لیا تھا اور اس کی جگہ سر جوگندر ناتھ کو منتخب وزیر نامزد کر دیا تھا۔ چنانچہ جنوری 1926ء میں جو تیسری کونسل تشکیل پائی تو اس کا ایک اہم پہلو یہ تھا کہ یونینسٹ پارٹی ہی کے ممبران کے طور پر سر محمد اقبال، شیخ دین محمد، مقبول محمود اور چوہدری ظفر اللہ خان جیسے شہری متوسط طبقے کے نمائندے تھے اور دوسرا اہم پہلو یہی تھا کہ اُس میں فضل حسین شامل نہ تھے۔ علاوہ ازیں ایک برس تک تو چھوٹو رام اور جوگندر سنگھ ہی وزیر رہے لیکن بعد میں وزارتوں کی تعداد دو سے بڑھا کر تین کر دی گئی یعنی جوگندر سنگھ، سر منوہر لال اور تیسرا ملک فیروز خان نون وزیر بنائے گئے۔(30)

تیسری کونسل کی تشکیل میں ایک قابلِ ذکر نکتہ یہ بھی تھا کہ اُس میں یونینسٹ پارٹی کی اکثریت نہ تھی۔ گو کہ روہتک کے جاٹ اور مسلم جاگیرداروں کا اتفاق و اتحاد برقرار رہا لیکن اس دوران فیصلہ کن حیثیت سرکاری بلاک کو حاصل رہی اور میلکم ہیلی نے فضل حسین کی بڑھتی ہوئی سیاسی وقعت کو کم کرنے کے لئے کوئی دقیقہ فرو گزاشت نہ کیا اور زاہد چوہدری کا کہنا تو یہ ہے کہ وہ سیاسی پوزیشن جو فضل حسین نے اس پارٹی (یونینسٹ پارٹی) کی وساطت سے بڑی تگ و دو کے بعد بنائی تھی وہ میلکم ہیلی نے ڈیڑھ ماہ ہی میں ختم کر کے رکھ دی تھی(31) لیکن حقیقت اس کے برعکس تھی بالفرض یہ مان بھی لیا جائے کہ میلکم ہیلی کے عہد گورنری میں فضل حسین اس طرح سے اپنے سیاسی جوہر دکھانے میں ناکام رہے تو بھی نہ صرف پنجاب کی سطح پر بلکہ کُل ہند سطح پر بھی جب تک فضل حسین زندہ رہے مسلم سیاست میں ان سے قد آور شخصیت اور کوئی نہ تھی۔ دراصل ہیلی کو فضل حسین اس وجہ سے کھٹکتے تھے کہ وہ متوسط طبقے سے تعلق رکھتے تھے اور اپنی سیاسی فراست کے باعث انہوں نے پنجاب بھر کے جاگیرداروں کی نیام اپنے ہاتھوں میں لے رکھی تھی جو ہیلی کو قابلِ قبول نہ تھی وہ جاگیرداروں کی رہنمائی کسی جاگیردار ہی کو سونپنے کا متمنی تھا لہٰذا اُس نے فیروز خان نون اور احمد یار دولتانہ کی پشت پناہی کر کے فضل حسین کی سیاسی وقعت پر کاری ضرب لگانے کی کوشش کی لہٰذا پہلے تو فضل حسین کو 1926ء میں ریونیو ممبر بنا دیا گیا اور بعد میں وائسرائے کی ایگزیکٹو کونسل کا ممبر نامزد کر دیا گیا اس طرح تقریباً نو برس تک فضل حسین پنجاب کی عملی سیاست

سے باہر رہے۔ 1935ء میں جب فضل حسین اپنے عہدے کی معیاد پوری کر کے واپس پنجاب آئے تو سکندر حیات خان اور اس کے دیگر حواری یونینسٹ پارٹی کے حوالے سے کافی متحرک ہو چکے تھے اور اس دور کا احاطہ کرنے والی اکثر تحریروں کا بین السطور مطالعہ اس بات کا بخوبی عندیہ دیتا ہے کہ یونینسٹ پارٹی میں نفاق کی دراڑیں بہت واضح ہو چکی تھیں۔ علاوہ ازیں فضل حسین کی صحت بھی خراب تر ہو گئی تھی اور پارٹی کے اراکین بھی یہ بھانپ گئے تھے کہ فضل حسین بہت عرصہ زندہ نہ رہیں گے بلکہ تحریری ریکارڈ اس بات کی غمازی کرتا ہے کہ سکندر حیات نے ان کے ذاتی معالج ڈاکٹر ہارپر نیلسن سے فضل حسین کی موت سے متعلق معلومات بھی اگلوانے کی کوشش کی(32) اور جب بگڑتی ہوئی صحت کے ساتھ ہی انہیں جب سازشوں کے اِس جال کا پتہ چلا تو ایک وقت انہوں نے خودکشی کا بھی ارادہ کر لیا لیکن کچھ عرصے میں ان کی طبیعت سنبھل گئی تو یہ ارادہ ترک کر دیا۔ اس کے باوجود فضل حسین جولائی 1936ء تک ہی زندہ رہے۔ اپنی تمام تر سیاسی فراست کے باوجود فضل حسین نے ایک مایوس شخص کے طور پر اس جہانِ فانی سے کوچ کیا۔ وائسرائے کی ایگزیکٹو کونسل کے رکن کی حیثیت سے اپنی معیاد پوری کر لینے کے بعد فضل حسین کا ارادہ تھا کہ یونینسٹ پارٹی کی تنظیم نو کی جائے اور جن خطوط پر وہ اس پارٹی کو منظم کرنا چاہتے تھے اگر ویسا ہو جاتا تو یقیناً پنجاب کی آئندہ سیاسی تاریخ مختلف ہوتی۔

اس حوالے سے فضل حسین کی خواہش تھی کہ پارٹی کی لیڈر شپ ان کے بعد سر چھوٹو رام کو ملے نہ کہ سکندر حیات کو جس کا پارٹی کی تشکیل و تنظیم میں کوئی کردار نہ تھا اور 1926ء سے 1935ء تک پارٹی کا لیڈر چھوٹو رام ہی تھا۔ فضل حسین کے انتقال کے بعد سکندر اور راجہ نریندر ناتھ (نیشنل پروگریسو پارٹی) کے مابین سمجھوتہ فضل حسین کی سیاسی سوچ کے قطعاً برعکس تھا۔ بالکل اسی طرح جناح سکندر معاہدہ بھی یونینسٹ پارٹی کے سیاسی لائحہ عمل سے بالکل مطابقت نہ رکھتا تھا اور فضل حسین نے جناح کے ساتھ 1936ء میں کسی بھی طرح کا اتحاد یا مفاہمت کرنے سے انکار کر دیا تھا اس کے علاوہ تحصیل اور ضلع کی سطح پر یونینسٹ پارٹی کی تنظیم نو کا خواب بھی پورا نہ ہو سکا۔ فضل حسین اب تک کی قانون سازی کے نتیجے میں بڑے بڑے زمینداروں کی اہمیت اور اقتصادی حیثیت میں غیر معمولی اضافے کا مشاہدہ کر چکے تھے۔ قانون ساز کونسل میں منظور ہونے والے قوانین کے نتیجے میں ساہوکاروں کی بڑھتی ہوئی اقتصادی قوت تو بہت حد تک ٹوٹ گئی لیکن ساہوکاروں کا زور

ٹوٹ جانے سے جو خلا پیدا ہوا اُسے بڑے زمینداروں ہی نے پُر کیا اور ساہوکارہ کرنے لگے۔ ان حالات میں فضل حسین نے یونینسٹ پارٹی کو آئندہ عام کاشتکاروں اور چھوٹے زمینداروں کی نمائندہ جماعت بنانے کا ارادہ کر لیا تھا (33) لیکن انہیں موت نے مہلت نہ دی۔ اگر اس پارٹی کے منشور میں یہ تبدیلیاں کر دی جاتیں تو یہ نہ صرف عوامی پارٹی کے طور پر پنجاب کے دیہات میں بورژوا طبقے کے ظہور کا باعث بنتی بلکہ یہاں پر فرقہ وارانہ عفریت بھی جنم نہ لے پاتا۔

حواشی

1- عاشق حسین بٹالوی، ''اقبال کے آخری دو سال'' (سنگِ میل پبلی کیشنز، لاہور 1989ء) ص159۔

2- ایضاً۔

3- ایضاً ص160۔

4- ایضاً ص159۔

5- زاہد چوہدری۔ پاکستان کی سیاسی تاریخ جلد 5 ''مسلم پنجاب کا سیاسی ارتقاء'' (1849ء۔1947ء) (ادارہ مطالعہ تاریخ لاہور 1991ء) ص97۔

6- ایضاً ص22۔

7- ایچ کیلورٹ۔ ''ویلتھ اینڈ ویلفیئر آف دی پنجاب'' (لاہور، 1936ء، طبع اول 1922ء)، ص107۔ 1917ء تک زیر کاشت رقبہ بڑھ کر 29 ملین ایکڑ سے بھی زیادہ ہو گیا تفصیل کے لئے ایضاً ص121-122۔

8- 1917ء تک تقریباً 15 ملین ایکڑ رقبے کو آبپاشی کی سہولت میسر آ گئی تھی جس میں سے تقریباً 10 ملین ایکڑ نہری پانی سے سیراب ہونے لگے تھے تفصیل کے لئے دیکھئے کیلورٹ ص121-122۔

9- 20-1919ء تک زرعی اجناس کی برآمد بڑھ کر 41 ملین تک جا پہنچی جس کی قیمت 440

ملین روپے تھی تب ریلوے لائن میں بھی وسعت آ گئی تھی اور وہ بڑھ کر 4,000 میل تک جا پہنچی تھی۔ایضاً ص 107۔صوبہ بھر میں بہت ہی کم مقامات ایسے تھے جو کہ ریلوے لائن سے 25 میل سے زائد فاصلے پر تھے۔ایضاً ص 109۔

10- ایضاً ص 35۔

11- ایضاً ص 34` 137` 157-156 اور 81-280۔علاوہ ازیں رچرڈ جی فاکس۔لائنز آف دی پنجاب: کلچر ان دی میکنگ (برکلے، 1985ء)۔ص 52-62۔

12- کیلورٹ۔ص 215۔

13- 1900-01ء میں ایک ایکڑ اراضی کی قیمت 77 روپے تھی جبکہ 1910-11ء میں 124 روپے، 1920-21ء میں 345 روپے اور 1930-31ء میں 420 روپے تھی۔کیلورٹ ص 219۔

14- جی بیریئر۔دی پنجاب ایلینیشن آف لینڈ ایکٹ آف 1900ء (ڈیوک یونیورسٹی پریس) ص 103۔

15- بینکروں اور ساہوکاروں کی 1868ء میں تعداد 54,000 تھی جو 1911ء میں بڑھ کر 194,000 ہو گئی۔ اِن میں وہ زراعت پیشہ افراد بھی تھے جو سود پر قرضہ دیتے تھے البتہ اپنے آپ کو ساہوکار نہ کہلواتے تھے۔تفصیل کے لئے کیلورٹ، ص 254۔میلکم ڈالنگ، دی پنجاب پیزنٹ اِن پراسپیریٹی اینڈ ڈیٹ (دہلی، 1977ء، طبع اول، 1925ء)، ص۔173۔اگرچہ ساہوکار برطانوی عہد سے قبل بھی وجود رکھتے تھے اور بلند شرح سود پر قرضہ دیا کرتے تھے لیکن ریاست نے ان پر حدود عائد کر رکھی تھیں لہٰذا وہ کاشتکاروں کی زمین اپنے نام منتقل کروانے کے مجاز ہرگز نہ تھے۔نوآبادیاتی عہد میں قانون اور لیگل سسٹم نے ساہوکاروں کی مدد و معاونت کی نہ کہ کاشتکاروں کی۔یہی وجہ تھی کہ یہ مسئلہ پیدا ہوا۔
کیلورٹ نے مالیے کی وصولی میں ریاست کی طرف سے بے لچک پالیسی اور نئے لیگل سسٹم کو زیر باری کی بڑی وجوہات قرار دیا ہے۔علاوہ ازیں کریڈٹ میں اضافہ، قحط اور مویشیوں کی بڑے پیمانے پر اموات بھی زیر باری کی بڑی وجوہات تھیں۔کیلورٹ ص۔60-259۔

16- آئن ٹالبوٹ۔ پنجاب اینڈ دی راج (نئی دہلی۔ 1988ء): ص78-77 اور کے سی یادیو۔ الیکشنز اِن دی پنجاب (نئی دہلی، 1987ء، طبع مکرر)۔
17- عظیم حسین۔ فضل حسین، اے پولیٹیکل بائیوگرافی (لانگ مینز۔ گرین اینڈ کمپنی لمیٹڈ، انڈیا 1946ء) ص۔5۔
18- ایضاً۔ ص۔5-2۔
19- سید نور احمد۔ فضل حسین (لاہور 1944ء) ص۔
20- ایضاً۔ ص۔
21- بٹالوی۔ ص۔121-120۔
22- بحوالہ زاہد چوہدری۔ ص۔114۔
23- ایضاً۔ ص۔97-96۔
24- بٹالوی۔ ص۔118-117۔
25- ایضاً۔ ص۔137۔
26- جب میڈیکل کالج کے پرنسپل کرنل سدرلینڈ نے 40 فیصد مسلمان طلباء کو اپنے ہاں داخل کرنے میں تامل کا اظہار کیا اور کہا کہ وہ اس پالیسی کو صحیح نہیں سمجھتے تو فضل حسین نے فوراً انہیں اپنے عہدے سے مستعفی ہونے پر مجبور کر دیا۔ اسی طرح ایک دفعہ انہوں نے گوجرانوالہ میں دربار منعقد کرنے کا فیصلہ کیا اور لاہور کے کمشنر ایف۔ ڈبلیو کینوے کو دربار میں حاضر ہونے کا حکم دیا لیکن اُس نے دربار میں حاضری اپنی شان کے خلاف سمجھی چنانچہ فضل حسین نے اُس نے فوراً استعفیٰ طلب کر لیا اور اُسے ملازمت سے سبکدوش ہونا پڑا۔ دیکھئے بٹالوی ص136-135۔
27- ایضاً۔ ص۔138۔
28- زاہد چوہدری۔ ص۔117۔
29- ایضاً۔ ص۔119-118۔
30- ایضاً۔ ص۔134۔
31- ایضاً۔ ص۔135۔

32- سکندر حیات کی جانب سے نواب مظفر خان چپکے چپکے ہارپر نیلسن کے پاس جا کر پوچھتے تھے کہ فضل حسین کی زندگی کے کتنے دن باقی ہیں۔ ہارپر نیلسن نے ایک ذمہ دار معالج کی حیثیت سے نواب مظفر خان کو تو کچھ بتانے سے انکار کر دیا لیکن انہوں نے فضل حسین کو اس بات سے فوراً آگاہ کر دیا کہ ان کے حریف اب ان کی زندگی کی گھڑیاں شمار کر رہے ہیں۔
عظیم حسین۔ص۔347-354۔

33- ایضاً۔انٹروڈکشن۔ص۔XI-X۔

محکومی کی سیاست کا شکار: مغربی پنجاب کا ایک گاؤں

حمزہ علوی/طاہر کامران

ایک ایسا سیاسی نظام جس کا بہت زیادہ انحصار "دیہی سیاست" پر ہو اسے سمجھنے کے لئے گاؤں کی سطح پر صورت پذیر ہونے والی سیاست کا ادراک اشد ضروری ہے۔ نہ صرف یہ بلکہ قومی سطح کی سیاست کو بھی اسی تناظر میں سمجھا جا سکتا ہے۔ پاکستان میں بھی ہندوستان کی طرح، گاؤں کی سیاست دھڑوں (Factions) میں بٹی ہوئی ہے۔ لیکن گاؤں میں ایک سیاسی دھڑے کا سربراہ کس طرح مختلف عناصر کی حمایت حاصل کرتا ہے؟ اور اس حمایت کے حصول کے لئے وہ کونسے مخصوص ہتھکنڈے اختیار کرتا ہے؟ اور کیا دیہات میں بسنے والے غریبوں کو جو کہ کسی بھی دھڑے میں سب سے زیادہ نمائندگی رکھتے ہیں اپنی منشاء کے مطابق فیصلہ کرنے کا کوئی اختیار حاصل ہے؟ ذیل میں دیئے گئے تجزیے میں مغربی پنجاب کے ایک گاؤں میں جنم لینے والے ایسے ہی تضادات کی نشاندہی کی گئی ہے جو کہ عموماً اقتصادی محکومی کا نتیجہ ہوتے ہیں۔

گاؤں: بحیثیت سیاسی اکائی

اس مقالے میں مغربی پنجاب کے دیہی علاقے میں گاؤں کی سطح پر تشکیل پانے والے سیاسی عمل کا جائزہ لیا گیا ہے۔ گاؤں کی سطح کی سیاست کو زیر بحث لانے کا میرا مقصد گاؤں کی سیاست کے دوسری سطحوں پر ہونے والی سیاسی سرگرمیوں کے ساتھ تعلق کو اجاگر کرنا ہے۔ کیونکہ گاؤں کو سیاسی لحاظ سے مرکزی سیاسی دھارے سے مطلقاً علیحدہ حیثیت نہیں دی جا سکتی۔ وہ حد جہاں "گاؤں" کا دوسری دنیا سے سامنا ہوتا ہے وہ غیر معمولی اہمیت کی حامل ہوتی ہے، جہاں ایک دیہاتی (فرد) کا قوم سے بحیثیت مجموعی تعلق پیدا ہوتا ہے اور اس تعلق

کی حدود کا تعین بھی ہوتا ہے۔

کچھ حد تک تو بلند سطح کی طرز سیاست گاؤں کی سیاست سے ضرور متاثر ہوتی ہے۔ اس کی وجہ یہی ہے کہ جو کوئی بھی گاؤں کی سیاست سے ابھر کر بلند تر درجے کی سیاست میں سرگرم ہوتا ہے تو اس کی آزاد روی اور خودمختاری پر یہاں (گاؤں) کے سیاسی عناصر تھوڑی بہت بندش کا باعث ضرور ہوتے ہیں۔ لیکن آجکل تو سیاست کے مرد میدان گاؤں کی سیاست کو کچھ زیادہ خاطر میں نہیں لاتے نہ ہی اس کی روشنی میں اپنی پالیسی یا ترجیحات مرتب کرنا ضروری خیال کرتے ہیں۔ اگرچہ یہ حقیقت ابھی تک اپنی جگہ موجود ہے کہ کسی بھی دیہی سیاست دان کے لئے سیاسی قوت کا منبع گاؤں کی سیاست ہی ہوتی ہے۔ یوں بھی محسوس ہوتا ہے کہ جیسے پنجاب کے دیہات سے ابھر کر بلند تر درجوں کی سیاست کرنے والے حضرات ذاتی مالی یا نظریاتی مفادات کے پیش نظر اپنے آپ کو ایسے افراد (سیاسی تنظیموں یا ایسی پالیسیوں) سے وابستہ کر لیتے ہیں جن سے نہ تو گاؤں میں ان کے حامی افراد کا کوئی تعلق ہوتا ہے، جو انہیں اس سطح پر ضروری سیاسی سپورٹ مہیا کرتے ہیں اور نہ یہ وابستگیاں دیہات کے عام باسیوں کے مفادات کی تکمیل میں معاون ہو سکتی ہیں۔ دیہی سیاستدانوں کی اس حد تک آزادی و خود مختاری کے بارے میں کسی بھی قسم کا مفروضہ یا اس کی وضاحت اس وقت تک ممکن نہیں ہو سکتی جب تک گاؤں کی سیاست کو صحیح طرح سے سمجھ نہ لیا جائے۔

گاؤں کا سماجی ڈھانچہ اپنے اندر بہت سے ذیلی ڈھانچے سموئے ہوئے ہوتا ہے۔ ان ذیلی ڈھانچوں میں کچھ ایسے بھی ہیں جو سیاسی اتھارٹی، طاقت اور اثر و رسوخ کا سرچشمہ ہوتے ہیں (اور اگر پارلیمانی آئین لاگو ہو) تو ان ذیلی ڈھانچوں کی مدد سے ووٹ حاصل کرنے میں غیر معمولی مدد مل سکتی ہے۔ ذیل میں باہمی تعلقات کی تین اقسام بیان کی گئی ہیں جو کہ سماجی و سیاسی تعامل کے لئے فریم ورک مہیا کرتی ہیں۔

1_ ذات برادری پر مبنی تعلقات جو کہ پنجاب کا روایتی دستور ہے۔

2_ معاشی ڈھانچے میں مضمر باہمی ذاتی تعلقات

3_ حکومتی اور انتظامی ڈھانچے، خاص طور پر پولیس اور ضلعی انتظامیہ جس نے دیہی معاشرے کو مکمل طور پر اپنی لپیٹ میں لے رکھا ہے۔ ان سے اچھے تعلقات کا قیام غیر معمولی طاقت اور رسوخ کے حصول کا موثر ترین وسیلہ ہوتا ہے۔

پنجاب کے دیہی معاشرے کے ایک نمایاں پہلو کا تعلق اوپر دیئے گئے ذیلی ڈھانچوں میں

سے نمبر 3 سے ہے۔ یعنی پنجاب کے دیہات میں رسہ گیروں یا ڈاکوؤں کے گروہی سرداروں کا وجود! جو کہ ایسے جرائم پیشہ عناصر کو قیادت فراہم کرتے ہیں جو چوری (خاص طور پر مویشیوں کی چوری) اور عورتوں کے اغواء جیسے گھناؤنے جرائم میں ملوث ہوتے ہیں۔ دیہات میں ایسے ہی لوگوں کا غلبہ ان کے لئے نہ صرف سیاسی طاقت بلکہ معاشی فوائد کا ذریعہ ہوتا ہے۔

تذبذب اور فیصلہ (Choices & Dilemmas)

سیاسی جماعتیں جو کہ دیہی معاشرے میں موجود کسی نہ کسی دھڑے سے تعلق قائم کر لیتی ہیں اور دوسرے دھڑوں کی مخالفت میں اپنے مفادات کو تشکیل دیتی ہیں۔ یہ سیاسی جماعتیں گاؤں کی سطح پر سرگرم عمل نہیں ہوتیں گاؤں کی سطح کی سیاست مشترکہ مفادات کے حامل منظم گروہوں کے بجائے عمومی طور پر دھڑوں (Factions) کی بنیاد پر کی جاتی ہے۔ ہندوستان کے دیہات میں دھڑے بازی پر مبنی سیاست کے جو تجزیے کئے گئے ان میں سیاسی رہنماء اور اس کے مقلدین کے مابین دو طرفہ تعلقات (Transactional relationship) میں پائے جانے والے تنوع (diversity) پر بہت زور دیا گیا ہے۔ یہ دلیل دی گئی ہے کہ اگر سیاسی لیڈر اپنے مقلدین کو ہر ممکن طریقے سے اپنی حمایت کے لئے قائل کر لے تو وہ لیڈر اپنے لئے سیاسی حامیوں کی بڑی تعداد پیدا کرنے میں کامیاب ہو جاتا ہے اگر ہم اپنی توجہ دھڑے کے لیڈر سے (جس کے لئے یہ سوچنا ایک غیر اہم مشق ہو گی کہ وہ کن بنیادوں پر افراد کو اپنی حمایت پر آمادہ کرتا ہے) ہٹا کر مقلد (follower) پر مرکوز کریں تو یوں محسوس ہو گا جیسے سوال کی نوعیت ہی بدل گئی ہے' کیونکہ ممکن ہے کہ مقلد باہمی مخالف دھڑوں کے لیڈروں سے مختلف نوعیت کی وابستگیاں رکھتے ہوں اور اس کی تمام وابستگیوں کا مرکز ایک ہی دھڑے کا لیڈر نہ ہو چنانچہ مقلد کو ان پیچیدہ حالات میں فیصلہ کرنا پڑتا ہے۔ فیصلہ کرنے کا یہ عمل گاؤں کے معاشرتی ڈھانچے میں اسے درپیش پابندیوں اور مجبوریوں کی بنا پر بہت کٹھن ہو جاتا ہے۔ چونکہ وہ ہمہ وقت کئی ذیلی ڈھانچوں کے تحت زندگی بسر کر رہا ہوتا ہے اور ہر ذیلی ڈھانچے میں اس کا سماجی کردار مختلف ہوتا ہے بلکہ بعض اوقات تو مختلف ڈھانچوں میں ایک فرد کے کردار ایک دوسرے سے متضاد ہو جاتے ہیں۔ یہ صورتحال ایک طرف تو مقلد کے لئے تذبذب اور کنفیوژن کو جنم دیتی

ہے اور دوسری طرف نئے امکانات کو بھی وجود میں لاتی ہے۔ محض ایک ہی ذیلی ڈھانچے میں مقلد کے مخصوص کردار کو سامنے رکھتے ہوئے اس کے سیاسی رویے کا کلی طور پر تعین نہیں کیا جا سکتا چونکہ بیک وقت وہ کئی ذیلی ڈھانچوں میں رہ رہا ہوتا ہے اور ہر ذیلی ڈھانچے میں اس کا کردار بہت مختلف ہوتا ہے۔ ان ذیلی ڈھانچوں کا باریک بینی سے مطالعہ اس لئے ضروری ہے کیونکہ یہ مقلدین کو حاصل سیاسی امکانات (Choices) کے مجموعی خاکے کو واضح کرتے ہیں۔ بعض مقلدین کی طرف سے کئے جانے والے فیصلے ہی ذیلی ڈھانچے میں تبدیلی کا باعث بن جاتے ہیں۔

وسیع تر معاشرتی ڈھانچے میں سیاسی رویوں کی تشکیل میں روایتی سماجی اداروں (Tradional social institutions) کے کردار کا گہرائی کے ساتھ احاطہ کرنے کے لئے لازم ہے کہ سوشل انتھروپالوجی پر زیادہ انحصار کیا جائے۔ کچھ ماہرین سیاسیات کا خیال ہے کہ سوشل انتھروپالوجی کو استعمال میں لا کر مقامی قومیتوں (local communities) کے تعامل (Social interaction) سے جنم لینے والی صورتحال کی تفہیم میں تو مدد ملتی ہے لیکن قومی سیاست کی ترقی کو سمجھنے اور اس کا تجزیہ کرنے کے لئے انتھروپالوجی کے فراہم کردہ پس منظر کی افادیت پر یہ ماہرین سیاسیات شکوک و شبہات کا شکار ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ سوشل انتھرو پالوجی کے ماہر مقامی قومیت کو وسیع تر سیاق و سباق سے الگ تھلگ کر کے اس کا مطالعہ کرتے ہیں لہٰذا وہ "فرد اور قوم کے درمیان سیاسی رشتے کو اجاگر کرنے میں ناکام رہتے ہیں۔" (1) اس قسم کی تنقید ماضی کے حوالے سے تو جائز تصور کی جا سکتی ہے مگر عہد حاضر میں علم الانسان کے ماہرین گاؤں کی سرحدوں کو عبور کر کے بڑی دنیا میں داخل ہو چکے ہیں۔

اب سیاست کے ماہرین کو گاؤں کی سرحدوں کو الٹی سمت سے عبور کرنا ہو گا اور اگر ایک مرتبہ اس سرحد کو عبور کر کے گاؤں کی حدود میں داخل ہو جائیں تو (علم الانسان کے ماہرین اور ان کے "قومیت" سے متعلق نظریے کے بغیر) ماہرین سیاسیات کے لئے "گورنمنٹ" کے حوالے سے سیاسی نظام و عمل کا تجزیہ کرنا ممکن نہ ہو گا کیونکہ گاؤں میں افراد کا سیاسی کردار آزادانہ حیثیت کھو چکا ہے اور قومیت کی سطح پر افراد بیک وقت کئی کردار ادا کر رہے ہوتے ہیں۔ یہ کردار ایک دوسرے سے بری طرح الجھے ہوئے ہوتے ہیں چنانچہ گاؤں میں کسی بھی فرد کے سیاسی کردار کو ان دوسرے کرداروں سے جدا نہیں کیا جا سکتا جو اسے اس معاشرت میں رہتے ہوئے ادا کرنے پڑتے ہیں۔

اس موقع پر یہ جاننا بہت مفید ہو گا کہ آیا پاکستان (خصوصاً مغربی پنجاب) میں دیہی قومیتیں ایسے مخصوص اوصاف رکھتی ہیں جو انہیں جنوبی ایشیا کی دیگر دیہی قومیتوں سے ممتاز کر سکیں یا کیا اس پنجاب کی دیہی قومیتیں ایسی مماثلتوں کی حامل ہیں جو کہ گاؤں پر مبنی طریق سیاست کا واحد جامع نمونہ وضع کرنے میں ممد و معاون ہو۔ بظاہر تو یہی دکھائی دیتا ہے کہ تمام جنوبی ایشیا کی دیہی قومیتوں کا سیاسی طریق بالکل ایک ہی جیسا ہے البتہ ہندوستان کے مقابلے میں کہ جہاں گاؤں کی معاشرتی تنظیم اور طریق سیاست کے بارے میں بہت زیادہ تحقیقی کام ہوا پاکستان میں دیہی قومیتوں سے متعلق کوئی بھی نظریہ ابھی قائم نہیں کیا جا سکتا۔ اس کی وجہ یہی ہے کہ اس مسئلے پر یہاں تحقیقی کام بالکل نہیں ہوا۔ چنانچہ ہم حتمی طور پر یہ نہیں کہہ سکتے کہ پاکستانی گاؤں میں سیاست کا طریق وہی ہے جو کہ جنوبی ایشیا کے دیگر دیہی علاقوں میں رائج ہے یا کہ یہاں معاملہ اس سے قطعی مختلف ہے۔

دائرہ تغیر (An Area of Change)

ذیل میں دیئے گئے تجزیے میں مغربی پنجاب کے کینال کالونی ڈسٹرکٹس پر توجہ مرکوز کی گئی ہے کیونکہ فیلڈ ورک انہی اضلاع سے متعلق ہے۔ (2)

پنجاب میں کینال کالونیوں والے اضلاع جو کہ زیادہ تر موجودہ صدی کے دوران آبپاشی کے ایک جامع نظام کی تشکیل کے بعد بسائے گئے۔ انہیں صوبے کے پرانے اضلاع سے ممیز کیا جا سکتا ہے۔ پرانی زرعی قومیتیں لاہور سے شمال مغرب کو راولپنڈی کی جانب آباد ہیں کہ جہاں بارش کافی ہوتی ہے۔ نظام آبپاشی کے قیام سے قبل کینال کالونیوں والے اضلاع (جو کہ آج کے پنجاب کے متمول ترین اضلاع ہیں) بنجر اور بے آب و گیاہ تھے۔ کینال کالونی کے علاقے میں اوسط ملکیت اراضی نسبتاً زیادہ ہے جبکہ پرانی زرعی اقوام جو کہ کثرت آبادی کا شکار ہیں ان کے ہاں ملکیت اراضی کا تناسب بہت کم ہے۔ 1968ء میں پورے مغربی پاکستان میں موجود کل پرائیویٹ ٹریکٹروں کا 60 فیصد پنجاب کے کینال کالونی کے اضلاع کے زمینداروں کی ملکیت تھا۔ یہاں مشینی کاشتکاری کے نتیجے میں زرعی ملکیت کے سائز میں مزید اضافہ ہوا جس کی وجہ سے سماجی و سیاسی رشتوں میں نمایاں تبدیلی رونما ہوئی۔

کینال کالونیوں پر مبنی اضلاع عرصہ دراز سے قائم پرانے اضلاع سے اس طرح بھی مختلف تھے کہ وہاں پنجاب کے ہر طبقے اور ذات کے لوگ رہائش پذیر تھے۔ کینال کالونیوں

کے پرانے باسیوں کا مویشی پالنا اور گلہ بانی ذریعہ معاش تھا خاص طور پر بھینسیں پالنا انہیں خصوصی طور پر مرغوب تھا۔ علاوہ ازیں ان علاقوں کے مقامی باشندوں پر مویشی چوری کرنے کا الزام لگایا جاتا ہے جو بہت حد تک صحیح بھی ہے۔ کینال کالونیوں کے مقامی قبائل کے سربراہ ہی پنجاب کے سب سے بڑے زمیندار ہیں جو کہ انگریز سرکار کے ڈویژنل اور صوبائی سطح کے درباریوں کے طور پر سیاست میں نمایاں کردار ادا کرتے رہے بعدازاں یہی لوگ وزیر اور صوبائی اسمبلی کے ممبران بنے۔

ان علاقوں میں نوواردوں کو آبادکار کہا جاتا تھا جبکہ ہندوستان سے ہجرت کر کے وہاں آن بسنے والوں کو مہاجر کا نام دے دیا۔ آباد کاروں اور مہاجروں کا پس منظر بہت حد تک ایک جیسا ہے البتہ آباد کاروں کی بڑی اکثریت مغربی پنجاب کے شمالی اضلاع میں سکونت رکھتی ہے جبکہ مہاجر ہندوستان کے مشرقی پنجاب سے آکر کالونی کے اضلاع میں آباد ہوئے ہیں۔ آباد کاروں اور مہاجروں کے باہمی اور مقامی لوگوں سے تعلقات غیر واضح نوعیت کے ہیں۔ آبادکار اور مہاجر دونوں ترقی پسند اور بہتر نوع کے کاشتکار ہیں جن کی روایات و رسومات بہت مماثلت رکھتی ہیں لیکن جب مہاجر ہندوستان سے آکر یہاں آباد ہوئے تو تضاد نے جنم لیا جس کے نتیجے میں مقامی اور آبادکار باشندوں نے مہاجروں کے خلاف باہمی اتحاد کر لیا۔ یہی تضادات بعد میں موجودہ گروہی وفاداریوں کی صورت میں ظہور پذیر ہوئے۔

یہ اس آبادی کو تشکیل دیتے ہیں جو کہ ان تین ذیلی ڈھانچوں ہی کے اندر سرگرم عمل رہتے ہیں جن سے اس مقالے کا تعلق ہے۔

ذیلی ڈھانچے

ذات اور برادری

پاکستان کے سماجی ڈھانچے کی "روایت" میں ہندوستان کے بالکل برعکس ذات کی بجائے "برادری" کا بہت زیادہ عمل دخل ہے۔ (یہاں پر "روایت" سے یہ مراد ہرگز نہیں کہ پنجاب کا سماجی ڈھانچہ جمود کا شکار ہے)۔ پاکستان کے شہری دانشور کا نظریہ تو "ذات" کے وجود کو تسلیم ہی نہیں کرتا۔ جبکہ دوسری انتہا ابیٹسن (Ibbetson) کے اس فیصلے میں نظر آتی ہے جس کے مطابق ہندو اور مسلم ذات میں کوئی فرق نہیں یا اس کا یہ کہنا کہ مسلمانوں میں

اسلام کی وجہ سے "ذات" کی اہمیت میں کوئی غیر معمولی کمی نہیں آئی۔ (3) لیکن میرے نقطہ نظر کے لئے بہتر طریقہ کار یہ ہو گا کہ دیکھا جائے کہ کیا ذات یا اس کی کوئی تبدیل شدہ شکل سماجی عنصر کے طور پر پاکستان میں وجود رکھتی ہے؟ اور اگر ایسا ہے تو اس کا سماجی تعامل (Social interaction) کے طریق کار پر کیا اثر ہوتا ہے۔ پنجاب کے دیہات میں ایسے لوگ کثرت سے مل جائیں گے جن کے ناموں کے آخر میں وہی ذات دکھائی دے گی جس کا استعمال ہندو بھی اپنے ناموں کے آخر میں کرتے ہیں۔ پاکستان میں "ذات" اور ہندوستان میں "جاتی" ہم معنی ہیں۔ لیکن بعض ایسے طبقات جن کا ذکر مردم شماری میں تو موجود ہے۔ ضروری نہیں کہ وہ عملاً اب تک معاشرے میں کوئی موثر حیثیت بھی رکھتے ہوں۔

پنجاب میں ذات اور اس کی بنا پر جنم لینے والے مراتب کے کچھ نہ کچھ آثار ضرور دکھائی دیتے ہیں۔ سید، شیخ، مغل اور پٹھان "اشراف" ذاتیں تصور کی جاتی ہیں لیکن پنجاب میں "اشراف" کی اصطلاح رائج نہیں ہے۔ ایسے گاؤں جو میرے زیر مطالعہ رہے ہیں ان میں سے ایک میں ایسے افراد کا گروہ تھا جو کہ ذات کے اعتبار سے مغل کہلاتے تھے جو نہ تو خود کو اشراف گردانتے تھے اور نہ ہی ان کے معمولی حیثیت والے ہمسایوں کے مقابلے میں انہیں ذات کے اعتبار سے زیادہ عزت و توقیر دی جاتی تھی۔

پنجاب میں آباد اشراف کے درجے سے نیچے کی ذاتوں سے متعلق لکھی گئی تحریروں اور روزمرہ کے حقائق سے ان کے سماجی مرتبے کی پوری طرح وضاحت نہیں ہوتی۔ اس ابہام کو (جو پنجاب میں ذاتوں کے مراتب کے حوالے سے پایا جاتا ہے) ہندوؤں کی درمیانی ذاتوں میں پائے جانے والے مراتب کے گنجلک پن سے گڈ مڈ نہیں کرنا چاہئے۔ کیونکہ اس ضمن میں اصول مراتب پر بات کرنا مقصود نہیں۔ اس حوالے سے مراتب کے بارے میں پائے جانے والے ابہام کو (Sanskritisation) کے عمل سے جدا نہیں کیا جا سکتا جس کی وجہ سے مرتبے میں تبدیلی رونما ہوتی ہے اور اس کا اظہار بھی ہوتا ہے۔ اس سے ملتا جلتا کوئی بھی عمل مسلمانوں میں موجود نہیں۔

واحد عمل جو کہ مسلمان زمینداروں کے معاشرتی رتبے میں بلندی کا بہت حد تک باعث بنتا ہے وہ عورتوں کو پردے کا پابند بنا دینا اور انہیں اقتصادی و معاشرتی سرگرمیوں سے الگ تھلگ رکھنا ہے۔ یہ عمل امیر طبقے ہی کا استحقاق ہے جو ان کے بلند طبقاتی مرتبے کی نشاندہی کرتا ہے کیونکہ ایسا کرنے کی اسے اقتصادی قیمت ادا کرنا پڑتی ہے وہ اس طرح کہ پردہ

کی رسم کو اپنانے سے عورتیں کسی بھی معاشی سرگرمی میں حصہ نہیں لے سکتیں۔ علاوہ ازیں باپردہ خواتین نہ تو اپنے خاوند کے لئے کھیتوں پر کھانا لے جا سکتی ہیں نہ ہی پالتو جانوروں کی دیکھ بھال کر سکتی ہیں اور نہ ہی کھیتوں پر جا کر کپاس کی چنائی میں حصہ لے سکتی ہیں۔ (کپاس چننے کا عمل صرف اور صرف خواتین کے لئے مخصوص ہوتا ہے)۔ یہ دولتمندی اور اعلیٰ طبقے سے تعلق کی نشانی ہوتی ہے نہ کہ اونچی ذات کی!

جہاں تک چھوت چھات کا تعلق ہے تو ناپاک کام یا پیشے کا تصور تو پنجاب کے دیہی علاقے میں پایا جاتا ہے لیکن ناپاک ذات کا یہاں کوئی وجود نہیں۔ وہ گاؤں جو میرے مشاہدے میں آئے وہاں "مصلی" ذات کے بہت سے ارکان بستے تھے جو عموماً کمی تصور کئے جاتے ہیں لیکن یہ باعث حیرت تھا کہ وہ تمام کے تمام پاک اور معزز پیشوں سے منسلک تھے۔ مزید برآں ان پر اچھوتوں والی کسی بھی قسم کی قدغنیں لاگو نہ تھیں گو کہ یہ کہا جاتا تھا کہ خاکروبوں کا پیشہ ناپاک ہی تصور ہو گا لیکن یہ بات حقیقت پر مبنی اس لئے نہ تھی کیونکہ خاکروبوں پر مبنی کوئی مخصوص پیشہ وجود نہ رکھتا تھا۔ لہٰذا چھوت چھات کی رسم بھی ناپید تھی۔ عام رواج جو دیہی پنجاب میں پایا جاتا ہے کہ ہر ایک اپنے صحن کی صفائی کر لیتا ہے۔ جانوروں کا گوبر اور دوسری گندگی کو صاف کرنے سے کسی کا مرتبہ کم نہیں ہوتا ہے۔

نسب کا مفہوم

ہندو اور مسلم سماج میں رائج مختلف معاشرتی رویوں کی تشکیل میں برادری کے قواعد کو بہت اہمیت حاصل ہے۔ برادری کی تشکیل میں اینڈو گیمی (endogamy) (یعنی اپنے قریبی رشتہ داروں ہی میں شادی کرنا) اور ایگزو گیمی (exogamy) (یعنی قریبی رشتہ داروں سے شادی کرنے سے اجتناب برتنا) کلیدی کردار ادا کرتے ہیں۔ پنجاب کے مسلمانوں میں برادری در ازدواجی وحدت (endogamous unit) ہے جس کو ہم نسبی بھی کہا جا سکتا ہے۔ اس کے بالکل برعکس ہندو معاشرت میں برادری کی بجائے گوت (sub_cast) اہم ہوتی ہے اور اس میں نسب (Lineage) بر زواجی (exogamous unit) وحدت ہوتا ہے۔ (5) مسلمانوں میں بیرون ازدواجیت ایگزو گیمی (exogamy) (یعنی قریبی رشتہ داروں سے شادی نہ کرنے کا رواج جو عام طور پر وسط ہند کے ہندوؤں میں پایا جاتا ہے) کے اصول صرف بہت ہی قریبی رشتہ داروں سے شادی ممنوع قرار دیتے ہیں۔ ہندو معاشرت میں "گوت" (Sub caste)

کے سلسلہ میں حد بندی کی صحیح وضاحت لازم ہوتی ہے تاکہ گوت کے دائرے میں ہی ان حدود کا تعین کیا جا سکے جن کے اندر رہ کر شادی بیاہ کیا جا سکتا ہو۔ جبکہ پنجاب کے مسلم معاشرے میں نسب (والد کے رشتے داروں) کی صریحاً وضاحت کی ضرورت ہوتی ہے۔ ان کے نزدیک گوت (sub_caste) کی وضاحت کچھ زیادہ اہمیت کی حامل نہیں۔

اس اصول سے کچھ مستثنیات بھی ہیں جیسے کہ رانگڑ راجپوت جن کا تعلق عام طور پر ہندوستانی پنجاب میں واقع انبالہ ڈویژن سے ہوتا ہے۔ ان کے ہاں در ازدواجیت کی حد (endogamous boundary) ان کی گوت (sub_caste) ہی ہوتی ہے یعنی وہ اپنی گوت میں کہیں بھی شادی کرنا جائز تصور کرتے ہیں۔ رانگڑ راجپوتوں میں قومیتی یگانگت و یکجہتی بھی (Caste solidarity) غیر معمولی طور پر پختہ اور راسخ ہوتی ہے' اس خطے کی اکثریتی آبادی کے لئے "ذات" (Caste) بہت زیادہ اہم نہیں ہوتی۔

شادی کے اصول

برادری ہی میں شادی یا یوں کہنا زیادہ بہتر ہو گا کہ باپ کے بھائی (چچا) کی بیٹی سے شادی کو ترجیح دینا پنجاب کی مسلم معاشرت کا اہم ترین اصول ہے۔ زیادہ تر شادیاں ایک ہی گاؤں میں اور برادری کے اندر ہی طے پا جاتی ہیں جس کی بدولت رشتہ داریوں کا نظام اندرونی طور پر زیادہ پیچیدہ ہو گیا ہے۔ پنجابی مسلمانوں کے بالکل برعکس ہندو معاشرے میں بیرون ازدواجیت (ایگزو گیمی_ برادری سے باہر شادی کرنے کا رجحان) کے اصول گو کہ اسی قدر پیچیدہ ہیں جن کے تحت رشتہ داروں کے وسیع حلقے میں شادی کے امتناع کا موجب بنتے ہیں۔ ہندو معاشرے میں جغرافیائی لحاظ سے بھی شادیوں کے ذریعے رشتہ داری کا وسیع نیٹ ورک (جال) پھیلا دینے کا رجحان پایا جاتا ہے۔ اس معاشرے میں رشتہ داری کا نظام جغرافیائی طور پر خاصا پھیلاؤ اختیار کئے ہوئے ہے۔ کیونکہ ایک ہی گاؤں میں شادی کرنے سے احتراز کیا جاتا ہے۔ مزید برآں ایسے گاؤں میں بھی عموماً شادی کے ذریعے رشتہ داری نہیں کی جاتی جو بہت ہی قریب میں واقع ہو۔

پنجاب میں پدری جانب سے دور و نزدیک کے تمام رشتہ داروں سے باہمی شادی بیاہ کا تعلق برقرار نہیں رکھا جاتا بلکہ برادری کے ایک مخصوص حصے سے یہ تعلق قائم کیا جاتا ہے۔ اس خطے میں ایسا نظام موجود ہے جو کہ اس مخصوص حصے کی واضح طور پر نشاندہی کرتا ہے ہم

چاہیں تو اسے "برادری کا باہم اشتراک رکھنے والا حصہ" (Participating lineage) کہہ سکتے ہیں۔ (7) وسطی ہند میں "گوت" سے قطعی مختلف یہ amorphous body ہے۔ اس کی رکنیت گاؤں کی سطح پر بہت ہی واضح ہر کسی ابہام سے بالاتر اور متعاون رشتہ داریوں پر مبنی ہوتی ہے۔

وہ وسیع نظام جو کہ "برادری کے باہم اشتراک رکھنے والے حصے" (Participating lineage) کی حدود کا تعین کرتا ہے اور تعلقات میں کسی قسم کا مسئلہ پیدا ہو جانے کی صورت میں برادری کے اس حصے کا دوبارہ سے تعین کرتا ہے وہ دو ملتے جلتے طریقہ ہائے کار پر مشتمل ہوتا ہے۔

1۔ مختلف تقریبات پر باہمی لین دین کا وہ نظام جو مساویانہ تو نہیں ہوتا لیکن بہرحال حساب دوستان در دل پر قائم ہوتا ہے۔ تحائف کے لین دین کے اس نظام کو نیوندرا یا ورتن بھانجی کہا جاتا ہے۔

2۔ تقریبات (کہ جہاں تحائف کا تبادلہ ہوتا ہے) کے مواقع پر دعوت ناموں کے بھیجے جانے اور ان کے قبول ہونے یا رد کر دیئے جانے کی باقاعدہ رسومات بھی برادری کے باہم اشتراک رکھنے والے حصے کی وضاحت کے لئے بہت اہم ہوتی ہیں۔

نیوندرا یا ورتن بھانجی (عام طور پر پنجاب کے بیشتر حصے میں اسے ورتن بھانجی کہا جاتا ہے) کی رسومات کے ذریعے تحائف کا تبادلہ ہوتا ہے۔ مزید برآں تحائف کے اس لین دین سے ایک دوسرے سے تعلقات میں پختگی آتی ہے اور باہمی مساوات کی توثیق بھی ہوتی ہے۔ جبکہ موخرالذکر (دعوت ناموں کا بھیجا جانا اور ان کا وصول کیا جانا جسے دیہی پنجاب میں "گنڈھ پانا" (tying a Knot) کہا جاتا ہے) ممکنہ جھگڑوں کی پیش بینی کرتا ہے تاکہ متعلقہ افراد وقت پر ہی ان جھگڑوں کو طے کر لیں یا دوسری صورت میں ہم نسب افراد (ایک ہی مورث کی اولاد) میں شادی غمی میں اشتراک کا تعلق منقطع ہو جانے کا احتمال ہوتا ہے۔

تحائف (نیوندرا) شادی یا رسم ختنہ کے موقع پر دیئے جاتے ہیں جو عموماً نقدی کی صورت میں ہوتے ہیں لین دین کا تمام تر حساب ایک کاپی (بندی) میں درج کر دیا جاتا ہے۔ (8) اس طرح ایک شجرے سے متعلق افراد کے پاس لئے گئے اور دیئے گئے تمام تحائف کی تفصیل محفوظ ہوتی ہے۔ تحفے کو وصول کرنے والا تحفہ دینے والے کا رسمی طور پر ایک طرح سے مقروض ہوتا ہے۔ وہ اپنا فرض سمجھتا ہے کہ آئندہ ایسے ہی کسی موقع پر

نیوندرا اتار دے یعنی ماضی میں وہ رقم جو کسی نے نیوندرا کے طور پر اسے دی تھی اس رقم میں تھوڑا اضافہ کر کے لوٹا دے یاد رہے کہ نیوندرا ہمیشہ خوشی کے موقع پر دیا جاتا ہے (پنجابی لغت میں اس کا مطلب "حصہ ڈالنا" ہے) اس طرح قرض دہندہ اب مقروض بن جاتا ہے۔ کرداروں کا یہ تبادلہ پنجاب کے دیہات میں بہت اہمیت کا حامل ہوتا ہے۔

کرداروں کے اس باقاعدہ تبادلے کے نتیجے میں باہمی رشتوں میں مضبوطی آ جاتی ہے اور سماجی برابری کی بھی توثیق ہو جاتی ہے۔ جب بھی کوئی تنازعہ سر اٹھاتا ہے تو تعلق عموماً نیوندرا وصول کرنے والے کی طرف سے ختم کیا جاتا ہے جو اسی قدر رقم جو اس نے سابق میں وصول کی ہوتی ہے اور جس کا ریکارڈ تحریری صورت میں درج ہوتا ہے کسی تیسرے شخص کے ذریعے لوٹا دیتا ہے یہ تیسرا شخص رسمی طور پر اس کا اعلان کرتا ہے اور اس طرح تعلقات اختتام پذیر ہو جاتے ہیں۔ ایک ہی نسب سے متعلقہ افراد میں جنم لے لینے والا باہمی تعلقات کا یہ بحران بعض اوقات کئی گروہوں کو بیک وقت اپنی لپیٹ میں لے لیتا ہے۔ تعلقات میں آ جانے والے اس تعطل کا رسمی طور پر صریحاً" اظہار کر دیا جاتا ہے۔ بعدازاں اگر فریقین رضامند ہو جائیں تو ان کے تعلقات بحال بھی ہو جاتے ہیں۔

لیڈرشپ کا ظہور

تحائف کے تبادلے کا یہ نظام ہم نسب افراد پر مشتمل وسیع تر سماجی گروہ کے اندر تشکیل پا جانے والے ذیلی گروہ کی حدود کا تعین کرتا ہے یہ ذیلی گروہ باہمی اشتراک عمل پر قائم ہوتا ہے۔ شجرے (نسب) اور اس کی مقامی شاخوں میں یکجہتی کی سطح مختلف ہوتی ہے۔ شجرے کی مقامی شاخیں پنچائیت یا اس سے ملتی جلتی کونسل کے تحت منظم ہوتی ہیں جو کہ تنازعات کو نپٹاتی ہے اور مسائل و معاملات کو طے کرتی ہے۔ پنچائیت کے ارکان نہ تو انتخاب کے ذریعے چنے جاتے ہیں اور نہ ہی انہیں نامزد کیا جاتا ہے۔ دراصل برادری کے معاملات میں بڑھ چڑھ کر دلچسپی اور سنجیدگی سے اسے (برادری کو) درپیش مسائل کو حل کرنے کی کوشش کرتے ہوئے انہیں دوسرے ہم نسب افراد کی طرف سے بغیر اعلان کئے ہوئے تسلیم کر لیا جاتا ہے اس طرح کسی بھی برادری میں وہ لوگ نمایاں ہو جاتے ہیں۔ ضروری نہیں کہ ہم نسب افراد کا رہنماء عمر رسیدہ ہو۔ البتہ اس کا تجربہ کار پختہ عمر کا ہونا ضروری خیال کیا جاتا ہے کہ جس کے پاس برادری کے معاملات طے کرنے کے لئے وقت بھی ہو اور صلاحیت و

ہمت بھی! ان رہنماؤں کا اثر و رسوخ اور اختیار برادری کی ہیت و ساخت کے مطابق بدل جاتا ہے۔ بعض برادریوں کو دوسروں کے نسبت بہت زیادہ سختی سے کنٹرول کیا جاتا ہے۔ چھوٹے اور آزاد زمینداروں پر مشتمل نسبی برادریاں زیادہ متحد ہوتی ہیں۔

نسبی برادریوں کی مقامی شاخ ایک کونسل کے تحت کارپوریٹ گروپ ہیئت اجتماعہ (Corporate) کی شکل میں سرگرم عمل ہوتی ہے۔ اجتماعی حیثیت میں نسبی برادری جو اہم کام سرانجام دیتی ہے اس میں سے ایک سیاسی سرگرمی بھی ہے۔ کوئی بھی گھرانہ سیاسی عمل میں ہم نسب رشتہ داروں پر مبنی برادری کی اتھارٹی سے آزاد نہیں ہوتا۔ لیکن یہ ضروری نہیں ہوتا کہ تمام نسبی برادری ایک ہی انتخابی امیدوار کی حمایت کرے۔ نسبی برادری (اکثر اوقات خفیہ طور پر یا بعض دفعہ اعلانیہ طور پر) سیاسی حمایت کو تقسیم کر دینے کا فیصلہ کر دیتی ہے۔ اگر نسبی برادری کے ارکان اقتصادی طور پر کسی زمیندار کے مطیع ہوں تو نسبی برادری کو مجبوراً" پابند ہونا پڑتا ہے اور اس زمیندار کی حمایت کی جاتی ہے جس کے اس کے ارکان محکوم (اقتصادی طور پر) ہوتے ہیں۔ ان حالات میں پنچائیت کے کسی بھی فیصلے کی پابندی لازمی نہیں ہوتی۔ انتخابی امیدوار اسی لئے ان نسبی برادریوں پر اپنی توجہ مرکوز کرتے ہیں جو آزاد چھوٹے زمیندار مالکان اراضی پر مشتمل ہوتی ہیں۔ ان (آزاد مالکان اراضی پر مشتمل نسبی برادریوں) کو اپنے دائرہ اثر میں لانے کے لئے برادری کی کونسل کے بااثر ارکان سے رابطہ کرتے ہیں اور انتخاب میں ان نسبی برادریوں کے ووٹ حاصل کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ اس طرح ہم نسبی برادریوں کی مقامی شاخیں سیاسی عمل میں شمولیت کے اعتبار سے بہت اہم ہوتی ہیں۔

اقتصادی تعلقات

جہاں تک اقتصادی ڈھانچے کا تعلق ہے تو راقم کے خیال میں کافی ہو گا اگر مختلف معاشرتی عناصر کے اقتصادی کرداروں کے بنیادی اصولوں کا خاکہ بیان کر دیا جائے۔ کیونکہ اقتصادیات اور مختلف طبقات کی طرف سے ادا کئے جانے والے اقتصادی کردار گاؤں کی سطح کی سیاست پر گہرے اثرات مرتب کرتے ہیں اور ان تبدیلیوں پر بھی اثر انداز ہوتے جو کہ وقتاً" فوقتاً" دیہی معاشرے میں رونما ہوتی رہتی ہیں۔

کچھ خاندان جو مغربی پنجاب کی آباد کاری (Colonization) سے قبل مقامی قبائل کے

سربراہ تھے وہ کالونی ڈسٹرکٹس میں سب سے بڑے مالکان اراضی بن گئے جن کی زمینوں کے وسیع قطعات زیادہ تر دریاؤں کے گرد و نواح میں واقع تھے۔ شروع میں زمینی گرانٹ عموماً 50 ایکڑ تک کی ہوتی تھی لیکن آباد کاری کے بعد کے مراحل میں زمین کے بڑے قطعات کو نیلام کیا جاتا تھا یا پھر "زمیندار اشرافیہ" کو حکومت کے لئے خدمات سرانجام دینے کے عوض 500 ایکڑ سے کئی ہزار ایکڑ تک کے زرعی اراضی کے قطعات گرانٹ کی صورت میں انگریز سرکار عطا کرتی تھی۔ اگرچہ 1959ء کی زرعی اصلاحات نے نہری پانی سے سیراب ہونے والی زرعی اراضی کی ملکیت کی زیادہ سے زیادہ حد 500 ایکڑ مقرر کر دی تھی لیکن بہت سے خاندان اب بھی ایسے ہیں جو اس حد سے کئی گنا زیادہ زمین کے مالک ہیں۔

جب 1947ء میں ہندوستان سے مہاجرین پاکستان آئے تو ہندوستان چلے جانے والے مہاجروں کی خالی کردہ زمین کو اس طرح تقسیم کیا گیا کہ ایک خاندان کے جس قدر ارکان تھے اس خاندان کو اتنے ہی ایکڑ الاٹ کر دیئے گئے۔ لیکن 1952ء میں زمین کو دوبارہ سے الاٹ کیا گیا۔ اس دفعہ جو طریقہ کار اپنایا گیا اس کے مطابق جن افراد نے جتنا کلیم داخل کیا (یعنی جتنا انہوں نے ہندوستان میں اپنی ملکیت کا دعویٰ کیا) انہیں اتنی ہی اراضی الاٹ کر دی گئی۔ اس عمل میں کئی تو بالکل ہی بے زمین رہے یا تھوڑی بہت زمین حاصل کر سکے اور کئی افراد وسیع قطعات اراضی کے مالک بن گئے جن کی عام طور پر زیادہ سے زیادہ حد 500 ایکڑ تک تھی۔

روایتی طور پر زمیندار مزارعین (جو کہ بٹائی پر کاشتکاری کرتے ہیں) کو ملازم رکھ لیتے تھے البتہ وہ زمیندار جن کی ملکیت 25 ایکڑ یا اس سے کم تھی وہ خود ہی اپنی زمین کو کاشت کرتے تھے۔ جن افراد کی ملکیت اراضی بہت کم ہوتی تھی اور اس کی پیداوار سے یہ کاشتکار اپنی کفالت نہ کر سکتے تو انہیں مزارعے یا کھیت مزدور کے طور پر بڑے زمیندار کا اقتصادی لحاظ سے مطیع ہونا پڑتا تھا۔ ورلڈ بنک کے 1966ء کے سروے کے مطابق اس علاقے میں 5 ایکڑ اراضی سے کاشتکار بمشکل تمام گذر بسر کر پاتا تھا۔ اس سے کم ملکیت اراضی ہونے کی صورت میں اسے بڑے زمینداروں کا مزارع یا مزدور بننا پڑتا تھا۔ 5 ایکڑ سے کم اراضی کے مالکان یا بالکل بے زمین افراد کی تعداد میں تب بہت زیادہ اضافہ ہوا جب 1952ء کے بعد زمینوں کی دوبارہ سے تقسیم کا آغاز کیا گیا۔ آج کل مزارعین کو بے دخل کرنے کا رواج بہت عام ہو رہا ہے اور ان کے قانونی حقوق (tenancy rights) کا اکثر و بیشتر دفاع نہیں کیا جاتا۔

مزارعوں اور کھیت مزدوروں کی زمین سے بے دخلی کی بڑی وجہ مشینی زرعی آلات اور کرائے پر حاصل کردہ لیبر ہے۔ البتہ بڑے زمیندار مزارعوں کو یکدم بیدخل کرنے سے احتراز کرتے ہیں اس مزروعہ اراضی کے مقابلے میں جو کہ سابق میں مزارعین کے زیر کاشت ہوتی تھی اب ان کے تصرف میں بہت ہی کم رہ گئی تھی۔ اتنی کم کہ اسے کاشت کر کے ان کا گذر بسر نہ ہو سکتا تھا چنانچہ انہیں اپنی آمدنی میں اضافہ کرنے کے لئے مختلف نوعیت کی مزدوری کرنا پڑتی تھی۔ اس طرح زمیندار کے پاس مزدوری کے حصول کا مسلسل وسیلہ موجود رہتا تھا۔ اس مزدوری کی اسے فصل کو کاشت کرتے وقت یا فصل اٹھاتے ہوئے ضرورت پیش آتی تھی چونکہ بٹائی پر کاشت کے لئے مزروعہ زمین میں تسلسل کے ساتھ کمی آتی جا رہی تھی اس لئے بٹائی پر کاشت کرنے والے مزارعینؔ کی شرائط بھی کم ہو گئی تھیں۔ اب ان مزارعین کے تصرف میں جتنی کم زمین ہی کیوں نہ دے دی جاتی وہ اسے کاشت کرنے پر تیار دکھائی دیتے۔ یہی وجہ تھی کہ ان کا زمیندار پر انحصار بہت بڑھ گیا تھا اور ان کی معاشی آزادی مسدود ہو گئی تھی۔

اس تبدیل ہوتی ہوئی معاشی صورتحال کے اہم سیاسی پہلو یہ تھے کہ (i) بٹائی پر کاشت کے لئے زمین میں غیر معمولی کمی واقع ہو گئی تھی اور مزارع کا اپنے سرپرست (زمیندار) کی مہربانی پر انحصار بڑھ گیا تھا (ii) بہت ہی تھوڑی ملکیت اراضی والے غریب کاشتکار جو کہ پہلے بٹائی پر زمیندار کی زمین کاشت کر کے اپنی آمدنی میں اس قدر اضافہ کر لیتے تھے کہ ان کا باسانی گذر بسر ہو جاتا تھا اب انہیں بٹائی پر دی جانے والی اس زمین سے محروم کر دیا گیا۔

سرپرست وزیر دست کا باہمی تعلق زمیندار کے غلبے اور مزارعے کی مغلوبیت پر مبنی ہوتا ہے اور بٹائی پر کاشت کرنے والے مزارعین یا بے زمین کھیت مزدوروں کو زمینداروں کا دست نگر بنا کے رکھ دیتا ہے۔ اس کے بالکل برعکس نسبتاً چھوٹے قطعات اراضی کے مالکان جو اپنی زمین خود ہی کاشت کرتے ہیں وہ اپنی آزاد حیثیت کو براقرار رکھتے ہیں۔ ان مالکان اراضی کی ملکیت کی مد مختلف ہوتی ہے۔ بعض 5 ایکڑ کے مالک ہوتے ہیں جبکہ کچھ 25 ایکڑ کے! یہ اعداد و شمار اندازے پر مبنی ہیں۔ اگر مالک اراضی کا کنبہ لمبا چوڑا ہو تو گذر بسر کے لئے حد زمین بھی بدل جاتی ہے۔ خطہ پنجاب میں مالکان اراضی بھاری تعداد میں ہیں اور انہیں کسی بھی سیاسی گروہ میں شامل ہونے پر راضی کرنا معاشی طور پر دست نگر کسان کی نسبت بہت ہی پیچیدہ اور مشکل مرحلہ ہوتا ہے۔ کیونکہ مالکان اراضی ایک سیاسی گروہ کو

تیاگ کر کسی بھی دوسرے گروہ میں شمولیت اختیار کرنے پر قادر ہوتے ہیں۔ چنانچہ کسی بھی گاؤں میں سیاسی سرگرمیوں کا زیادہ تر یہی لوگ مرکز بنے رہتے ہیں۔

حکومتی مشینری

گاؤں کی سطح پر ہونے والی سیاست کو متعین کرنے میں انتظامی اور سیاسی مشینری کا بھی بہت اہم رول ہوتا ہے۔ خصوصی طور پر حکومت کی انتظامی مشینری نے دیہی معاشرت کو پوری طرح سے اپنی لپیٹ میں لے رکھا ہے۔ ہر گاؤں میں "نمبردار" کا روایتی عہدہ (جسے "لمبردار" بھی کہا جاتا ہے) قائم ہے نمبردار عموماً بڑا زمیندار ہوتا ہے اور وہ حکومت کی طرف سے (اس گاؤں کے زمینداروں اور کاشتکاروں سے) مالیہ وصول کرنے پر فائز ہوتا ہے۔ یہ عہدہ موروثی ہوتا ہے____ ایسا بہت کم ہوتا ہے کہ وراثت کے اس اصول کو نمبرداری کے عہدے کی بابت نظر انداز کیا جائے۔ نمبردار سرکاری ملازم نہیں ہوتا بلکہ حکومت اور گاؤں کے درمیان ایک واسطہ ہوتا ہے۔ اس کی ثالثی روایتی معاملات میں بھی ہوتی ہے اور غیر روایتی معاملات میں بھی! لیکن حالیہ برسوں میں نمبردار کے کردار کی اہمیت (سیاسی قوت کے ذریعے کے طور پر) بہت کم ہو گئی ہے کیونکہ اس کے بہت سے اختیارات اب لوکل کونسلروں کے ممبران کو منتقل ہو گئے ہیں۔

سیاسی جماعتیں اور کسان یونینیں جو کہ گاؤں کے باسیوں کو انفرادی حیثیت میں اعلیٰ سطح کے سیاسی و انتظامی نظام سے منسلک کر سکتی ہیں یہاں ناپید ہیں۔ دراصل سیاسی جماعتیں ضلعی اور اس سے بھی بلند سطح کی بااثر شخصیات کے تابع ہوتی ہیں۔ وہ اس طرح سے منظم نہیں ہوتیں کہ عام کسانوں کے مطالبات کا اظہار کریں۔ اگرچہ کسان کمیٹیاں وجود تو رکھتی ہیں لیکن معدودے چند دیہات میں! یہ کمیٹیاں دو طرح کی ہوتی ہیں۔

1_ ایسی یونینیں جن کی تھوڑی ملکیت اراضی رکھنے والے افراد (یا کسانوں) میں کہ جو آزاد و خودمختار معاشی و سیاسی حیثیت رکھتے ہوں مضبوط بنیاد ہو اور ان یونینوں کے سربراہوں کو ان مالکان اراضی کا اعتماد حاصل ہو اور وہ انہیں اپنا رہنماء تسلیم کرتے ہوں۔

2_ ایسی یونینیں جن کی قیادت طاقتور زمیندار خاندانوں کے اہم افراد کرتے ہیں۔ وہ ضلعی انتظامیہ سے ضرورت مندوں کے مسائل حل کروا کر انہیں اپنا ہمنوا بنا لیتے ہیں۔

کسان یونینوں کی زیادہ تر جدوجہد ظالم افسران کے خلاف ہی ہوتی ہے چنانچہ طبقاتی

جدوجہد کی طرف وہ کوئی توجہ نہیں دیتیں۔

قوانین میں پیچیدگیوں اور پولیس افسران سمیت انتظامی عہدوں پر فائز دیگر افسروں کے آمرانہ طرز عمل اور کرپشن کے نتیجے میں دیہی معاشرے میں افراد کے ایسے طبقے نے جنم لے لیا ہے جنہیں "کام کروانے کا ڈھنگ" آتا ہے۔ وہ متعلقہ افسران سے اچھے مراسم استوار کر لینے کا ملکہ رکھتے ہیں اور ان سے ذاتی اور اپنے حواریوں کے جائز و ناجائز کام نکلواتے ہیں۔ ایسے افراد مقامی قیادت کے قیام میں اہم کردار ادا کرتے ہیں۔

رسہ گیر اور غنڈے

لوٹ مار کرنے والے زمینداروں کی سرگرمیوں میں امن و امان قائم رکھنے والی مشینری کے اہلکار معاونت کرتے ہیں۔ ان زمینداروں کی یہ سرگرمیاں طاقت کے حصول کا بہت ہی اہم ذریعہ ہوتی ہیں خاص طور پر گاؤں کی سطح سے بلند درجے کی سیاست میں غلبہ حاصل کرنے اور بعدازاں اسے برقرار رکھنے کے لئے مختلف نوعیت کے جرائم کی پشت پناہی کرتے ہیں۔ علاوہ ازیں گاؤں پر اپنے کنٹرول کو دوام بخشنے اور کسی بھی طرح کی سیاسی مقابلے بازی میں سربلند رہنے کے لئے ایسے ہتھکنڈوں کا سہارا لیا جاتا ہے۔ یہ زمیندار جو کہ رسہ گیر ہوتے ہیں (دراصل یہ زمیندار رسہ گیروں کی پشت پناہی کرتے ہیں۔ وہ بذات خود رسہ گیر عموماً نہیں ہوتے۔ از مترجم) اور ٹھگوں کے گروہوں کو تحفظ فراہم کرتے ہیں۔ ان غیر قانونی سرگرمیاں کرنے والے گروہوں کے ارکان عام طور پر دیہاتیوں کو ڈرانے دھمکانے کے لئے ان کی دوسری قیمتی اشیاء کے علاوہ ان کے مویشی چوری کر لیتے ہیں۔ جب کبھی کسی نسبی برادری (Local Lineage) کو سبق سکھانا مقصود ہو تو اس کی (نسبی برادری کی) کوئی بھی عورت اغوا کر لی جاتی ہے۔ ایسا کرنے کے بعد ان جرائم پیشہ افراد کو مقامی زمیندار پورا تحفظ فراہم کرتا ہے۔ عام طور پر مویشیوں کی چوری ان کی نسبتاً زیادہ مرغوب سرگرمی ہے۔

مویشیوں کی چوری کو کامیابی سے برقرار رکھنے کے لئے وسیع رقبے پر پھیلے ہوئے نیٹ ورک کی ضرورت ہوتی ہے۔ چونکہ دیہاتی اپنی بھینسوں کو پہچان لیتے ہیں (یاد رہے کہ پنجاب کے دیہات میں بھینس سب سے زیادہ قیمتی جانور تصور ہوتی ہے اور عام طور پر چور بھینسوں ہی کو ہتھیانے کی کوشش کرتے ہیں) چنانچہ چوری شدہ جانوروں کی ترسیل دور افتادہ جگہوں پر کر دی جاتی ہے۔ 1933ء میں شائع ہونے والے ڈسٹرکٹ گزٹیئر میں رقم ہے "چوری شدہ

جانوروں کا باقاعدہ روٹ (route) شاہ پور سے جھنگ لائل پور (موجودہ فیصل آباد) اور منٹگمری (موجودہ ساہیوال) سے ہوتے ہوئے بہاولپور اور بیکانیر کی ریاستوں تک تھا اور اس تمام تر راستے پر ایسے متعدد اشخاص مل جاتے تھے جو چوری شدہ مویشیوں کا اتہ پتہ بتا سکتے تھے۔" (9) یہ علاقہ پنجاب کے تمام کینال کالونی کے اضلاع پر مشتمل تھا۔

مویشیوں کو چوری کرنے کا یہ قبیح رواج اب زیادہ راسخ ہو گیا ہے۔ دائیں بازو سے تعلق رکھنے والے ایک اردو روزنامے نے صورتحال کا احاطہ کچھ اس انداز میں کیا ہے: آج ہمارے معاشرے میں سب سے زیادہ سرگرم عمل' سب سے زیادہ موثر اور بارسوخ وہ طبقہ ہے جن کے کارناموں سے ہمارے اخبار بھرے پڑے ہیں۔ یہ طبقہ بلا شک و شبہ کسی باقاعدہ تنظیم کے بغیر بھی بہت منظم ہے اور اس طبقے کے رہنماء کسی رسمی سلیکشن یا تقرری کے بغیر بھی بہت طاقت و رسوخ کے حامل ہیں جو اپنے اپنے علاقوں میں دندناتے پھر رہے ہیں---- ان میں سے کسی بھی شخص کو کبھی عدالت یا ٹریبونل کے سامنے پیش نہیں کیا گیا---- اسی طبقے کے افراد اعلیٰ عہدوں پر فائز ہیں مزید برآں یہ کروڑوں میں کھیلتے ہیں لیکن ان کے کرتوت یقیناً بہت ہی گھناؤنے ہیں---- کیا آپ کے خیال میں یہ امیر اور تعلیم یافتہ غنڈے نہیں ہیں؟" (10)

پنجاب میں سیاسی مقاصد کے حصول کے لئے مویشیوں کی چوری کوئی نئی تکنیک ہرگز نہیں ہے۔ چالیس سال قبل ہیو ٹریو سکس نے رقم کیا "صوبے کے کئی علاقوں میں اسے (مویشی چوری کرنے کو) جرم کی بجائے ایک کھیل سمجھا جاتا تھا قانون ساز کونسل کے ایک ممبر پر یہ الزام عائد کیا گیا کہ اس نے ووٹ حاصل کرنے کے لئے ووٹروں کے مویشی چوری کروا لئے اور ووٹ حاصل کر لینے کے بعد انہیں ان کے مالکان کو واپس دے دیا۔" (11)

اس قدر وسیع علاقے میں ایسی سرگرمیاں پولیس کے تعاون کے بغیر ممکن نہیں جو کہ مقامی طاقت کے (Local power structure) توازن کو قائم رکھنے یا اسے تبدیل کرنے میں اہم کردار ادا کرتی ہے۔ چونکہ دیہاتی عوام غنڈوں سے خوفزدہ ہوتے ہیں چنانچہ عوام کی بقا کو یقینی بنانے کے لئے سیاسی حمایت کی صورت میں ان سے قیمت وصول کی جاتی ہے۔ کیونکہ ووٹ دیگر صورتوں سے ان کے لئے (دیہی عوام کے لئے) کم اہم ہوتا ہے۔ اگر وہ ووٹ دینے میں پس و پیش کریں گے تو انہیں بدترین نتائج بھگتنے پڑیں گے۔ چنانچہ وہ اسی میں اپنی عافیت سمجھتے ہیں کہ ووٹ غنڈوں کے سرپرست ہی کو دیں۔

گاؤں

جن چکوک کا میں نے مطالعہ کیا ہے انہیں چار درجوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔

(i) ایسے گاؤں (چکوک) جو ایک ہی زمیندار کی ملکیت ہوں یا وہاں کوئی سا ایک زمیندار مکمل غلبہ حاصل کئے ہوئے ہو۔

(ii) ایسے گاؤں جہاں ایک ہی نسب (Lineage) کے چھوٹے مالکان اراضی آباد ہوں اور اس گاؤں کی سیاست بھی نسب ہی تک محدود ہو۔

(iii) ایسے گاؤں جہاں کئی انساب (Lineages) سے تعلق رکھنے والے چھوٹے زمیندار آباد ہوں اور ان کا مقابلہ کسی ایک بڑے زمیندار سے ہو۔

(iv) ایسے گاؤں جہاں دو یا دو سے زائد بڑے زمیندار رہتے ہوں علاوہ ازیں وہاں مختلف انساب (Line ages) سے تعلق رکھنے والے چھوٹے مالکان اراضی بھی آباد ہوں۔

اس مقالے میں میں نے چوتھے درجے کے گاؤں کا تجزیہ کرنے کی کوشش کی ہے۔ اس گاؤں کی صورتحال عام طور پر مشاہدے میں آتی ہے۔ ذیل میں کئے گئے تجزیے میں افراد کے نام، ذاتیں اور گاؤں کے نام تبدیل کر دیئے گئے ہیں تاکہ کسی ذاتی و مخصی حوالے کا احتمال نہ رہے۔

انتخابی تقسیم (Electoral Divisions)

چک ٹیک والا دو الگ الگ آبادیوں پر مشتمل ہے جو ایک میل کے فاصلے پر قائم ہیں۔ اس چک کے سیاسی حلقے میں (political field) کئی بستیاں اور قرب میں واقع چک ٹبہ والا بھی شامل ہیں۔ دوسرے بارہ دیہات کے ساتھ یہ پورا علاقہ ایک یونین کونسل تشکیل دیتا ہے۔ اس علاقے کو بنیادی جمہوریتوں کے انتخاب کے دوران یونین کونسل کے ارکان منتخب کرنے کی خاطر آٹھ وارڈوں میں تقسیم کر دیا گیا۔ اس طرح مختلف دیہات کو ایک دوسرے سے ملا کر ایک وارڈ تشکیل دے دیا گیا۔

حریف زمیندار

چک ٹیک والا میں طاقت کے حصول کے لئے دو حریف سرگرم عمل تھے۔ یہ حریف علاقے کے سب سے بڑے زمیندار تھے۔ ان میں سے ایک چک ٹیک والا ہی کا مقامی پیر شیر

شاہ تھا جو 300 ایکڑ زمین کا مالک تھا اور گاؤں کا دوسرا بڑا زمیندار تھا۔ اس کے خاندان کے دوسرے ارکان بھی دریا کے گرد و نواح میں اچھی خاصی زمین کے مالک تھے۔ پیر شیر شاہ کے دادا نے 1930ء کی دہائی میں چک ٹیک والا میں ایک سکھ زمیندار سے کچھ زمین خریدی تھی جو کہ پورے گاؤں کا واحد مالک تھا۔ اس کے بعد پیر شیر شاہ کے دادا نے سکھوں سے الگ ہی اپنی چھوٹی سی بستی آباد کی جہاں اس کا خاندان اب آباد ہے۔ "پیر" چک ٹیک والا کا نمبردار ہے۔ گاؤں کے اس حصے میں جہاں وہ سکونت پذیر ہے 43 گھرانے رہائش رکھے ہوئے ہیں۔ یہاں پر "پیر" کا مکمل غلبہ ہے۔ صرف تیلیوں کی ایک مختصر سی برادری ایسی ہے جو کہ 1947ء کے بعد ہندوستان سے آ کر یہاں آباد ہوئی تھی جو کہ اس کی مخالف ہے۔ یہ برادری صرف آٹھ گھرانوں پر مشتمل ہے۔ وہ پیر شیر شاہ کی کئی وجوہات کی بنا پر مخالفت کرنے پر آمادہ ہے جو درج ذیل ہیں۔

(i) چونکہ وہ چھوٹے مالکان اراضی تھے لہٰذا وہ بڑے زمیندار کے معاشی طور پر مطیع نہ تھے۔ اس لئے موگھوں (irrigation channels) کے استعمال جیسے مسائل پر تیلی پیر شیر شاہ جیسے زمیندار سے الجھنے کی ہمت رکھتے تھے۔ اور اس ہمت کا اظہار وہ اکثر و بیشتر کرتے بھی رہتے تھے۔

(ii) ان میں نسبی یکجہتی بدرجہ اتم موجود تھی۔

(iii) تیلیوں کے کچھ مہاجر نسبی برادریوں کے ساتھ بھی برادرانہ تعلقات تھے۔ یہ مہاجر برادریاں پاس ہی آباد تھیں۔ علاوہ ازیں ان کے چند فاروقی زمینداروں سے بھی مراسم تھے کیونکہ چند تیلیوں نے ان سے زمین ٹھیکے پر لے رکھی تھی۔

چک ٹیک والا کے دوسرے حصے پر پیر شیر شاہ کے حریف میاں عثمان فاروقی کی عملداری قائم تھی جو کہ اطراف میں سب سے بڑا زمیندار تھا اور اس کی ملکیت اراضی اسی گاؤں کی حدود میں 500 ایکڑ تھی جبکہ وہ دوسرے ضلع میں بھی 300 ایکڑ کے قریب زمین کا مالک تھا۔ وہ مقامی یونین کونسل کا چیئرمین بھی تھا۔ گاؤں اس کے دیگر نسبی رشتہ دار بھی زمینوں کے بڑے قطعات کے مالک تھے۔ گاؤں کا وہ حصہ جہاں فاروقیوں کا غلبہ تھا وہاں 68 گھرانے آباد تھے۔ یہاں کے رہائشی ہندوستانی پنجاب کے دوسرے مختلف اضلاع سے ہجرت کر کے یہاں آئے تھے لیکن نسبی رشتہ داری نے انہیں ایک دوسرے سے منسلک کر رکھا تھا۔ اس برادری کے اہم ترین ارکان میں سے دو (جن میں میاں عثمان بھی شامل تھا) پنجاب

کے ایک ہی ضلع سے تعلق رکھتے تھے جبکہ ان کے علاوہ دوسرے اہمیت کے حامل ارکان دوسرے ضلعے سے تھے۔ ان (مہاجر فاروقیوں) کی نسبی رشتہ داری کئی نسلیں پرانی تھی۔نسبیہ رشتہ داری اس وقت زیادہ مضبوط ہو گئی جب یہ سب افراد چک ٹیک والا میں آ کر آباد ہو گئے۔ رشتہ داری اور باہمی تعلق میں آ جانے والی اس پختگی و مضبوطی کی بڑی وجہ تو یہ تھی کہ انہیں خالی زمین (جو ہندو اور سکھ چھوڑ کر ہندوستان چلے گئے تھے) کے حصول کے لئے پیر شیر شاہ اور کئی دوسرے مقامی باأثر افراد سے مقابلہ کرنا تھا۔

سیاسی کامیابی کے لئے پیر شیر شاہ کو تیلیوں کی باہمی یکجہتی میں دراڑ ڈالنا تھی چنانچہ اپنے مقصد کو حاصل کرنے کے لئے اس نے دو حکمت عملیاں اپنائیں۔ ایک حکمت عملی تو ناکام رہی لیکن دوسری کامیابی سے ہمکنار ہوئی۔ لیکن اس سے پہلے ہمارے لئے ضروری ہے کہ گاؤں کے اس حصے کا بنظر غائر مطالعہ کریں جہاں فاروقیوں کا غلبہ تھا۔ یاد رہے کہ اسی حصے سے ہی پیر شیر شاہ کو سخت قسم کا چیلنج درپیش تھا۔

دو طرح کی حکمت عملیاں

گاؤں کے اس حصے میں جہاں فاروقیوں کا غلبہ تھا۔ نسبی رشتہ داری کے حوالے سے گھرانوں کی تعداد کا جدول ذیل میں دیا جاتا ہے۔

	ہندوستان کے ضلع الف سے	ہندوستان کے ضلع ب سے	مقامی
فاروقی	2	7	_
بھٹی	_	10	_
جولاہے	_	9	_
کھرل	7	_	_
وٹو	6	_	_
سیال	2	_	_
ارائیں	3	_	2
(تین نسبی برادریاں)			
ڈوگر	_	_	1

ماچھی	3	3	_
میراثی	5	4	_
ترکھان	_	1	_
لوہار	_	_	1
نائی	_	_	1
کمہار	_	_	1
کل	28	34	6

اب شیر شاہ کی سیاسی حکمت یہ تھی کہ بھٹیوں اور جولاہوں پر توجہ مرکوز کی جائے اور انہیں اپنے زیر اثر لایا جائے۔ یہ دونوں چھوٹے مالکان اراضی تھے اور کسی کے مطیع و محتاج نہ تھے۔ اس لئے امکان اس بات کا تھا کہ وہ شیر شاہ کی حمایت پر آمادہ ہو جائیں۔ شیر شاہ نے ان افراد کو اپنا حمایتی بنانے کی قطعاً کوشش نہ کی جو بڑے زمینداروں پر انحصار کرنے پر مجبور تھے جیسے کھرل، وٹو، سیال، ارائیں، ڈوگر، ماچھی اور میراثی یا تو فاروقیوں کے مزارعے تھے یا ان کے کھیتوں میں ملازم یا مزدور کی حیثیت سے کام کرتے تھے اور کئی نسلوں سے فاروقی نسب کی ہی خدمت کرنے پر مامور تھے۔ گو کہ یہ سب فاروقی آقاؤں کے رویے سے بہت تنگ تھے اور انہیں اکثر و بیشتر تلخ تجربات ہوتے تھے۔ فاروقیوں کے مطیع اور دست نگر افراد کو ان سے شکوہ تھا کہ وہ آقا ہونے کے ناطے سے اپنی روایتی ذمہ داریاں نہیں نبھا رہے۔ اور (Tenancy law) مزارعوں سے متعلق قوانین کے مطابق ان کے حقوق کو بھی مسلسل نظرانداز کئے جا رہے ہیں۔ ماضی میں انہیں جو بٹائی پر زمین کاشت کے لئے دی گئی تھی اس زمین کا بڑا حصہ ان سے واپس لے لیا گیا تھا۔ اب ان کے پاس پہلے کے مقابلے میں بہت ہی تھوڑی زمین رہ گئی تھی جس کی وجہ سے وہ اس گاؤں میں ابھی تک سکونت اختیار کئے ہوئے تھے۔ بے انصافی اور ظلم کی کئی مثالیں موجود تھیں جنہیں کام میں لا کر فوجداری مقدمہ بنوایا جا سکتا تھا لیکن پیر شیر شاہ نے ایک مرتبہ بھی ظلم کا شکار ان مزارعین کی حالت زار کو اپنے فائدے کے لئے استعمال کرنے کی کوشش نہیں کی۔ حالانکہ ان حالات سے فائدہ اٹھا کر وہ اپنے حریفوں کے لئے مشکلات پیدا کر سکتا تھا۔ لیکن اس کا کہنا تھا کہ وہ اس قدر گر نہیں سکتا۔ حالانکہ اس کی بعض دوسری سرگرمیاں اس سے کہیں زیادہ گھناؤنی تھیں جن کو نظر میں رکھتے ہوئے اس کا یہ بیان مضحکہ خیز لگتا تھا۔ غالباً اس بات پر فریقین میں خاموش

سمجھوتہ تھا جس کے تحت ان نکات یا مسائل کو وجہ تنازعہ نہیں بنایا جاتا تھا۔ جن سے زمینداروں کے مفادات کو بحیثیت مجموعی خطرہ لاحق ہونے کا اندیشہ تھا۔ علاوہ ازیں پیر شیر شاہ کے رویے سے صاف پتہ چلتا تھا کہ وہ ان افراد کو اپنے حلقہ اثر میں لانے کی کوشش کو ایک کار بے سود سمجھتا تھا جو فاروقی زمینداروں کے معاشی طور پر دست نگر تھے۔ ان لوگوں کی توجہ تبھی اپنی جانب مبذول کرائی جا سکتی تھی اگر انہیں کوئی بہتر متبادل ذریعہ معاش مہیا کیا جاتا کیونکہ معاشی طور پر دست نگر اپنے سرپرست کی نافرمانی نہیں کرتا۔ کیونکہ پنجاب کے دیہات میں طبقاتی جدوجہد کا ابھی تک آغاز نہیں ہوا۔

محکومی سے نجات

اس کے بالکل برعکس یہ دیکھنا دلچسپی کا باعث ہو گا کہ کس طرح راجپوتوں کی ایک خاصی بڑی نسبی برادری کا سیاسی رویہ ان کے معاشی حالات کے بدل جانے سے تبدیل ہو گیا۔ اس نسبی برادری ہی کی بھاری اکثریت قریبی گاؤں ٹبہ والا میں آباد تھی۔ تقریباً تمام گھرانے بہت ہی چھوٹے چھوٹے قطعات اراضی کے مالک تھے۔ ان میں سے کسی کے پاس ایک یا دو ایکڑ سے زیادہ زمین نہ تھی۔ اس لئے انہیں اپنے علاقے کے تین بڑے زمینداروں میاں عثمان فاروقی۔ پیر شیر شاہ اور پیر شیر شاہ کے قریبی ساتھی (جو علاقے کا بڑا زمیندار تھا) سے بٹائی پر زمین حاصل کرنا پڑتی تھی۔ چنانچہ وہ ان تین بڑے زمینداروں کے دست نگر تھے۔

چک ٹبہ والا کے راجپوت باہمی یکجہتی کی وجہ سے شہرت رکھتے تھے۔ سیاسی طور پر اس کی توقع کی جا سکتی تھی کہ یہ راجپوت برادری الجھن کا شکار ہو گی لیکن انہوں نے اس الجھن کا علاج یہ کیا کہ سیاسی طور پر ایک دوسرے کے مخالف زمینداروں کے مزارع ہونے کی وجہ ہر ایک کو یہ رعایت دے دی گئی کہ جو بھی جس زمیندار کی زمین کاشت کرے گا وہ اسی ہی کو ووٹ دے (اور اسی کی سیاسی حمایت کرے)۔ اس صورتحال میں 1969ء کے دوران انقلابی تبدیلی رونما ہوئی۔ اس وقت تک راجپوت نسبی برادری کے کافی سارے ارکان بٹائی پر کاشت کے لئے دی گئی زمین سے محروم کر دیئے گئے کیونکہ ان کے سرپرست زمینداروں نے اب ٹریکٹروں کی مدد سے کاشتکاری شروع کر دی تھی لہٰذا ان راجپوتوں کی خدمات کی اب انہیں ضرورت نہ رہی۔ اب راجپوت نسبی برادری کے یہ ارکان اگرچہ مفلوک الحال ہو گئے تھے لیکن وہ ان زمینداروں کے اس قدر دست نگر بھی نہ رہے تھے جتنے کہ پہلے تھے۔ اب

ان کا رویہ جارحانہ ہو گیا تھا اور اپنے حقوق کے لئے اب وہ ڈٹ جانے پر تیار تھے۔ جب کپاس کی چنائی کا موسم آیا تو انہوں نے بڑی کامیاب ہڑتال کی جس کے نتیجے میں کپاس کی چنائی کرنے والی عورتوں کو ان کی اجرت کے طور پر دیئے جانے والے حصے میں اضافہ ہو گیا۔ اس سے پہلے ان عورتوں کو اس کپاس کا جو وہ چنتی تھیں بیسواں حصہ اجرت کے طور پر دیا جاتا تھا لیکن اب انہیں سولہواں حصہ دیا جانے لگا۔

اس محکومی کی حالت سے کامیابی کے ساتھ نکل آنے کے تین بنیادی اسباب تھے۔ پہلا تو یہ تھا کہ 36 گھرانوں میں اس قدر یکجہتی اور اتحاد تھا کہ انہیں اس اتحاد کی موجودگی میں کسی کا ڈر نہ تھا۔ دوسرا یہ کہ اب جبکہ بٹائی پر کاشت کے لئے انہیں دی گئی زمین چھن چکی تھی اب مزید کھونے کیلئے ان کے پاس اور کچھ نہ تھا۔ اور جو تھوڑی بہت اراضی ان کے پاس تھی ان کی دو وقت کی روٹی کا بندوبست اس سے ہو جاتا تھا۔ تیسرا یہ کہ اب جبکہ زمین کی کاشت زیادہ تر ٹریکٹروں کے ذریعے ہونے لگی تھی اس کی وجہ سے مردوں کے روزگار پر شدید اثر پڑا تھا۔ چونکہ کپاس کی چنائی روایتی طور پر خواتین کا شعبہ ہوتا ہے اور ان دنوں (1960ء کی دہائی کے اختتامی برسوں اور 1970ء کی دہائی کے دوران) کپاس کاشت کرنے کا رواج زور پکڑ گیا ہے لہٰذا اس کی چنائی کے لئے خواتین کی خدمات کی طلب بھی غیر معمولی طور پر بڑھ گئی اور راجپوت خواتین اب اپنی شرائط منوانے کے لئے بہت مضبوط پوزیشن میں آ گئیں۔

محکومی کے مختلف ردعمل

پیر شیر شاہ کا نشانہ یعنی بھٹی اور جولاہے کافی کمزور تھے۔ پیر شیر شاہ نے انہیں اپنی حمایت پر مجبور کرنے کی خاطر اپنے غنڈوں پر انحصار کیا علاوہ ازیں اس کام کو پایہ تکمیل تک پہنچانے پیر شیر شاہ نے مقامی پولیس سے اپنے تعلقات کا بھی استعمال کیا۔ بھٹیوں کو تو اس طرح سے اپنے حلقہ اثر میں لانے میں وہ ناکام رہا البتہ جولاہوں کی تمام نسبی برادری کو اپنا سیاسی حامی بنانے میں اسے کامیابی ہوئی۔

بھٹی "محمد بھٹی" کو اپنا "بڑا" تصور کرتے ہیں۔ حقیقت میں نہ تو وہ سب سے زیادہ عمر کا ہے اور نہ ہی سب سے امیر! بھٹیوں میں سب سے عمر رسیدہ شخص نااہل ہے جبکہ سب سے امیر ابھی بہت ہی کم عمر ہے لہٰذا "محمد بھٹی" کو نسبی برادری کا سربراہ بنا دیا گیا۔ "محمد"

کے پاس صرف پانچ ایکڑ اراضی ہے لیکن میاں عثمان اس کے ساتھ عزت و تکریم سے پیش آتا ہے اور عموماً اسے "پریں" (Parain) (پریں : ایسی مجلس کو کہا جاتا ہے جو آپس کے جھگڑوں نیز ایک برادری کے رکن کے کسی دوسری برادری کے رکن کے ساتھ تنازعے کو رفع کرنے کے لئے تشکیل دی جاتی ہے۔ یہ گاؤں کے معتبر افراد پر مشتمل ہوتی ہے) کا رکن بننے کی دعوت بھی دیتا رہتا ہے۔ چنانچہ بھٹی پوری طرح سے میاں عثمان کے حامی ہیں جس کے شانہ بشانہ وہ سب 1947ء کے بعد سے پیر شیر شاہ سے برسرپیکار رہے ہیں۔

بنیادی جمہوریتوں کے تحت انتخابات سے کچھ ہی عرصہ قبل بھٹی برادری کے ایک رکن کا اونٹ چوری ہو گیا۔ تب پیر شیر شاہ نے محمد بھٹی سے رابطہ کیا اور یہ عندیہ دیا کہ اسے اس شخص کا علم ہے کہ جس کے پاس چوری شدہ اونٹ ہے اور وہ کوشش کر کے یہ اونٹ بھٹیوں کو واپس دلا سکتا ہے اگر محمد بھٹی آئندہ انتخابات میں پوری بھٹی برادری کے ووٹ دلوانے کا وعدہ کر لے۔ وہ شخص اونٹ جس کی ملکیت تھا اور اس کے چند قریبی عزیز اس سودے بازی کے حق میں تھے لیکن محمد بھٹی اس کے خلاف تھا۔ اس کا کہنا تھا کہ خدا انہیں چوری شدہ اونٹ تو واپس دے دے گا لیکن اگر انہوں نے خود ہی اپنی عزت اور غیرت گنوا دی تو خدا یہ انہیں ہرگز واپس نہ دے گا۔ اس نے سمجھداری کا ثبوت دیتے ہوئے یہ جتا دیا کہ بھٹیوں نے اگر ایک مرتبہ پیر شیر شاہ کی حمایت کر دی تو بھٹی خود اپنے ان مہربانوں کی حمایت سے محروم ہو جائیں گے جنہوں نے ماضی میں بارہا مشکل گھڑیوں کے دوران ان کا بھرپور ساتھ دیا۔ اس کے ساتھ ہی انہیں یہ خدشہ بھی تھا کہ پیر شیر شاہ مستقبل میں ان کی مدد نہیں کرے گا چنانچہ اس پر اعتماد نہیں کیا جا سکتا۔ اور وہ اگر اس کی حمایت پر آمادہ ہو گئے تو تنہا اور بے یار و مددگار رہ جائیں گے۔ محمد بھٹی کی دلیل یہ تھی "سمجھداری کا تقاضا یہی ہے کہ میاں عثمان کا ساتھ نہ چھوڑا جائے۔" آخرکار نسبی برادری کے دوسرے ارکان بھی اس بات پر آمادہ ہو گئے۔ صرف وہ شخص جس کا اونٹ چوری ہوا تھا اس معاملے پر ناخوش تھا لیکن محمد بھٹی نے اسے اپنی بیلوں کی جوڑی مستعار دے دی تاکہ آئندہ فصل کو کاشت کرنے کے لئے اسے مشکل نہ ہو۔ اس طرح اسے بھی مطمئن کر دیا گیا۔

ایک عورت کا اغواء

جولاہوں کے ساتھ معاملہ کرنے میں پیر شیر شاہ کو کامیابی ہوئی ایک دن جولاہوں کی

ایک کنواری دوشیزہ کو اغواء کر لیا گیا۔ جولاہوں کو یہ شک تھا کہ اس اغواء کے پیچھے پیر شیر شاہ کا ہاتھ تھا چنانچہ وہ مدد کے لئے میاں عثمان کے پاس گئے۔ اس نے مبہم سے وعدے کئے لیکن عملی طور پر کچھ نہ کیا۔ اسی دوران پیر شیر شاہ کے گاؤں سے ایک جولاہا چک ٹپہ والا کسی دوسرے جولاہے سے ملنے آیا۔ یہ اس گاؤں کے جولاہوں کا رشتہ دار نہ تھا پھر بھی اس نے ٹیک والا کے جولاہوں سے یہی کہا کہ یہ جولاہوں کے لئے باعث شرم ہے کہ جولاہوں کی نوجوان عورت اس کے گاؤں میں غیر اخلاقی طور پر (غیر شرعی طور پر یعنی شادی کئے بغیر) ایک مرد کے ساتھ رہ رہی ہے اور وہ شخص جس کے پاس وہ رہ رہی ہے وہ ٹیک والا کا ایک ایسا شخص ہے جو ذات کا جولاہا نہیں ہے۔ ان حالات کے پیش نظر ٹیک والا کا یہ جولاہا لڑکی کے سرپرستوں سے یہ کہنے آیا کہ وہ جولاہا برادری کی عزت و غیرت کو بچانے کے لئے کچھ کریں۔ اس نے یہ اشارہ بھی دیا کہ اس سلسلے میں پیر شیر شاہ سے اگر بات کی جائے تو وہ مدد کر سکتا ہے۔ لڑکی کا اتہ پتہ معلوم ہونے پر جولاہے ایک مرتبہ پھر میاں عثمان کے پاس آئے اور امداد کی درخواست کی۔ لیکن میاں عثمان نے انہیں پولیس کے پاس جانے کا مشورہ دیا اور کہا "چونکہ وہ پندرہ روز کے لئے کہیں جا رہا ہے لہٰذا اس کے پاس اس کام کے لئے وقت نہیں ہے۔" دراصل میاں عثمان کا پولیس یا جرائم پیشہ افراد سے کوئی تعلق واسطہ نہ تھا جبکہ اس کے حریف کے ان دونوں سے گہرے مراسم تھے اور غالباً وہ اس کام کا ذمہ نہیں لینا چاہتا تھا جسے پورا کرنے کا وہ اپنے آپ کو اہل نہ پاتا تھا۔ وہ سمجھتا تھا کہ انکار کرنا ناکام ہونے سے بہتر ہے کیونکہ انکار سے اتنی تذلیل نہیں ہوتی جتنی کہ حامی بھر کے ناکام ہونے میں۔ علاوہ ازیں اسے یہ بھی امید تھی کہ یہ معاملہ بھی بالکل اسی طرح ہوا میں تحلیل ہو جائے گا جیسے اونٹ کی چوری والا معاملہ خود بخود طے ہو گیا تھا۔ جولاہوں نے دو دن تک اس مسئلے پر گفت و شنید جاری رکھی۔ ان کے لئے میاں عثمان کی حمایت سے دستبردار ہونا مشکل تھا کیونکہ گاؤں کے اس حصے میں جہاں وہ سکونت پذیر تھے اسے (میاں عثمان کو) غلبہ حاصل تھا لیکن جب انہیں میاں عثمان کے ذریعے مسئلہ حل ہوتا ہوا نظر نہ آیا تو بالآخر انہوں نے پیر شیر شاہ کی طرف ایک وفد بھیجنے کا فیصلہ کیا۔ پیر شیر شاہ نے ان سے قرآن پر حلف لیا کہ وہ ہر حال میں اس کی ہی حمایت کریں گے اور دوسرے ہی دن اغواء شدہ لڑکی واپس اپنے گھر آ گئی۔ جب تحصیلدار اور اس کا عملہ ووٹروں کے اندراج کے لئے گاؤں آیا تو جولاہوں نے اپنے حلف کے مطابق ہی عمل کیا۔ اب جولاہے پیر شیر شاہ کے غیر مشروط طور پر حمایتی تھے۔ اس

طرح ان کی وفاداری بدل گئی اور اس گاؤں میں دو سیاسی گروہ تشکیل پا گئے۔

گروہوں کی نوعیت

پنجاب کے دیہات میں سیاست گروہی (factions) طرز پر ہوتی ہے خواہ مشرقی پنجاب ہو یا مغربی پنجاب! ایف جی بیلی (F. G. Bailey) نے سیاسی گروہ کی تعریف یوں کی ہے۔ " افراد پر مشتمل اکٹھ دو (ایک دوسرے سے باہمی منسلک) خوبیوں کی بنا پر سیاسی گروہ کا قالب اختیار کر لیتا ہے۔ پہلی خوبی تو یہ ہے کہ اس گروہ کے ارکان محض اس لئے ایک دوسرے سے تعاون نہ کریں کہ ان کا نظریہ ایک ہے اور باہمی تعاون سے نظریہ مضبوط ہو گا۔ جبکہ دوسری خوبی یہ ہے وہ ایسے لیڈر کی قیادت اختیار کریں گے جس کے ساتھ ان کے لین دین کے تعلقات (Transactional Relationship) ہوں گے۔" (12) اس مسئلے کے ادراک کے لئے یہ تعریف ہمیں اچھی ابتداء فراہم کر دیتی ہے۔ جہاں تک گاؤں کی سیاست کا تعلق ہے تو لین دین پر مبنی تعلقات بعض اوقات زیادہ اہمیت اختیار نہیں کر پاتے۔ خاص طور پر جب معاملہ اقتصادی محکومی کا ہو تو کسی بھی فرد (بٹائی پر زمین کاشت کرنے والا مزارع یا کھیت مزدور) کا سیاسی عمل ہمیشہ اس کی معاشی حالت متعین کرے گی۔ جہاں بٹائی پر کاشت کرنے والے مزارعین یا کھیت مزدور اپنے آپ کو طبقاتی بنیادوں پر منظم کرنے میں کامیاب رہے اور زمینداروں کو چیلنج کیا تب سیاسی تنظیم کی بنیاد گروہی (factional) نہ رہی۔ جہاں زمیندار کے لئے گروہی حمایت جاری رہے تو ہم لین دین کے تعلقات کے مفہوم کو ضرورت سے زیادہ پھیلائے بغیر اس صورتحال پر اس مفہوم کا اطلاق نہیں کر پائیں گے۔

چند امتیازات

مذکورہ بالا بیان سے یہ نتیجہ برآمد ہوتا ہے کہ گروہوں کی رکنیت دو طرح کے لوگوں پر مبنی ہوتی ہے۔ ایک تو وہ لوگ ہوتے ہیں جو انتخاب (Choice) کر سکتے ہیں اور دوسرے وہ جو ایسا کرنے کی پوزیشن میں نہیں ہوتے۔ وہ لوگ جو اقتصادی محکومی کا شکار ہوتے ہیں وہ دوسری طرح کے لوگ ہوتے ہیں۔ بیلی "پیروی" (following) اور "گہرے ربط" (Core) کی اصطلاحات استعمال کر کے ان لوگوں میں فرق کرنا چاہتا ہے جن کا اپنے لیڈر سے تعلق محض معاہدے کی حیثیت رکھتا ہے اور اسے آسانی سے متزلزل کیا جا سکتا ہے جبکہ دوسرے گروہ کا تعلق اخلاقی نوعیت کا ہوتا ہے۔ میرے خیال میں اقتصادی سرپرستی و محکومی ہی

اس "گہرے ربط" (Core) کے قیام کی بنیادی وجہ ہے۔

رالف نکولس نے مغربی بنگال کی دیہی سیاست کا تجزیہ کرتے ہوئے گروہی حمایت کے چند بنیادی ذرائع کا تعین کیا ہے۔ یعنی برادری (Kinship)' ذات (Caste)' اقتصادی محکومی کسی گروہ کے ممکنہ رکن کے تمام رابطے ایک ہی جہت کی طرف اشارہ کرتے ہوں تو اس کے لئے انتخاب کی الجھن باقی نہیں رہتی۔ عموی طور پر انتخاب کرنا ناگزیر ہوتا ہے اور جس بنیاد پر انتخاب کیا جائے وہ بہت اہمیت کی حامل ہوتی ہے۔ اس نکتے کو اگر گروہی لیڈر کے زاویہ نگاہ سے دیکھا جائے تو اس میں ایک گونہ ابہام پیدا ہونے لگتا ہے یعنی گروہی لیڈر کی یہ ضرورت کہ وہ کسی بھی بنیاد پر میسر آنے والے سہارے کو تلاش کرے دوسرے الفاظ میں اسے حصول تائید میں تنوع کا اصول کہا جا سکتا ہے۔

اس کے علاوہ عمودی اور افقی روابط (vertical and horizontal alignments) میں فرق کو سمجھنا بھی بہت ضروری ہے۔ عمودی روابط میں اقتصادی محکومی اور سرپرست و پرودہ کے تعلقات شامل ہوتے ہیں۔ کسی ایسے شخص کو جس کا اقتصادی انحصار کسی دوسرے پر ہو متزلزل کرنے سے مقابل گروہی لیڈر کے محدود ذرائع پر بوجھ پڑے گا جبکہ اس کے مقابلے میں حریف گروہی لیڈر کے پرودہ کے منحرف ہو جانے سے اس کے وسائل بہتر ہو جائیں گے۔

یکجہتی کی حدود

افقی روابط (Horizontal alignments) میں نسبی (ہم ذات لوگوں میں) یکجہتی اور طبقہ وارانہ یگانگت شامل ہوتی ہے۔ ان روابط کے تحت بالادست اور زیردست افراد کے رول (roles) میں عدم تناسب پایا جاتا ہے۔ اول الذکر کسی دوسرے نسب یا طبقے سے روابط استوار کرنے میں آزاد ہوتے ہیں جبکہ موخرالذکر کو یہ آزادی حاصل نہیں ہوتی اگر وہ معاشی طور پر کسی کے دست نگر ہوں۔ دراصل اول الذکر کے لئے افقی اور عمودی روابط میں تضاد (Conflict) نہیں ہوتا لیکن موخرالذکر کے لئے یہ تضاد بدرجہ اتم موجود رہتا ہے اور اس کا امکان ہوتا ہے کہ افقی روابط بعدازاں عمودی روابط کا قالب اختیار کر لیں۔

چنانچہ افقی روابط نسبی یکجہتی کی شکل میں ان افراد میں موجود ہوتے ہیں جو اقتصادی طور پر آزاد ہوں ان لوگوں کے لئے نسبی تنظیم موثر نہیں رہتی جو معاشی لحاظ سے کسی دوسرے

پر انحصار کرتے ہوں۔ اور اگر ان افراد میں نسبی یکجہتی (Image Solidarity) مضبوط ہو بھی جیسا کہ چک ٹبہ والا کے راجپوتوں میں تھی تب بھی نسب کو سیاسی طور پر تقسیم ہونا پڑتا ہے۔

طبقہ وارانہ یگانگت بالکل ہی مختلف سماجی عنصر ہوتی ہے۔ افقی روابط میں جب اقتصادی محکومی پنپنے لگتی ہے تو طبقہ وارانہ یکجہتی ہی اقتصادی محکومیت کو چیلنج کرتی ہے۔ عام طور پر بٹائی پر کاشت کرنے والے مزارعوں میں مشینی طریقہ کاشت اور ناجائز بے دخلی کی وجہ سے تلخی اور ناراضگی کی تہہ میں تشدد (militancy) پنہاں ہوتا ہے۔ لیکن ابھی تک یہ تشدد سیاسی عمل میں منتقل نہیں ہو پایا۔

References

1. See, for instance, Ashford, D. E., National Development and Local Reform, Princeton, 1967, p. 12.
2. The field work on which this paper is based is part of a research project, in progress, financed by a grant from the SSRC and carried out at the Institute of Development Studies at the University of Sussex. The writer wishes to acknowledge his debt to the SSRC and the IDS.
3. Ibbetson, Sir Densil, Caste in Punjab, Lahore, 1961, pp. 2 and 14.
4. The discussion here is canfined to the role of caste among the Muslims of the Punjab Pakistan. For a more general discussion see: Kari, Nazmul, Changing Society in India and Pakistan, Dacca, 1956; Ansari, Ghaus, Muslim Caste in Uttar Pradesh, Lucknow, 1960; Ahmed, Mrs. Z., in Economic Weekly, Vol. XIV, No. 7, February 17, 1962.
5. Karve, Irawati, Kinship Organisation in India, Poona, 1953; and Dumont, L., and Pocock, D., "Kinship", in Contributions to Indian Sociology, No. 1, 1957.
6. Mayer, Adrian, Caste and Kinship in Central India, London 1960, p. 208.

7. The "participation lineage" would be equivalent to Mayer's "kindred of recognition", but more precisely delimated. See Mayer, op. cit., p. 4.
8. The practice of gift exchange is described in Eglar, Zekiye, A Punjabi Village in Pakistan, New York 1960, but the writer appeared not to perceive its structural significance in the organisation of the lineage.
9. Wace, F. B., and Bourne, F. C., Punjab District Gazetteers, Vol. XVIII, Lahore, 1935, p. 218.
10. Nawa-i-waqt, May 28, 1968, translated from the Urdu original.
11. Trevaskis, Sir Hugh, Punjab of Today, Lahore 1931, Vol. II, p. 277.
12. Bailey, F. G. Stratagems and Spoils, Oxford, 1969, p. 52.
13. Ibid., p. 28.
14. Nicholas Ralph W., "Factions: a comparative analysis", in M. Banton (ed.), Politics and the Distribution of power, London, 1965.
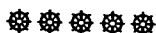
تحقیق کے نئے زاویے

نمک کی تاریخ

ڈاکٹر مبارک علی

تاریخ نویسی میں ایک اضافہ اور ہوا ہے اور وہ یہ کہ اب اشیاء کی تاریخ بھی لکھی جانے لگی ہے۔ کیونکہ مورخین کا نقطہء نظر یہ ہے کہ اشیاء بھی انسانوں کی طرح زندگی رکھتی ہیں، اور معاشرے میں اسی طرح سے اثر انداز ہوتی ہیں جیسے کہ انسان۔ اس لئے اگر اشیاء کی تاریخ لکھی جائے تو اس سے نہ صرف ان کے اور انسان کے باہمی تعلقات کے بارے میں ارتقائی عمل کا احساس ہوتا ہے بلکہ یہ کہ اشیاء کس طرح سے انسان کی زندگی، اس کے برتاؤ، رویہ، اور سوچ پر اثر انداز ہوتی ہیں۔

انہیں اشیاء میں ایک اہم شے نمک کی ہے جو کہ اپنے اندر ایک تاریخ پوشیدہ رکھے ہوئے ہے اب مورخین اس تاریخ کی چھان بین کر رہے ہیں کہ نمک کی انسان کی زندگی میں کیا اہمیت رہی ہے؟ اس کا تعلق مذہبی اور سماجی رسومات سے کس طرح جڑ گیا ہے؟ اور سیاسی طور پر اس کو حکمراں طبقوں نے اپنے مالی مفادات کے لئے کس طرح سے استعمال کیا ہے۔

اب ماہر آثار قدیمہ اور مورخین اس نتیجہ پر پہنچ گئے ہیں کہ نمک کا استعمال بہت قدیم ہے، یعنی اس کی شہادت پتھر کے زمانہ سے ملتی ہے۔ ابتداء ہی سے غذا اور ادویات میں استعمال ہونے کی وجہ سے اس کی اہمیت بہت بڑھ گئی تھی جس کا اظہار قدیم مصنفوں کے ہاں ملتا ہے، مثلاً یونانی شاعر اسے الٰہی مادہ (Divine Substance) کہتا ہے۔ افلاطون کے نزدیک یہ خدا کے نزدیک ایک پسندیدہ شے ہے۔ اس وجہ سے اس کی قدر و قیمت بڑھ گئی۔ ابی سینا یا ملک حبشہ میں جب مہمان آتا تھا تو اسے بطور عزت نمک کی ڈلی پیش کی جاتی تھی تا کہ وہ اسے چاٹے۔ پرینیز (Pyrenees) کے علاقہ میں یہ دستور تھا کہ شادی جوڑے کی بائیں جیب میں نمک کی ڈلی

رکھ دی جاتی تھی تا کہ وہ مردانگی کی حفاظت کرے۔ سویڈن کے کچھ علاقوں میں یہ دستور تھا کہ لڑکیوں کو "خوابوں والا دلیہ" (Dream Porrdge) کھلایا جاتا تھا جس میں خوب نمک ہوتا تھا اور پھر بغیر پانی پیئے وہ سو جاتی تھی تا کہ اس کا مستقبل کا شوہر خواب میں آئے اور اس کی پیاس کو بجھائے۔ یورپ میں یہ آداب میں سے تھا کہ نمک کو انگلیوں سے چھوا جائے۔ اسے برتن سے چاقو کی نوک پر لیا جاتا تھا اور پھر پلیٹ میں ڈالا جاتا تھا۔ امراء کھانے کی میز پر نمک رکھتے تھے تا کہ اس سے ان کی دولت اور امارت ظاہر ہو۔

برصغیر ہندوستان میں یہ رسم ہے کہ مزاروں پر یا کچھ رسومات کے وقت بچوں کو نمک چٹایا جاتا ہے، تا کہ انہیں برکت ملے اور بچہ آفتوں سے محفوظ رہے

اگرچہ اس موضوع پر کئی کتابیں لکھی جا چکی ہیں، جن میں خاص طور سے، ایس۔اے۔ایم ایڈشیڈ کی "نمک اور تہذیب" S.A.M. Adshead: Salt and Civilization (1992) قابل ذکر ہے، مگر اس موضوع پر مارک کرلانسکی کی کتاب "نمک: دنیا کی تاریخ" نئی کتاب ہے کہ جس میں نمک کو دنیا کی تاریخ کے حوالے سے دیکھا گیا ہے۔ Mark Kurcansky: Salt: A World History (2002) نمک کے استعمال کا ذکر کرتے ہوئے وہ لکھتا ہے کہ 1920ء کی دہائی میں، ایک نمک کی کمپنی میں پمفلٹ شائع کیا کہ جس میں اس کے ایک سو ایک فوائد بتائے گئے ہیں۔ لیکن زمانہ قدیم میں بھی لوگ اس کے فوائد سے واقف تھے۔ جن میں خاص طور سے مچھلی اور گوشت کو محفوظ کرنا تھا۔ مصری نہ صرف گوشت کو محفوظ رکھتے تھے، بلکہ وہ پہلے لوگ تھے کہ جنہوں نے روٹی میں اس کو استعمال کیا۔ نمک کا یہ استعمال ہمیں کیلٹس (Celt)، چینیوں، رومنوں، فونقیوں کے ہاں بھی ملتا ہے۔ مصری نمک کو ممی یا حنوط شدہ لاشوں میں بھی استعمال کرتے تھے۔

اس کی اس اہمیت کو مدنظر رکھتے ہوئے رومی مصنف پلینی (Pliny) کہا تھا کہ ایک مہذب زندگی بغیر نمک کے نہیں رہ سکتی ہے۔ یہ اس قدر اہم شے ہے کہ اس کو ہم ذہنی سکون اور راحت کے لئے بطور تشبیہ استعمال کرتے ہیں۔ پانچویں صدی میں ایک گوتھ سردار کا کہنا تھا کہ یہ ہو سکتا ہے کہ کوئی سونے کی تلاش نہ کرے، لیکن یہ ناممکن ہے کہ کوئی بغیر نمک کے زندہ رہے۔

لہٰذا نمک کی خصوصیات میں یہ اہم باتیں تھیں کہ اول تو اس کا ذائقہ نہیں بدلتا ہے، وہ ہر

حالت میں ایک سا رہتا ہے، دوئم یہ کہ یہ اشیاء کو سڑنے اور خراب ہونے سے بچاتا ہے۔ اس وجہ سے دنیا کی بہت سی تہذیبوں میں نمک اور وفاداری کو مشترک سمجھا جاتا ہے۔ برصغیر میں جس نے کسی کا نمک کھالیا تو اب اس پر یہ فرض ہو جاتا تھا کہ وہ اس سے وفادار رہے اور اسے نقصان نہ پہنچائے۔ اس پس منظر میں ''نمک حلال اور نمک حرام'' کی اصطلاحات کا رواج ہوا۔ معاشرہ میں اس شخص کی عزت نہیں رہتی کہ جس نے مالک کا نمک کھا کر اس سے غداری کی ہو۔ یہودیوں میں بھی توریت میں نمک کے بارے میں یہ ہے کہ اس پر معاہدہ کیا ہوا، خدا سے معاہدہ ہوتا ہے۔

نمک کی اس اہمیت اور استعمال کی وجہ سے کئی ملکوں میں اسے بطور تنخواہ دیا جاتا تھا۔ رومی فوجی بھی تنخواہ کا ایک حصہ نمک کی شکل میں پاتے تھے۔ لاطینی زبان میں ''سال'' (Sal) یعنی نمک فرانسیسی زبان میں سولاے (Solde) ہو گیا اور اس سے یہ سولجر بن گیا۔ ہندوستان میں بھی کئی علاقوں میں یہ تنخواہ کا ایک حصہ ہوتا تھا، اس لئے بھی وفاداری اس سے مشروط ہو گئی تھی۔

نمک کی اہمیت کا اس سے بھی اندازہ ہوتا ہے کہ بہت سے شہروں کے نام اس پر ہیں، جیسے زالس برگ (Salzburg)، سالٹ کوٹس (Salt Coats)، سالٹ لیک سٹی۔ ہال (Hal) کا قدیم جرنی میں مطلب نمک ہے اس لئے ہالے (Halle) ہالائن (Hallein) اور ہال اسٹاڈ (Hall Stadt) نمک کے سلسلہ میں مشہور ہیں۔ ان کے علاوہ چھوٹے چھوٹے قصبے اور گاؤں نمک کا نام لئے ہوئے ہیں

نمک کے استعمال، اس کی ضرورت، اور مانگ کو دیکھتے ہوئے دنیا کی مختلف حکومتوں نے اس پر ٹیکس لگا کر اپنی آمدنی کو بڑھایا۔ مثلاً قدیم چین میں نمک پر حکومت کی اجارہ داری ہوتی تھی، اس سے اسے جو آمدنی ہوتی تھی اس سے وہ فوجی اخراجات پورے کرتی تھی، کی (Qi) اور ہان (Han) حکمران خاندانوں کے عہد میں اسی کی آمدنی سے چین کی طویل دیوار تعمیر ہوئی۔ لیکن نمک پر ٹیکس کے خلاف عوام میں سخت غم و غصہ تھا، اسی وجہ سے 44 ق۔م میں حکومت نے اپنی اجارہ داری ختم کر دی۔ لیکن جب بعد میں فوجی مہمات کی وجہ سے جو اخراجات ہوئے تو دوبارہ سے ٹیکس کو نافذ کر دیا گیا۔ اس کے بعد سے ہم دیکھتے ہیں کہ چین کی تاریخ میں بجٹ کے اتار چڑھاؤ کے ساتھ ساتھ نمک پر اجارہ داری ختم اور قائم ہوتی رہی۔ عام طور سے لوگ اس کے خلاف رہے، اور اپنی نفرت کا اظہار بغاوتوں کی صورت میں کرتے رہے۔ 880 میں عوام نے بغاوت کرتے ہوئے

زیان (Xi'an) شہر پر قبضہ کر لیا۔ اس صورت حال میں سیاسی طور پر اس بحث کا آغاز ہوا کہ کیا ریاست کا یہ حق ہے کہ وہ طاقت اور قوت سے لوگوں کو مجبور کر کے ان سے روپیہ وصول کرے، اور کیا اس جابرانہ وصولی سے معاشرہ میں انتشار اور بے چینی نہیں پھیل جائے گی اور یہ ریاست اور عوام کو ایک دوسرے کا دشمن نہیں بنا دے گی۔

ریاست کے بارے میں اس نقطہء نظر کو ہم رومی حکومت میں دیکھتے ہیں کہ جو عوام کو سستے داموں نمک فراہم کرتی تھی، لیکن جنگ اور دوسرے ہنگامی حالات میں جب اسے پیسہ کی ضرورت ہوتی تھی، وہ اس پر ٹیکس لگا کر اخراجات پورے کرتی تھی۔ وینس میں تاجروں کی حکومت میں بھی نمک پر ٹیکس لیا جاتا تھا۔ اس کے بہت سے مجسمے اور دوسری پبلک عمارتوں کی تعمیر میں نمک کی انتظامیہ کا عمل دخل تھا کہ جس نے ان اخراجات کو پورا کیا۔ فرانس میں نمک کا ٹیکس (Gabelle) غیر مقبول تھا، اسی وجہ سے 1789 میں نیشنل اسمبلی نے اسے منسوخ کر دیا۔ جن ملکوں نے نمک کی تجارت سے بہت منافع کمایا ان میں وینس کے تاجر قابل ذکر ہیں۔ ان کے ساتھ ہی جنوا اور برما نے بھی اس تجارت سے فائدہ اٹھایا۔

امریکہ کے سلسلہ میں مصنف کا کہنا ہے کہ بہت سے امریکی قبائل جب نمک جمع کیا کرتے تھے تو یہ ان کے لئے ایک مقدس رسم ہوتی تھی۔ جو لوگ کے نمک جمع کرتے تھے ان کی راہنمائی مذہبی راہنما کرتا تھا، اور یہ صرف مردوں کے لئے مخصوص تھا کہ وہ نمک حاصل کریں۔ جب یہاں یورپی آباد ہوئے، تو ان کے درمیان نمک پر لڑائی جھگڑے ہوئے اور کئی جنگیں اس سلسلہ میں لڑی گئیں۔ امریکہ کی جنگ آزادی میں بھی اس کا اہم کردار رہا ہے۔ جب برطانیہ نے امریکی تجارت پر پابندی عائد کی تو بہت سے کالونیز نے اپنے استعمال کے لئے نمک بنانا شروع کر دیا۔ 1776 اور 1777 میں کانگریس کی کمیٹی نے یہ ہدایات دیں کہ نمک کے لئے دوسری قوموں پر انحصار نہیں کیا جائے اور اپنے لئے خود نمک بنایا جائے۔ آگے چل کر امریکہ کی خانہ جنگی میں بھی نمک کا حصہ رہا۔ جنوبی ریاستوں کو اس لئے بھی شکست ہوئی کہ ان کے ہاں نمک کی کمی ہو گئی تھی۔

برطانوی ہندوستان میں بھی نمک نے سیاست میں نمایاں حیثیت حاصل کی۔ انگلستان میں کانوں سے حاصل ہونے والا نمک ضرورت سے زیادہ ہوتا تھا، اس لئے اسے ملک سے باہر اس کے لئے منڈیوں کی ضرورت تھی۔ لیکن اڑیسہ کا نمک برطانوی نمک کے مقابلہ میں سستا تھا، اس

لئے وہاں اس کے لئے منڈی حاصل کرنا مشکل تھا۔ لیکن جب بنگال اور اڑیسہ پر برطانیہ کا اقتدار قائم ہوگیا تو حکومت نے نمک بنانے پر پابندی عائد کردی اور 1804 پر اس پر اپنی مکمل اجارہ داری قائم کرلی۔ اس کے خلاف 1817 میں ایک بغاوت ہوئی۔ لیکن حکومت نے نہ صرف اجارہ داری باقی رکھی، بلکہ نمک کی اسمگلنگ کو روکنے کے لئے بنگال میں جگہ جگہ چیک پوسٹس تعمیر کیں۔ 1888 میں حکومت کی اس پالیسی کے خلاف احتجاج ہوا۔ اور نمک کے ٹیکس کو غیر منصفانہ قرار دیا گیا۔ اس سلسلہ میں نمک کی اجارہ داری کے خلاف 1930 میں گاندھی جی کا وہ مارچ تھا جو انہوں نے راندی تک کیا اور وہاں جا کر نمک کے قانون کو توڑا۔

نمک کی اس تاریخ سے اندازہ ہوتا ہے کہ اشیاء کس طرح سے ہماری انفرادی اور اجتماعی زندگیوں پر اثر انداز ہوتی ہیں، اور تاریخی عمل میں حصہ لیتی ہیں۔ تاریخ کے ان گمشدہ پہلوؤں سے پردہ اٹھا کر مورخین نہ صرف تاریخ کے دائرے کو بڑھا رہے ہیں، بلکہ تاریخی عمل کو سمجھنے میں مدد دے رہے ہیں۔

فکشن ہاؤس کی نئی کتابیں

کتاب	مصنف / مرتب	قیمت
میرے ماہ وسال (یادداشتیں)	جاوید شاہین	120/-
عہد وسطیٰ کا ہندوستان	ہربنس مکھیا/ رشید ملک	130/-
جرمن لوک کہانیاں	شفیع عقیل	160/-
پنجاب کی سیاسی جدوجہد	بھگت سنگھ بلگہ/ یاسر جواد	100/-
رسل کی آپ بیتی	برٹرینڈ رسل/ قاضی جاوید	240/-
لوگوں کو سوچنے دو	برٹرینڈ رسل/ قاضی جاوید	150/-
شاہ عبداللطیف بھٹائی	ایچ۔ٹی۔سورلے/ پروفیسر ریاضی صدیقی	250/-
تلاشِ حق (نیا ایڈیشن)	مہاتما گاندھی	250/-
سہ ماہی تاریخ شمارہ نمبر (19)	ایڈیٹر: ڈاکٹر مبارک علی	100/-
کلیاتِ خلیل جبران	مرتب: حیدر جاوید سیّد	500/-
خلیل جبران کے عہد ساز افسانے	مرتب: حیدر جاوید سیّد	270/-
خلیل جبران کے عہد ساز ناول	مرتب: حیدر جاوید سیّد	190/-
خطوطِ خلیل جبران	مرتب: حیدر جاوید سیّد	90/-
خلیل جبران فلسفہ وحکایات	مرتب: حیدر جاوید سیّد	100/-
کلامِ خلیل جبران	مرتب: حیدر جاوید سیّد	90/-
اقوالِ خلیل جبران	مرتب: حیدر جاوید سیّد	90/-

نقطہ نظر

اکبر نامہ میں
تاریخ نویسی کا اسلوب اور تاریخی تعلیل*

بنیادی قالب

ابوالفضل کے اکبر نامے کا بیانیہ حصہ آدم (1) کے زمانے سے شروع ہو کر اکبر کے 43 ویں (2) سال جلوس تک کے واقعات پر مشتمل ہے۔ آدم سے آغاز کرنا ابوالفضل کے لئے وسطی زمانے کی محض ایک روایت ہی نہیں تھی۔ اس کے برعکس اکبر کے نسب نامے کو دنیا میں سب سے پہلے انسان سے (3) ملانے سے مصنف کا اصل مقصد اپنے مربی کو انسانی ترقی کے نقطہ عروج پر دکھانا تھا (4) اکبر نامے میں اکبر کے عہد سے پہلے کی تاریخ کے بیانیہ حصے کے اسلوب سے بھی ایسا ہی واضح ہوتا ہے۔ وہ اس حصے سے بڑی جلدی سے گزر جاتا ہے اور کبھی کبھی یہ کہتا بھی ہے کہ اس کا اصل مقصد اکبر اور اس کے عہد کے بارے میں لکھنا ہے (5)۔ اگرچہ اکبر کے اولین پیشترو (ہمایوں) کے احوال کا ذکر نسبتاً مفصل ہے مگر یہاں بھی محسوس ہوتا ہے کہ اکبری عہد کے مقابلے میں تاریخ کے اس حصے کو بھی وہ مسلسل ثانوی حیثیت دیتا ہے۔

ابوالفضل آدم اور اکبر کے درمیان رشتے کے ایک مبہم تصور سے آغاز کرتا ہے اور پھر ایسے دیگر تصورات کی طرح اس کی وضاحت بھی کرتا ہے۔ اس کے خیال میں اکبر تاریخ کے نقطہ عروج پر ہے اور یہاں سے وہ ماضی میں آدم تک کے واقعات پر نظر ڈالتا ہے۔ ہمارے لئے یہ امر بہت اہم ہے کیونکہ کسی عام تصور کو سچائی سمجھ کر پیچھے جانا ابوالفضل کا ایک عام سا طریق کار ہے جس کی بنا پر اس کا یہ عقیدہ ہے کہ اس کا یہ طریق کار بذات خود یہ ثابت کر دے گا کہ اس کا ہر قیاس بالکل درست ہے۔

---

* ترجے کے متن سے تقابل اور نظر ثانی کے لئے راقم محترم محمد اطہر مسعود کا مشکور ہے۔

اکبرنامے کی ترتیب جلوسی ہے یعنی اکبر سے پہلے ہر بادشاہ کے عہد حکومت کو ایک اکائی تصور کیا گیا ہے۔ ہر عہد حکومت کے ہر واقعہ کو ایک انفرادی حیثیت دی گئی ہے۔ حکومتوں کے ادوار کے سلسلہ وار بیان اور واقعات کے تسلسل کو ملحوظ خاطر رکھا گیا ہے۔ لیکن جب مصنف اکبر کے عہد حکومت میں پہنچتا ہے تو کتاب سالانہ وقائع کی صورت اختیار کر لیتی ہے اور پورے اکبری دور کے بجائے حکومت کا ہر سال ایک بنیادی اکائی بن جاتا ہے۔ وقوعے کے اعتبار سے ہر سال کے واقعات کو بالکل سلسلہ وار بیان کیا گیا ہے۔ اس سلسلے کو برقرار رکھنے کے لئے ابوالفضل کسی واقعہ کے تسلسل کو توڑ بھی دیتا ہے۔ اگر کسی واقعہ کا دورانیہ طویل ہو جاتا ہے اور اس دوران کچھ اور واقعات بھی رونما ہوتے ہیں تو ابوالفضل پہلے واقعہ سے آغاز کرتا ہے اور اس کے بیان کا سلسلہ وہاں منقطع کر دیتا ہے جہاں ایک نیا واقعہ رونما ہوتا ہے۔ اس واقعہ کو بیان کرنے کے بعد وہ پہلے واقعہ کو پھر بیان کرنے لگتا ہے (6)۔ یہ طریق کسی واقعہ کی بنیادی انفرادی نوعیت کو ہرگز متاثر نہیں کرتا۔ کسی مقام پر تسلسل کے ٹوٹنے کو دوسرے مقام پر باآسانی بحال کیا جا سکتا ہے۔ اس تسلسل اور وقوعے کی بنیادی حیثیت کو برقرار رکھنے کے لئے ابوالفضل کے اس سے پہلے اور بعد کے حوالے (7) بڑے مفید ثابت ہوتے ہیں۔

آئین اکبری پانچ (دفتروں) پر مشتمل ہے۔ پہلے دفتر کا تعلق شاہی عملے سے ہے۔ اس میں شاہی محل کے مختلف شعبوں کا بیان ہے جس میں دارالضرب (شاہی ٹکسال)، مصنوعات اور خوراک کی قیمتیں درج ہیں۔ اس میں فن خطاطی اور مصوری، سلاح خانہ، شاہی توپوں اور اصطبل کے احوال ہیں۔ آخر میں عمارت سازی کے سامان اور مزدوروں کے اجرتوں کا مفصل بیان ہے۔

دوسرے دفتر کا عنوان ہے سپاہ آبادی۔ اس میں فوج اور اس کے مختلف شعبوں اور تنخواہوں کے ضابطوں کا احوال ہے۔ کتاب کے اس حصے میں سیورغال یا زمین کے عطیات اور خیرات کے قواعد وضوابط ہیں اور تیسرے شعبے کا تعلق تعلیم سے ہے۔ شاہی تفریحات کا ذکر علیحدہ کیا گیا ہے۔ اس میں دس ہزاری سے لے کر 200 تک کے منصب داروں (اعیان سلطنت)، اس زمانے کے (علما وفضلائے سلطنت) یعنی زاہدوں، اہل علم، شاعروں اور موسیقاروں کی فہرست ہے۔

کتاب کے تیسرے دفتر کا آغاز ان تقویموں سے ہوتا ہے جو مختلف اوقات میں دنیا کے مختلف عہدوں پر فائز کئے جاتے تھے مثلاً فوج دار، میر عدل، کوتوال وغیرہ، اور ان کی ذمہ داریاں

اور فرائض کا ذکر ہے جو یہ عہدے دار ادا کرتے تھے۔ پھر زرخیزی پر مبنی زمین کی چار اقسام کا ذکر ہے جنہیں مالئے کے لئے سرکاری طور پر تشخیص کیا جاتا تھا اور اس کے ساتھ ہی مختلف صوبوں میں ربیع اور خریف کے مالیات کے جدول ہے جو انیس برسوں (اکبر کے چھٹے سے چوبیسوں سال) تک سلطنت کے مختلف صوبوں میں مروج تھی۔ پھر وہ فصل آتی ہے جیسے آئین دہ سالہ کہا گیا ہے۔ آئین دہ سالہ کے بعد مالئے کی وہ شرحیں ہیں جو چوبیسویں سال جلوس کے بعد سلطنت کی مختلف سرکاروں میں رائج ہوئیں۔ سب سے آخر میں بارہ (فی الواقعہ 15 صوبوں) کا ذکر ہے۔ ہر صوبے کی جغرافیائی اور اقتصادی حالات کا بیان ہے اور ساتھ ہی ان کا مفصل تاریخی جائزہ ہے۔

کتاب کے چوتھے حصے کا تعلق ہندوؤں کے علوم جیسے نجوم، طب، فلسفہ، وغیرہ کے متعلق تصورات، رواج اور ادب سے ہے۔ یہ کتاب کا کمزور ترین حصہ ہے۔ اس کمزوری کی وجوہات دو قسم کی ہیں۔ مصنف نے صرف مختلف اوقات میں نقل کی ہے اور اس کی ہندو فلسفے کے مختلف مکاتب (خصوصاً علم طب) اطوار اور رواجوں کے لئے اس وقت مروج ناقص اور ثانوی مآخذ پر انحصار کیا ہے (8)۔ ان معاملات کی وضاحت کے لئے اس نے اپنے ہم عصر اہل علم سے رجوع کرنے کی کوشش نہیں کی اور نہ ہی اپنے زمانے کے ہندو معاشرے کو بیان کیا ہے (9)۔ اگر وہ ایسا کر جاتا تو یہ آج کل کے مورخوں کے لئے بڑا سودمند ہوتا۔ اس معاملے میں صرف ایک استثنا ہے یعنی جب وہ اپنے زمانے کے راجپوت قبیلوں کا ذکر کرتا ہے۔

پانچواں دفتر (حصہ) اکبر کے دانشمندانہ اقوال (ایک باب) اور خاتمے پر مشتمل ہے جس کے ساتھ ہی خود ابوالفضل کی سوانح شامل ہے۔

مشمولات

آئین کے علاوہ اکبرنامے میں سیاسی واقعات کے بیان کی حدود کے اندر رہتے ہوئے کئی موضوعات پر وسیع معلومات ملتی ہیں۔ ان کا تعلق اکثر میدان جنگ، اور اس میں اختیار کی جانے والی جنگی تدبیروں، افواج کے کمانداروں وغیرہ سے ہے (10)۔ کہیں کہیں دوسرے ممالک اور علاقوں کے متعلق اطلاعات بھی ملتی ہیں (11)۔ اور کبھی کبھی سیاسی واقعات سے متعلق افراد کے تعارف اور شجرہائے نسب بھی نظر آتے ہیں (12)۔

جنگوں اور اسی قسم کے واقعات کے علاوہ مصنف علاقے کے جغرافیئے (13)، ہاتھیوں (14) یا نجوم (15) کے متعلق بھی معلومات فراہم کرتا ہے۔ یہ اطلاعات ان واقعات کا حصہ ہیں جو ابوالفضل کے زمانے میں پیش آئے۔ مثلاً جب وہ ایک مشکل ہاتھی پر اکبر کی سواری کا بیان لکھتا ہے تو وہ ضمنی طور پر ان ہاتھیوں کا ذکر بھی کرتا ہے جن پر اکبر سواری کیا کرتا تھا (16)۔ اسی طرح جب وہ کسی شہزادے کی پیدائش کا ذکر کرتا ہے تو وہ مختلف اجرام فلکی کے نظاموں کو بھی بیان کر دیتا ہے جن کے مطابق اس شہزادے کے زائچے تیار کئے جاتے تھے (17)۔

آئین کی نوعیت اکبرنامے کے بیانیہ حصے سے بالکل مختلف ہے۔ اس کا خصوصی مقصد معلومات کا ایک ذخیرہ فراہم کرنا ہے۔ بحیثیت ایک مرتب اور مدیر کے آئین میں ابوالفضل اپنی پوری صلاحیتوں کو بروئے کار لاتا ہے۔

اپنی نوعیت سے محدود ہونے کی بنا پر سارے اکبرنامے میں ان اشخاص اور رویوں کے متعلق ضمنی حوالوں کی عموماً کمی ہے جو اکبر اور اس کے دربار پر مرکوز سیاسی احوال کی روایت سے باہر ہیں۔

مراجع کے متعلق رویہ

ابوالفضل عادتاً ان مآخذ کی جن سے وہ خصوصی معلومات اخذ کرتا ہے نشاندہی بہت کم کرتا ہے۔ تاہم وہ تمام اطلاعات کے جمع کرنے کے طریقے کا ایک عمومی ساذکر کرتا ہے (18)۔

1- اکبر کے متعلق تمام حالات و واقعات کو اکٹھا کرنا۔

2- دربار کے ملازموں اور شاہی خاندان کے عمر رسیدہ لوگوں سے لمبی تفتیش کے بعد مصنف کا ان کے بیانات کو ضبط تحریر میں لانا۔

3- پوری سلطنت میں پھیلے ہوئے تمام عمر رسیدہ ملازموں کو حکم دینا کہ ماضی کے واقعات میں جو کچھ انہیں یاد ہے، بیانات اور یادداشتوں کی صورت میں قلم بند کر کے مصنف کو پہنچائیں (19)۔ اس تمام مواد کو ترتیب وار اکٹھا کر کے سب سے پہلے اکبر کو پڑھ کر سنایا جاتا تھا۔ اس کے استعمال کی اجازت پہلے اکبر دیتا تھا۔ اس کے بعد حاصل ہونے والی تفصیلات کو ابوالفضل خود ہی (بغیر اکبر کی اجازت کے) کتاب میں شامل کر لیتا تھا۔

4- انیسویں سال جلوس میں اکبر نے ایک ریکارڈ آفس (لغوی اعتبار سے واقعات کا رجسٹر) قائم کیا جس میں اس سال کے بعد سارا ریکارڈ محفوظ رکھا جاتا تھا۔

5- اکبر کی تخت نشینی کے بعد اور ابوالفضل کے لکھنے کے دوران سلطنت کے تمام مختلف اقطع کو جاری ہونے والے حکم ناموں کو مصنف نے اصلی یا ان کی نقول کی صورت میں اکٹھا کرنا۔

6- سلطنت کے مختلف حصوں اور دیگر ممالک کے متعلق واقعات کے متعلق وزراء اور اعلیٰ افسران کے پیش کردہ محضروں کو بھی اکٹھا کرنا۔

7- ابوالفضل نے باخبر اور عقل مند آدمیوں سے یادداشتوں اور مسودات کو بذات خود جمع کرنے کی بھی کوشش کی۔ ان کے علاوہ وہ خود اپنی (20) اور اپنے والد (21) کی گواہی کو بھی بطور مآخذ پیش کرتا ہے۔ کبھی کبھی وہ اپنے مخبروں کو بھی اپنے مآخذ میں شامل کر لیتا ہے (22) اور سنی سنائی باتوں اور کچھ افراد کے خوابوں کو بطور مآخذ استعمال کر لیتا ہے۔ (23)

اکبر نامے کے بیانیہ حصے اور آئین میں بھی اطلاعات کا کافی حصہ ایسے مآخذ سے لیا گیا ہے جن کا وہ بالصراحت اعتراف نہیں کرتا۔ ان میں نہ صرف وہ یادداشتیں شامل ہیں جو اس کے لئے تیار کی گئیں بلکہ ان کے علاوہ کچھ اور بھی ہیں۔ جبرٹ کو بھی سرقے کی یہ کمزوری نظر آئی۔ ''جن مآخذ کو اس نے استعمال کیا ہے ان کا اعتراف اس نے کبھی نہیں کیا۔ یہ امر بذات خود اتنا اہم نہیں اس کے مآخذ کا ذکر اس کے کام کے ڈیزائن کی وحدت کو ختم کر دیتا اگر بصورت دیگر وہ دوسروں کی محنت کو اپنے کام اس لئے شامل کر لیتا کہ اس پر ابتکار کی مہر لگ سکے۔ مگر وہ دوسروں کی عبارتوں کو بلا خوف اور سرقہ کے الزام سے بالکل بے پرواہ لفظ بلفظ (ہی نہیں) اٹھا لیتا'' (24)۔ یہ ذہن میں رکھنا چاہئے کہ جیرٹ کا یہ الزام آئین کے صرف تیسرے دفتر پر ہی عائد ہوتا ہے جہاں وہ البیرونی پر پورا پورا انحصار کرتا ہے جیسا کہ اسے فارسی میں رشید الدین نے پیش کیا ہے (25) مجموعی طور پر یہ الزام مبالغہ آمیز ہے۔ ابوالفضل کم از کم اپنے مآخذ کے الفاظ تو بدل دیتا ہے۔ اور پھر اس الزام میں اپنے ہم عصروں اور ان کے بعد آنے والے مورخوں میں وہ اکیلا ہی نہیں ہے۔

اکبر نامے کا پیرا وار تجزیہ اور تمام مآخذ کی نشاندہی ایک ناممکن سی بات ہے۔ کچھ مثالوں سے یہ واضح ہو جائے گا کہ مصنف نے معلومات اکٹھی کرنے میں تو بڑی محنت کی ہے لیکن اپنے مآخذ کا کبھی اعتراف نہیں کیا۔ مثال کے طور پر آئین میں ہندوؤں کے ادب پر باب میں

ابوالفضل ادبی اصناف کی تعریفیں وشوناتھ کوی مہراج کی ''ساھیتو درپن'' سے لیتا ہے(26) اوران کی مثالیں درج کرتا ہے(27) ہندوؤں کے نظام عدل پر باب(28) ''منوسمرتی'' کے اس موضوع پر باب سے بہت ملتا جلتا ہے(29)۔ سرکار کابل کی بیشتر تفاصیل(30) بابر کی توزک(31) سے لی گئی ہیں۔ ابوالفضل اکبرنامے کے بیانیہ حصہ میں ہمایوں کے لئے امراء کی وفاداری کی قسم کا ذکر کرتا ہے بشرطیکہ ہمایوں بھی ان امراء کے حق میں حلف وفاداری اٹھائے(32) اس معاملے میں مصنف کا مآخذ جوہرآفتابچی ہے(33)۔ اکبرنامے میں ہمایوں کے دربار میں سر عام کامران کی توہین(34) کی بات بایزید کے ''تذکرہ ہمایوں واکبر'' سے لی گئی ہے(35) اس کے برعکس کئی جگہ جہاں مصنف نے اپنے مآخذ کا اعتراف کیا ہے اگرچہ اہمیت کے اعتبار سے ان کی تعداد کچھ زیادہ نہیں، مگر اس نے اپنے مآخذ کی کوئی تفصیلات فراہم نہیں کیں۔ اس قسم کا ایک حوالہ خواجہ شمس الدین خوافی کا ہے۔ ابوالفضل اس کا ذکر کرتا ہے اور اس کی شہادت بھی نقل کرتا ہے لیکن اس کی کتاب کا کوئی حوالہ نہیں دیتا اور نہ ہی وہ وضاحت کرتا ہے کہ شہادت زبانی تھی (یا تحریری)(36)۔

اپنے مآخذ کے استعمال میں شہادت کے الفاظ یا شہادت کے لہجے میں ابوالفضل کا تبدیلیاں کرنا بہت دلچسپ ہے۔ اس عمل سے شاہی فرمان بھی محفوظ نہ رہ سکے۔ مثال کے طور پر ہمایوں کے خراسان پہنچنے(37) پر شاہ طہماسپ کے خراسان کے گورنر کے نام فرمان کو وہ غالباً بایزید کی کتاب سے پوری نقل کرتا ہے(38) لیکن نقل کرتے ہوئے وہ فرمان میں کئی جگہ تبدیلیاں بھی کرتا ہے اور کچھ الفاظ بھی حذف کر دیتا ہے۔ مثلاً ہمایوں کی پذیرائی کرنے والوں کی فہرست میں تین نام مزید داخل کر دیتا ہے اور شاہ طہماسپ کا اپنے والد کو دیا ہوا لقب ''جنت آشیانی'' حذف کر دیتا ہے۔ اسی طرح ہمایوں کے القاب میں سے وہ ''صاحب دیو و پری'' کا لقب بھی حذف کر دیتا ہے(39)۔

کئی اور جگہ ابوالفضل امراء کے نام اکبر کے فرمانوں کا خلاصہ اپنے الفاظ میں بیان کرتا ہے(40) یہ بھی اہم ہے کہ اس کے اپنے والد کا تیار کردہ محضر کا آخری مسودہ اکبرنامے میں درج نہیں کرتا اور اپنے الفاظ میں اس کا خلاصہ درج کر دیتا ہے(41)۔ کسی دستاویز کا خلاصہ کرنا اور پھر اپنے الفاظ میں پیش کرنے کا عمل مصنف کے لئے اس کی ضرورت کے مطابق تحریفات کی مزید

اکبر نامے میں تاریخ نویسی کا اسلوب اور تاریخی تعلیل

ابوالفضل کی نظر میں واقعات کو سلسلے وار لکھنے کا نام تاریخ ہے(56)۔اگر چہ تاریخ کی یہ تعریف غیر مبہم ہے مگر اس تعریف پر ابوالفضل کی استقامت صرف جزوی ہے۔راویتی معنی میں اکبر نامہ دنیا کے واقعات کا ریکارڈ نہیں۔چند وجوہ کی بنا پر حبوط آدم سے اس کا آغاز اسے تاریخ عالم کہلانے کا مستحق قرار نہیں دیتا کیونکہ اول، جب تک ابوالفضل مغلیہ دور تک نہیں آتا وہ ناپختہ تصورات اٹھالیتا ہے اور انہیں بطور تاریخی حقائق کے پیش کر دیتا ہے(57)۔دوم، اکبر کے دور کے پہلے کے واقعات ایک خاص مقصد کے تحت بیان کئے گئے ہیں تا کہ ایک ایسا مسخ شدہ اور تخیلاتی پس منظر میسر آجائے جس سے اکبر کا تفوق ابھر سکے۔اس طرح وہ تاریخ عالم یعنی واقعات عالم نہیں لکھ رہا۔اس کے عین برعکس اکبر اور اس کے دربار سے مکمل طور پر متاثر ہو کر وہ محسوس کرتا ہے کہ آغاز انسانیت سے اب تک یہ طمطراق سب سے زیادہ شاندار ہے۔یہ ثابت کرنے کے لئے وہ آدم سے شروع ہونے والی تاریخ پر نظر ڈالتا ہے(58)۔مختلف جگہوں پر وہ خود اعتراف کرتا ہے کہ ایسا کرنے میں وہ بڑی جلدی میں ہے(59) اس عمل میں یا تو اپنی لاعلمی یا اپنی سہولت کی بنا پر وہ نیم پختہ تصورات کو اکٹھا کر کے انہیں تاریخی حقائق کے طور پر پیش کر دیتا ہے۔

چنانچہ اس کے لئے توقف کا مقام اکبر کا عہد حکومت ہے جہاں سے وہ اپنی نظر پیچھے دوڑاتا ہے۔اکبر نامے کا ہر لفظ بالواسطہ یا بلاواسطہ شہنشاہ کی ذات یا اس کی سلطنت یا اس کے عہد حکومت سے متعلق ہے۔یہاں تک کہ دوسری سلطنتوں کے حوالے جو پوری کتاب میں بکھرے ہوئے ہیں، صرف اسی بنیاد پر اکبر نامے میں شامل ہوئے ہیں(60)۔

اسی طرح اکبر نامہ لکھنے میں ابوالفضل کی زیادہ سے زیادہ خدمات اکبر کے عہد کی تاریخ پر مشتمل ہیں۔ان میں آئین میں دی گئی معلومات بھی شامل ہیں۔یا پھر زیادہ سے زیادہ مغل شاہی خاندان کی تاریخ ہے جس کا دورانیہ ماضی سے لے کر اکبر کے دور میں تادم تحریر ہے۔

واقعات کے تاریخ وار سلسلے کی جس کا ذکر ابوالفضل کرتا ہے، پیروی وہ کتاب کی آخری دو مطبوعہ جلدوں تک کرتا ہے۔یہ امر بھی اسی حقیقت سے متناسب ہے کہ مصنف پہلی جلد میں کئی فارمز کو اکبر کے عہد حکومت تک پہنچنے کی جلدی میں نظر انداز کر دیتا ہے۔اس کی تاریخ کی اپنی

تعریف سے انتہائی انحراف کی صورت صرف واقعات کو ریکارڈ کرنے میں نہیں بلکہ ان کی تعلیل کی وضاحت میں ہے۔

تاریخ میں تعلیل یا تسبیب کی وضاحت کے لئے ابوالفضل کوئی اصول وضع نہیں کرتا۔ وہ تعمیمات ضرور پیش کرتا ہے لیکن وہ انہیں انفرادی واقعات سے اخذ کرتا ہے۔ اس لئے وہ اتنی جامع نہیں ہوتیں جو تاریخ میں تعلیل، دو یا دو سے زیادہ واقعات یا ریاست اور معاشرے اور ان کی ساخت اور ان سے متعلق واقعات کی نوعیت کی تسبیب یا ان کے درمیان تعلیلی تعلق کی مکمل تشریح کر سکیں۔

اگر ہم ابوالفضل کے اسلوب کا تجزیہ کریں تو یہ امر بالکل واضح ہو جاتا ہے کہ ابوالفضل تاریخ کو کسی شخص یا ادارے سے بالواسطہ یا بلاواسطہ واقعات کا مجموعہ سمجھتا ہے۔ کسی استثنا کے بغیر وہ واقعات کو ان الفاظ سے شروع کرتا ہے: ''ایک واقعہ یہ بھی تھا۔ . . '' تاہم ہر واقعہ کے بیان میں کوئی اخلاقی سچائی یا اخلاقی سبق ضرور ہوتا ہے۔ ابوالفضل عموماً ہر واقعہ کے بیان کا ایک پیش لفظ لکھتا ہے جیسے ہم اس واقعہ کا مقدمہ کہہ سکتے ہیں۔ ایسا کرنے میں اصل واقعہ اس کی ایک مثال بن کر رہ جاتا ہے۔ اگر وہ ایسا نہ کر سکے تو وہ واقعہ بیان کر دیتا ہے اور اس سے کوئی نہ کوئی اخلاقی سبق اخذ کرتا ہے۔ عملی طور پر پیش کرنے میں اخلاقی سبق کو لاحقے یا سابقے کے طور پر استعمال کرنے میں وہی ہوتا ہے کیونکہ تعمیم کی مشمولات ہمیشہ ایک سی رہتی ہیں۔ بے شمار مثالوں میں سے چند درجہ ذیل ہیں:

''بنی نوع انسان کی خوش بختی سے اگر سچائی کے مجموعی ادراک کا وقت آن پہنچے تو بادشاہ کے بلند وقار کی بنا پر لوگ اس سے رجوع کرتے ہیں اور اس طرح بادشاہ ان کا روحانی پیشوا بھی بن جاتا ہے۔ کیونکہ کسی دخل اندازی کرنے والی قوت سے بے نیاز بادشاہ کی ذات سے ایک شعاع حکمت نکلتی ہے جس سے دلوں سے دوئی دور ہو جاتی ہے۔ کبھی وہ کثرت میں وحدت دیکھتا ہے اور کبھی اس کے برعکس وحدت میں کثرت کیونکہ وہ اپنے جلالی تخت پر بیٹھتا ہے اور غم اور خوشی سے لاتعلق ہوتا ہے۔ یہی معاملہ ہمارے عہد کے بادشاہ کا ہے اور یہ کتاب اس کی شہادت دیتی ہے (61)۔

یا، چیتے کی رکھوالی کرنے والے کو زبردستی جوتے چرانے پر موت کی سزا کے جواز کے حوالوں سے ابوالفضل کہتا ہے ''یہ واقعہ دنیا داروں کو ایک تنبیہ اور جہالت کے صحرا کے وحشیوں کے لئے

ایک سبق کی اہمیت کا حامل ہے۔ اس علاقے میں یہ واقعہ مشہور ہو گیا اور اس کے بعد دوسروں کا نقصان کرنے یا اس کے بعد فرار ہونے کا کبھی کسی نے نہیں سوچا۔ اس سے سلطنت میں امن چین قائم ہو گیا (62)۔

یا، ''اگر چہ قابل لوگ فرائض کی ادائیگی میں جدوجہد کی اہمیت کو سمجھتے ہیں تاہم دور اندیش لوگوں کو معلوم ہے کہ اکثر معاملات میں اعلیٰ مقاصد کا حصول دنیا کے حکمرانوں کی نیک نیتی پر اور مناسب عمل سے منسلک ہے۔ ماضی کی عظیم مہمات کے شاہدوں کو معلوم ہے کہ کامیابی ابتدائی ناکامیوں کے بعد ہی حاصل ہوتی ہے۔ دوسری کوشش کے بغیر مقصد حاصل نہیں ہوتا۔ اسی بنا پر خوش بختی کے تخت پر متمکن (اکبر) بڑی احتیاط سے ہر معاملے پر غور کرتا ہے اور کسی مشقت کے بغیر نتیجے پر پہنچ جاتا ہے۔ یہ ان سب پر عیاں ہے جو اس ابدی عہد حکومت کے حالات و واقعات سے پوری طرح آگاہ ہیں۔ اس کی تازہ مثال بھکر کی فتح ہے'' (63)۔

ایسی تعمیمات تصنع سے پاک نہیں ہیں۔ ان میں سے ہر ایک کسی نہ کسی خاص واقعہ سے متعلق ہے اور صرف اسی کے لئے موزوں ہے۔ عمومی اصولوں کا عظیم الشان فریم ورک جو نظر آتا ہے کسی واقعہ کے پس پردہ یا اس سے مشتق ہے، اور اصل میں ایک معکوس ماحصل ہے۔ مراد یہ ہے کہ ابوالفضل اس واقعہ کو بخوبی جانتا ہے جیسے وہ بیان کرنے لگتا ہے اور اس واقعہ کے بارے میں اپنے علم پر مبنی تعمیمات وضع کرتا ہے۔ مثال کے طور پر جیسا کہ آئندہ صفحات سے واضح ہوتا ہے، بادشاہ کی روحانی پیشوائی کے متعلق ابوالفضل کی پُر جوش تحریر اصل میں اکبر کے توحید الٰہی (نام نہاد دین الٰہی) کے اعلان کا مقدمہ ہے۔ چنانچہ اس مقدمہ کا تعلق صرف اکبر سے ہے۔ ایسی کوئی شہادت نہیں ملتی کہ ابوالفضل کسی بھی بادشاہ کی روحانی پیشوائی کو نظریاتی طور پر قبول کر لیتا ہو لیکن وہ اکبر کو دونوں طرح یعنی نظریاتی اور عملی طور پر اس صورت میں قبول کر لیتا ہے۔ اسی طرح یہ تعمیم کہ پہلی کوشش کی ناکامی کے بعد دوسری کوشش سے ہی کامیابی کا حصول ممکن ہے، بھکر کے حاکم سے ہی متعلق ہے جہاں پہلی کوشش ناکام ہوئی تھی (64) چنانچہ یہ ایسا قضیہ نہیں جس کا اطلاق ہمیشہ ہر صورت حال پر ہو سکے۔

اہم یہ ہے کہ جہاں ابوالفضل کا مختلف حالات اور واقعات سے واسطہ پڑتا ہے ان واقعات کے متعلق اس کی تعمیمات بھی مختلف ہوتی ہیں مثلاً ایک جگہ وہ کہتا ہے کہ شہنشاہ میں آٹھ ضروری

صفات ہونا لازمی ہے: خوش بختی، بے مثال حوصلہ مندی، قوت تسخیر، انتظامی صلاحیتیں، اللہ والوں کی فلاح و بہبود کے متعلق نیک خواہشات، فوج کو عزیز رکھنا اور انہیں بربادی سے باز رکھنا (65)، تو اس کی نظر میں اکبر کی صلاحیتیں ہی ہو سکتی ہیں یا تھیں۔ لیکن جب وہ کہتا ہے کہ ''بادشاہت خداوند تعالیٰ کا عطیہ ہے'' اور بادشاہ کی صلاحیتوں میں عالمگیر صلاحیت امن کو قائم کرنا اور انسانیت کے تمام فریقوں اور مذاہب کے تمام فرقوں کو ایک ہی آنکھ سے دیکھنا ہے (66) نہ کہ ایک کو سگی اور دوسری کو سوتیلی ماں خیال کرنا، وہ کوئی عمومی نظریہ وضع نہیں کر رہا بلکہ ان اوصاف کو شمار کر رہا ہے جو اسے بطور حکمران اکبر میں نظر آئیں۔

اسی طرح اپنے بدخواہوں اور خود اپنے حوالے سے ابوالفضل انسانوں کو چار زمروں میں تقسیم کرتا ہے ''اول، سیاہ قلب اور سرکش جو کسی تنبیہ کو خاطر میں نہیں لاتے اور اسے سن کر دل میں اترنے نہیں دیتے۔ دوم، شیطانی فطرت کمینے لوگ جو اپنی جہالت کو بڑا صحت مند خیال کرتے ہیں۔ سوم، روشنی کی تلاش میں معقول حد تک تخلیق کی ہوئی فطرت والے لوگ جو حسد کے شیطانی گروہ سے اور جہالت کے اندھے کنویں سے بھاگ کر سلامتی تلاش کرتے ہیں لیکن اپنے بدنصیب ستاروں کی وجہ سے اعلیٰ علم حاصل نہیں کر سکتے اور جن کے لئے عقل کی خلوت گاہ میں مستور حسن کبھی کبھار ہی دکھائی دیتا ہے۔ چہارم، وہ خوش بخت بلند مرتبہ شخص جو علم کے خزانے کے ساتھ باوقار روح اور غیر معمولی فطری ذہانت کا مالک ہے اور جو گہری بصیرت کے زور پر آگے بڑھتا ہے'' (67)۔ لیکن جب گھوڑوں کے داغنے پر اکبر کے امراء کی مزاحمت کا ذکر کرتا ہے تو وہ تمام انسانیت کو ایک واحد عنوان کے تحت اکٹھا کر دیتا ہے۔ ''انصاف پسند شاہدوں سے یہ راز داری کے پردے میں پنہاں نہیں کہ انسان پر حسد اور غصے کا غلبہ ہوتا ہے۔ جو اسے دربار سے ملتا ہے وہ اسے اپنے ماتحتوں کو نہیں بتاتا اور مزید حریص ہو جاتا ہے۔ اس کا ماتحت اس کی خوش بختی کے سر پر بے وفائی کی دھول چھڑکتا ہے اور ایسے کام کرتا جیسے وہ خود ہی اپنا مالک (افسر) ہو'' (68)۔

کئی جگہ ابوالفضل ایک ہی واقعہ کی کئی توجیہیں کرتا ہے۔ مثال کے طور پر جب ہیمو دہلی کے قلعے کا محاصرہ کئے ہوئے تھا اور تردی بیگ وہاں سے بھاگ نکلا تو مصنف کہتا ہے ''اعمال نامے لکھنے والے کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ تردی بیگ کی یہ توہین جلالتہ الملک جہانبانی جنت آشیانی (ہمایوں) کے ساتھ اس کی ایران روانگی سے پہلے اس کی بیوفائی کا کفارہ تھی۔ نعوذ باللہ بے وفائی

کے لئے ایسا کفارہ! کیا ایسی توہین کو انصاف کے ترازو میں اس بے شرم فعل کے پاسنگ کے طور پر رکھا جاسکتا ہے؟ ملک العصر کو جو ایک لڑکے کے روپ میں دیدنی اور نادیدنی کی تکمیل کے لئے آیا تو اس نے اس کا کوئی لحاظ نہ کیا اور اپنی گستاخی کی بنا پر اپنی بڑائی جتانے کی کوشش کی۔ دنیا کو مزین کرنے والے خداوند تعالیٰ نے خود اپنی تعریف کرنے والے کو یہ سزا دی۔ افسوس یہ کتنی کوتاہ اندیشی تھی۔ لیکن خداوند تعالیٰ کے حکم کو نافذ کرنے والوں نے شہنشاہ کی عظمت کے اظہار کے لئے ہیموں کی گستاخی اور بدمستی کو مزید بڑھاوا دیا تا کہ غرور کی پرستش کرنے والے کوتاہ اندیش بدمستوں کی نظر میں جن سے یہ دنیا بھری پڑی ہے، وہ عظیم نظر آئے۔ بعد میں وہ پکڑا گیا شرم کی دھول میں ملا دیا گیا تا کہ یہ ذلت کوتاہ اندیشوں کی آنکھوں کا سرمہ بن جائے'' (69)۔

بیرم کے قتل پر تبصرہ کرتے ہوئے ابوالفضل کہتا ہے کہ ''مجھے معلوم نہیں کہ یہ اس کے پچھلے اعمال کی سزا تھی یا اس کا ذہن شیطانی خیالات سے آلودہ تھا یا اس کی دعائیں مقبول ہوئیں یا خدا کی مہربانی نے اس اچھے آدمی کو ذلت کے بھاری بوجھ سے چھٹکارا دلا دیا'' (70)۔

بیشتر مقامات پر ٹھوس تاریخی حقائق کو مزین کرنے میں شاید یہ ادبی افسانہ طرازیاں ہیں۔ لیکن جیسا کہ پہلی مثال سے واضح ہوتا ہے یہ تکلیف دہ حقائق یا مظاہر کی اہمیت کو کم کرنے کی کوشش ہیں۔ اس خیال کو اس حقیقت سے مزید تقویت ملتی ہے کہ ایسی وضاحتیں بالعموم تاریخی ہونے کے مقابلے میں کسی قدر زیادہ پُراسرار قسم کی ہیں۔ ابوالفضل اس قسم کے پُراسرار استدلال کو اکثر اس وقت اختیار کرتا ہے جب اسے پریشان کن، بے موقع یا بے وقت حقائق یا مظاہر کی وضاحت کرنی ہو یا ان کی اہمیت کو کم کرنا ہو۔ مثال کے طور پر وہ بڑی استقامت اور وفاداری سے اپنے تعمیر کردہ نظریئے پر قائم رہتا ہے کہ اپنی حکومت کے پہلے پانچ برسوں میں اکبر نے اپنے چہرے پر نقاب ڈال لیا تھا جس کے عقب سے خفیہ طور پر اس نے فرداً فرداً ہر شخص کے کردار کا اندازہ لگا لیا تھا (71)۔ اس سے اس دور میں اکبر کی سیاسی بے عملی کی وضاحت ہو جاتی ہے۔ ایک اور جگہ ابوالفضل اس واقعہ کو بیان کرتا ہے جب وہ ہاتھی جس پر اکبر سوار تھا ایک کھائی میں گر جاتا ہے۔ چھٹکارا حاصل کرنے کے لئے ہاتھی نے شہنشاہ کے ''مقدس جسم'' سے نجات پانے کی کوشش کی۔ اکبر کو کچھ ''چوکس، وفادار اور دلیر'' افراد نے بچالیا۔ لیکن اس موقع پر ابوالفضل فیصلہ کن انداز میں کہتا ہے: ''میں نہیں جانتا کہ آیا دہشت کے روپ میں جمال نے ایسا جلوہ دکھایا تا کہ الوہی

سرپرستی کی موجودگی میں شرپسندوں کے دوررس ارادے خاک میں مل جائیں یا خفی اور جلی کے فرمانروا اور مرئی اور غیر مرئی مخلوق کے بادشاہ نے سوچے سمجھے منصوبے کے تحت ایسی شان دکھائی کہ شرپسندوں کی بے بصری اور اہل وفا کی روشن ضمیری صرف ایک ہی واقعہ سے آشکار ہو جائے'' (72) جیسا کہ پہلے کہا جا چکا ہے، اگرچہ ابوالفضل تاریخی تعمیمات کا کوئی بنیادی تصور تو تشکیل نہیں دیتا مگر چند مفروضوں کی حدود میں رہتے ہوئے وہ فرداً فرداً تاریخی واقعات کی تشریح ضرور کرتا ہے۔ اس کے لئے یہ مفروضے عیاں بالذات اور ٹھوس حقائق ہیں۔ کسی ایک واقعہ کی تشریح کے لئے وہ ایک مفروضہ قائم کرتا ہے اور پھر اسی واقعہ کو مثال کے طور پر پیش کر دیتا ہے جیسے وہ اس مفروضے کا ثبوت سمجھتا ہے۔ یا وہ ایک مفروضہ قائم کرتا ہے اور اس کی صراحت کرتا ہے اور اسی صراحت کو وہ اسی مفروضے کے اصلیت کا ثبوت سمجھتا ہے۔ مثال کے طور پر وہ کہتا ہے: ''چونکہ عدل وانصاف کا طریقہ اور علاقوں پر فتح حاصل کرنے کے اصول کے پیش نظر یہ لازمی ہے کہ جب کسی ملک کا حکمران یا کسی صوبے کا گورنر لہو ولعب میں مشغول ہو جائے اور اپنا قیمتی وقت ہوا وہوس میں گزار دے اور اپنی رعایا کی پرورش اور مظلوموں کی دلجوئی اور ظالموں کی بیخ کنی نہ کرے تو اپنے زمانے کے بادشاہ کو جسے قادر مطلق نے فتح یابی کی قوت دی ہے اور جسے دنیا اور انسانوں پر بادشاہت عطا کی ہے، اللہ کے حضور اظہار تشکر کے طور پر ایسے ظالم کی بیخ کنی کی کوشش کرنی چاہیے اور اس علاقے کے لوگوں کو انصاف پسند اور مصلحت اندیش حکمران کے سپرد کر دینا چاہئے اور اسے پہلے سے مخصوص کردہ تعلق قلبی کا عنوان سمجھنا چاہئے۔ اس اصول پر عمل کرتے ہوئے جو مسلم حقیقت پر مبنی ہے، اس مبارک سال (اکبر کے حکومت کے پانچویں برس) میں جب سازشی کشمیروں کی شورش اور ہل چل اور کشمیر کے گورنر غازی خان کی بے انصافیوں کی اطلاعات اکبر کے مبارک کانوں تک پہنچیں، تو حکم صادر ہوا کہ ایک فوج مرزا قرا بہادر کے زیر کمان روانہ کی جائے۔ . . کشمیر کی فتح کے لئے'' (73)۔

یا، ''یقیناً بغیر کوشش کے حکومت ان حکمرانوں کو ملتی ہے جن کے ہاتھوں علاقوں کی توسیع کے ساتھ ساتھ جانثاری اور انکسار میں بھی اضافہ ہوتا ہے۔ جو کچھ وہ چاہتے ہیں راستے میں ہزاروں مشکلات کے باوجود ان کی خواہشات کی تکمیل بام عروج تک پہنچتی ہے۔ اس عظیم فتح کا بیان اس کی ایک اور مثال ہے'' (74)۔

یا، ''اگر شاہی جلال موجود نہ ہوتا تو کس طرح سے مختلف شورشیں فرو ہوتیں؟ اور کس طرح سے خود غرضی، مطلب پرستی مفقود ہوتیں؟ جذبات کے بوجھ تلے نوع انسانیت بربادی کے کنویں میں گر جاتی۔ دنیا میں ہر جگہ اندھیرا چھا جاتا اور بڑے تھوڑے عرصے میں خوشحال دنیا ویران ہو جاتی۔ لیکن بادشاہ کے عدل کے طفیل کچھ لوگ خوشی خوشی اور دوسرے سزا کے خوف سے اطاعت گزاری کا راستہ اپنا لیتے ہیں اور چاروناچار تشدد سے گریز کرتے ہیں اور قانون کے راستے پر چلتے ہیں۔''(75)

عام طور پر ابوالفضل دو قضیے قائم کرتا ہے۔ پہلا تو یہ ہے کہ اکبر نیم الوہی شخصیت ہے اور اسے اپنے فعل یا بے عملی میں تائید غیبی حاصل ہے اور دوم، سب لوگوں کے لئے اکبر کی اطاعت ایک ضروری اخلاقی فرض ہے۔ یوں اکبر کے خلاف سرکشی یا عداوت کی ناکامی مقدر ہے۔ تیسرا قضیہ پہلے دو سے ماخوذ ہے۔

ابوالفضل اکبر کی الوہیت سے قربت کے خبط میں عملی طور پر مبتلا ہے۔ وہ ہمایوں کی وفات پر افسردہ نہیں ہوتا کیونکہ خالق نے قدیم دنیا کی تجدید قوت اور نوع انسان کو ایک نیا نظام دینے کا(76) یعنی اکبر کو تخت نشین کرنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ جب اکبر نے الٰہی تقویم کا آغاز کیا تو ابوالفضل کے لئے وہ بھی ''الوہی تحریک'' کا نتیجہ تھا(77)۔ جب کمزور دل لوگ ''کسی وقت بارش نہ ہونے کی وجہ سے افسردہ تھے تو اکبر عبادت میں مشغول ہو گیا اور جلد ہی نزول باراں ہوا(78) جب اکبر نے ایک چڑھے ہوئے دریا (گجرات میں دریائے ماہندری) میں اپنا گھوڑا ڈالا تو اس کے ''مقدس جسم'' کی خوش بختی اور معجزے سے دریا پایاب ہو گیا''(79)۔

ابوالفضل اکبر کے لئے غیر مشروط اطاعت کا تقاضا کرتا ہے۔ اس کی نظر میں کوئی فعل جو اس اصول سے ہٹ کر ہو اور اس کے خلاف ہو، اس پر عذاب نازل ہوتا ہے(80)۔ وفادار بھی دو طرح کے ہوتے ہیں: وہ جو کبھی کسی مصلحت کوشی کی بنا پر وفادار ہیں اور وہ ''جو اعلیٰ مرتبت ہیں اور حقیقت کے متلاشی ہیں جو اپنے جذبہ ایثار سے معمور دل کو محبت کی روشنی سے منور کرتے ہیں اور خدا کے منتخب لوگوں سے آگے کھڑے ہیں''(81) قدرتی طور پر دوسرے لوگ پہلے والے لوگوں سے افضل ہیں۔ اور انہیں بغیر کسی کوشش کے کامیابی حاصل ہو جاتی ہے۔ یہ خیال رکھنا چاہئے کہ ابوالفضل کے نزدیک وہی وفادار صالح ہے جنہیں اکبر کی خیر خواہی میں پرانے دوستوں اور

اتحادیوں کو چھوڑنا ہی کیوں نہ پڑے۔ اس طرح جب شاہم خان (81-1580) جو بہار میں باغیوں کے ساتھ شامل ہو گیا تھا، "اپنا وعدہ توڑا اور حاجی پور میں علم وفاداری بلند کیا" تو ایسا اس نے "فطری نیک بختی" کی بنا پر کیا(82)۔

تیسرا مفروضہ ___ اکبر کے خلاف بغاوت یا سرکشی کی ناکامی کا پہلے سے مقدر ہوتا ___ یہ اکبرنامے کے آخری دو جلدوں کے ہر صفحہ پر جلی حروف سے رقم ہے۔ یہ اہم بات ہے کہ ابوالفضل کی نظر میں صرف اکبر کے خلاف بغاوت کا مقدر ناکامی ہے مگر کسی اور شہنشاہ کے مثلاً ہمایوں کے لئے ایسا نہیں۔ شیر شاہ کی ___ جسے شیر خان کہنے پر ابوالفضل مصر ہے کیونکہ اس کی نظر میں وہ محض ایک باغی ہے ___ ہمایوں کے خلاف بغاوت ابوالفضل کے اس خیال کی تردید کرتی ہے۔ لیکن اکبر کے خلاف، "جسے خدا نے عظیم اور مرئی اور غیر مرئی دنیا کی مخلوق کا حکمران بنایا ہے اور جو اس کی فوری اطاعت کرتی ہے"، خلاف بغاوت "اپنے ہی ہاتھ سے خود اپنے سینے میں خنجر گھونپنے کے مترادف ہے"(83)۔ صرف ایک منطقی نتیجے کے طور پر چونکہ اکبر کو تائید غیبی حاصل ہے اور چونکہ اس کی اطاعت لازمی ہے، اس کے خلاف کوئی ارادہ یا فعل سرزد ہونے پر غضب الٰہی نازل ہوگا اور اس معاملے میں کس قسم کی حیلہ سازی کوئی زیادہ کامیاب نہیں ہوگی۔ اس کا ضرور پتا چل جائے گا اور اس پر سزا ملنا لازمی ہے(84)۔

ابوالفضل کے مفروضوں کے دوسرے بنیادی سیٹ کا تعلق افراد کی فطرت سے ہے، جس کا اظہار ان کے کردار میں ہوتا ہے اور یہ کردار ہی ہے جو منفرد تاریخی واقعات کا سبب بنتا ہے۔ عمومی طور پر اس معاملے میں ایک استثنا اکبر ہے جو کسی واقعہ میں بلاواسطہ شامل ہو تو اس کے نیم الوہی ہونے کی بنا پر ابوالفضل بالعموم اسے مستثنیٰ قرار دیتا ہے کیونکہ اس کا کردار عام انسانی تعقل کی حدود سے وراء ہے۔ لیکن یہ بھی بتانا ضروری ہے کہ بغیر کسی استثنیٰ کے ہر دفعہ ہر واقعہ میں اکبر کی کردار کی ایسی تشریح نہیں کی جاتی۔ ایسی مثالیں موجود ہیں جہاں اس کے کردار کی تشریح فطرت یا ارادے پر مبنی ہے(85)۔

لیکن جب کبھی وضاحت مقصود ہو تو صرف اکبر کے کردار کی ہی وضاحت فوق الفطرت اصطلاحات میں کی جاتی ہے۔ جہاں کسی عام فانی انسان کا تعلق ہے تو ابوالفضل کی نظر میں اس کا کردار اسی کی فطرت کا عکاس ہے۔ ایک فرد کی فطرت کے ارادے کے ساتھ اس کی فطری

خصوصیات بھی شامل ہوتی ہیں۔ چند مثالوں سے اس نکتے کی وضاحت ہو سکتی ہے:

''اس موقعے پر۔ . . دہلیز کو بوسہ دینے کی خواہش نے اس خوش بخت انسان (سلطان احمد گکھڑ) کی گردن کو اپنی گرفت میں لے لیا لیکن اس نے فطری وحشیانہ پن کی بنا پر التماس کیا کہ جب اسے خدمت میں ایک بلند درجہ عطا ہوا ہے تو اسے پُر شکوہ جاہ و حشم کے ساتھ ہندوستان نہ لے جایا جائے اور رعایا کو پالنے پوسنے والے کی نوازش کے پیش نظر نہ ہی اسے اس کے ملک سے بدر کیا جائے''(86)۔

یا، ''دہلی میں سلطنت کی توسیع کے ضمن میں واقعہ ہونے والے معاملات میں اس وقت (اکبر کا تیسرا سال جلوس) مصاحب بیگ ولد خواجہ کلان بیگ کا قتل بھی ہے۔ مختصراً واقعہ یہ ہے کہ اس کی روح منافقت سے معمور تھی اس کا مزاج شر پسندی سے بھر چکا تھا۔ جلالتہ الملک جنت آشیانی (ہمایوں) اور دنیا کو منور کرنے والے سورج یعنی جلالتہ الملک شہنشاہ (اکبر) کے طلوع ہونے کے ادوار میں اس کریہہ فعل کا پتہ چل گیا(87)۔

مزید، ''جب شہنشاہ کی خوش بختی کی بدولت ادھم خان فاتح ہوا تو اس کی فطری ہوس کا نشہ بڑھ گیا اور اس کی کلاہ گستاخی جس کا منبع جہالت اور حماقت ہیں، ترچھی ہو گئی۔ اس کا دماغ خراب ہو گیا۔ جو کچھ اس کا ''سرپرست'' اس کو مشورہ دیتا تھا وہ سب ضائع گیا''(88)۔ (ابوالفضل ان اقدامات کا ذکر کرتا ہے جو آدم خان نے مالوہ فتح کرنے کے بعد وہاں اپنی خود مختاری کے لئے کئے)۔

اکبر نامے میں تاریخی حقائق کی تشریح کے لئے انسانی فطرت کو ذمہ دار قرار دینا اس کے مفروضوں کے مذکورہ بالا ثانوی سیٹ پر مبنی ہے۔ ابوالفضل انسانوں کو ان کے کردار کے حوالے سے تین زمروں میں تقسیم کرتا ہے:

1- وہ جو ہر صورت میں نیک ہیں۔
2- وہ لوگ جو لازمی طور پر شر پسند ہیں اور ہمیشہ شر پسند افعال کے مرتکب ہوتے ہیں۔
3- وہ جو لازمی طور پر نیک ہیں مگر ان کو بدی کی طرف مائل لوگ گھیرے رکھتے ہیں۔

بظاہر یہ زمرہ بندی اخلاقی ہے یعنی افراد کے جن افعال پر وہ فیصلہ صادر کرتا ہے، ان کی نوعیت اخلاقی ہے۔ لیکن اگر غور سے دیکھا جائے تو نظر آئے گا کہ اس زمرہ بندی کی بنیاد اخلاقی

ہے کیونکہ اصل میں ابوالفضل اخلاقی افعال کو ہی سیاسی افعال قرار دیتا ہے۔

ابوالفضل نے عہد اکبری کے صرف ان واقعات کو بیان کیا ہے جو بالواسطہ یا بلاواسطہ اکبر کے عہد حکومت سے متعلق ہیں۔ اس تناظر سے باہر سیاسی واقعات کا ذکر محض اتفاقی ہے اور موخرالذکر کی ذیل میں آتا ہے۔ چنانچہ اس نے ان افراد کا ذکر بھی کیا ہے جن کا ان واقعات میں کردار مثبت یا منفی تھا۔ ضمنی طور پر ان واقعات کا تعلق کسی فرد کے شہنشاہ یا اس کی سلطنت سے تعلق یا روش سے ہوسکتا ہے۔ چنانچہ ابوالفضل کا افراد کو تین اخلاقی زمروں میں تقسیم کا تعلق ان کے سیاسی کردار اور ان کی شہنشاہ (اکبر) اور اس کی سلطنت سے متعلق روش سے ہے۔

یہ کہا جاسکتا ہے سولہویں صدی کے نصف آخر کے ہندوستان میں ابوالفضل کے مفروضات میں جن کو منطقی طور پر مبنی بر حقیقت ثابت نہیں کیا گیا، عملی اور تاریخی لحاظ سے درست ہیں۔ یہ وہ زمانہ تھا جب مغل سلطنت نہ صرف علاقائی وسعت بلکہ اپنی اندرونی فطری قوت کے زور پر پروان چڑھ رہی تھی۔ پرانے سیاسی اور انتظامی اداروں کی اس طریقے سے ترمیم کی جارہی تھی جس سے اس مرحلے پر اپنی تشکیل کے لئے مغل سلطنت کو ایک فولادی ڈھانچہ ــــــ منصب داری نظام ــــــ میسر آئے جو اسے اندرونی اور بیرونی لحاظ سے تقویت دے سکے۔ یہ تدریجی ترقی کا عمل اس مذکورہ بالا اداریاتی ڈھانچوں کے سہارے صرف اس وقت ہی جاری رہ سکتا تھا جب تمام سیاسی اقتدار صرف بادشاہ کے ہاتھوں میں مرکوز ہو۔ اس کے برعکس اقتدار کا مرکز میں مرکوز ہونا اسی عمل کا نتیجہ ہوسکتا ہے۔

چنانچہ اس سیاق وسباق میں جب ہم دیکھتے ہیں تو ابوالفضل کا جس کے پاس اکبر سے ذہنی اور عملی طور پر ہم آہنگ ہونے کا پورا جواز تھا، اکبر کی نیم الوہیت پر اتنا زور دینا قابل فہم ہو جاتا ہے کیونکہ اصل میں اس سے مراد غیر مشروط سیاسی قوت کا استعمال تھا۔ یہ بھی قابل فہم ہے کہ ابوالفضل کی نظر میں اکبر کے لئے وفاداری لازمی تھی اور اس کی نوعیت اخلاقی تھی۔ اور اس سے اختلاف بربادکن اور غیر اخلاقی تھا۔ چنانچہ اسی نقطہ نظر سے افراد کے سیاسی کردار کو وہ ان کا اخلاقی کردار ہی قرار دیتا ہے۔

اسلوب

ابوالفضل کو یقین تھا کہ تاریخ نویسی میں اس نے نیا اسلوب ایجاد کیا ہے جو متقدمین اور اس

کے ہم عصروں کی لفاظی اور مبالغہ آمیز خیال آرائی سے بالکل مختلف ہے (89)۔ اس کے اس دعویٰ کی تائید صاحب ماثر الامراء بھی کرتا ہے (90)۔

لیکن اکبر نامے کے سرسری مطالعہ سے ہی یہ واضح ہو جاتا ہے کہ مصنف کا زبان کی سادگی اور سلاست کا دعویٰ بڑا کمزور ہے۔ اگر کہیں مرصع لفاظی موجود ہے تو اکبر نامہ اس کی زندہ مثال ہے۔ یہ احساس ہوتا ہے کہ کتاب پر پانچ دفعہ (91) نظر ثانی کے دوران اس نے ایک ایک لفظ کو بڑی خود شعوری سے انتخاب کیا اور بڑی محنت شاقہ سے ایک وسیع وعریض ادبی عمارت تعمیر کی۔ اور یوں معلوم ہوتا ہے کہ اس کے بعد وہ بڑے سکون سے بیٹھ کر اس کی تعریف میں مشغول ہو جاتا ہے۔

مجموعی طور پر ابوالفضل کا اسلوب بڑا غیر شخصی، زیروبم سے مبرا اور غیر دلچسپ ہے۔ پانچویں اور آخری نظر ثانی کے دوران ازمنہ وسطیٰ کے اسلوب کے مطابق وقفے وقفے سے کہیں کہیں اشعار بھی داخل کئے گئے ہیں اور وہ بھی شاید دوسروں کے اصرار یا تجویز پر (92) یوں یہ اشعار متن پر واقعی متراکب دکھائی دیتے ہیں اور بیانات کے تاروپود میں مدغم ہوتے نظر نہیں آتے۔

اکبر نامے اور آئین کے دو تراجم ہوئے ہیں اور دونوں مترجموں کے ابوالفضل کے اسلوب کی نوعیت کے متعلق تاثرات بالکل یکساں ہیں۔ بیوریج تو اس محنت شاقہ سے جو اکبر نامے کی تصنیف میں صرف ہوئی اور اطلاعات کی صحت اور کھرے پن سے متاثر ہوتا ہے مگر وہ یہ بھی کہتا ہے کہ ''ابوالفضل ایک دلکش مصنف نہیں ہے اور شائد ہی کبھی دلکش بات کہتا ہے۔ اس میں ہیروڈوٹس والی دلکشی نہیں اور نہ ہی دقیق، متعصب اور خطا کار بدایونی جیسی سلاست اور صاف گوئی ہے۔ نہ ہی اس کے خیالات عمیق اور مؤثر ہیں۔ بگاڑے بغیر وہ شاید ہی کبھی کوئی کہانی کہتا ہے'' (93)۔ جیرٹ بھی اس انداز میں لکھتے ہوئے کہتا ہے کہ ابوالفضل کے ''وقائع میں ایسی کوئی معنی خیز بات نہیں جو کسی نام کو دوام بخش دے یا پھر اپنے تشکیل کردہ ڈرامے کے کرداروں کو (عموی) حافظے میں امر کر دے۔ اس کے بیانات انوکھے پن اور بے لچک طرز کا تاثر لئے ہوئے ہیں جو انہیں مبہم بنا دیتے تھے اور وہ انہیں زیروبم سے خالی ایک انداز یکسانی میں شہنشاہ کے حوالے تک جاری رکھتا ہے مگر شہنشاہ کا تھوڑا سا ذکر ہی اس کے قلم کو پُر عقیدت سجدہ ریزی کے لئے مجبور کر دیتا ہے ___ شہنشاہ جس کے اطراف اس کے کرداروں کی دنیا ایسے گھومتی ہے جیسے سورج کی طرح وہی ان سب کا مرکز ہو۔ ایک محدود پیمانے پر اس حکومت کی وفادارانہ نمائندگی کرنے میں یہ

کتاب دلچسپ تفصیلات سے عاری ہے جس میں ابوالفضل بھی ایک نمایاں کردار تھا۔ کسی قوم کے اطوار کی تصویر کشی کے حوالے سے جسے تاریخ نویسی میں کمتر درجے کی چیز خیال کیا جاتا ہے مگر ابوالفضل کی نسبت کم معروف مشرقی مورخین کی تصانیف کے صفحات اس سے روشن ہیں اور ایک مکمل تصویر میں روشنی اور تاریکی کی طرح اس کے لازمی حصے ہیں، یہ کتاب محروم ہے" (94)۔

تاہم اکبر نامے کی دو حصوں میں تقسیم ــــ بیانیہ حصہ اور آئین کی طرح کا گیز یٹیر ــــ تاریخ نویسی میں ایک نیا اسلوب متعارف کرتا ہے۔ لیکن بد قسمتی سے ابوالفضل کے بعد آنے والے مورخین نے آئین کو بطور ایک ماڈل کے نظر انداز کر دیا مگر اکبر نامے کا بیانیہ حصہ تاریخ کی کئی کتابوں میں ایک پروٹو ٹائپ کی صورت میں موجود رہا (95)۔

ابوالفضل کے کام کی ایک اہم خصوصیت اس میں ولیوں کی تعریف و توصیف کا مکمل فقدان ہے۔ اسے اس روایت کا بخوبی علم تھا تاہم وہ اس کی پیروی نہیں کرتا۔ اس کی وجہ بظاہر یہ ہے کہ وہ اکبر کی تعریف کرتا ہے جو بذات خود مجسم صاحب فضیلت اور خدا رسیدہ تھا جس کی تعریف میں اس کے پہلے کے تمام ولی مدغم ہو جاتے ہیں (96)۔ یہ جواز کسی کو بھی قائل نہیں کر سکتا مگر یہ عین ممکن ہے کہ اکبر کے عہد حکومت کے آخری برسوں میں جب ابوالفضل اکبر نامہ لکھ رہا تھا، شہنشاہ نے خود ہی کئی رسومات ترک کر دی تھیں یہاں تک کہ اجمیر کی سالانہ زیارت کو بھی ترک کر دیا تھا (97)۔ اس سے مصنف کو شاید ایک اشارہ مل گیا ہو اور وہ کسی ولی کی مدح سے باز رہا ہو۔

مذہبی تعصب کا جسے آج کل فرقہ پرستانہ تلخی کہا جاتا ہے، مکمل فقدان اس کتاب کا بڑا اہم پہلو ہے۔ کسی حد تک اس کی وضاحت شاید اس امر میں ہو کہ ابوالفضل کے اس کتاب کی تصنیف کے وقت مذہب کے متعلق حکومت کی حکمت عملی پختہ ہو چکی تھی جس کے وضع کرنے میں خود ابوالفضل نے ایک نمایاں کردار ادا کیا تھا۔ لیکن بد قسمتی سے ابوالفضل کا اس کی پختگی کو قبول کرنا اور اسے اکبر کے پورے عہد حکومت پر نافذ کر دینا، زمانہ حال کے مورخین کے لئے اس کے ارتقاء کے مختلف مراحل کی از سر نو تشکیل میں رکاوٹ ہے (98)۔

ابوالفضل کے سیکولر رویئے کے متعلق قیاس آرائی کو کسی حد تک نظر انداز کیا جا سکتا ہے لیکن یہ دلچسپ امر ہے کہ ازمنہ وسطیٰ کے مورخین خدا، رسول اور خلفاء کی تعریف اور مداح سرائی سے اپنی تصنیف کا آغاز کر کے اپنے زمانے کے حکمران تک پہنچتے تھے لیکن اس کے برعکس ابوالفضل اکبر کا

تو ارث وسطی ایشیا کے سیکولر حکمرانوں کے شجرنسب سے ملاتا ہے(99)۔
یہ اس لئے بھی خاص طور پر اہم ہے کہ اسلام کے ہزار برس اکبر کے عہد میں پورے ہوئے اور اس موقع پر اسلام کی حیات نو اور اسے اکبر کے ساتھ منسوب کرنا خاصا پُرکشش ہوسکتا تھا۔ ابوالفضل کا اس کشش سے بچنا اس شعور کا ثبوت ہے کہ اس وقت صرف اسلام ہی کلچر کا منبع نہیں تھا اور مذہب خواہ اسلام ہو یا کوئی اور اس وقت انسانی فکر اور تہذیب کے کئی دیگر سیکولر سرچشمے بھی تھے۔ یہ ممکن ہے ہم عصر یورپ کے ابھرتے ہوئے کلچر کے ساتھ اس کی آشنائی نے اس کی فکر کو متاثر کیا ہو۔ وہ عالم نو کی دریافت اور اس پر یورپی قبضے کے (100) اور یورپی مصوری کے حوالے دیتا ہے(101) لیکن اکبر کے دربار کی ذہنی حدود کو اس کے عہد کی تعمیر میں ایک نیم صوفیانہ عنصر بڑے واضح طریقے سے نمایاں کرتا ہے۔ اسلامی وراثت کی کمزوریوں کا احساس موجود تھا لیکن معاشرے میں ایک نمایاں تکنیکی اور سائنٹفک ترقی کی غیر موجودگی میں (102) ایک متبادل آئیڈیالوجی میں ایک عنصر کے طور پر سائنٹفک سوچ کا کردار بالکل مفقود رہا۔
بیوریج نے اکبرنامہ کا ترجمہ کرتے وقت اس تاثر سے آغاز کیا کہ ابوالفضل ایک بے حیا چاپلوس ہے۔ اور اس کا یہ تاثر آخر تک قائم رہا(103)۔ یہ کہ ابوالفضل کو اس الزام کے امکان کا پورا پورا شعور تھا اس کے اس الزام سے بار بار انکار سے واضح ہوتا ہے(104) اکبرنامے کا اسلوب ہی ایسا ہے کہ جس میں مصنف ہر واقعہ کی ایک ادبی نکتہ عروج تک تعمیر کرتا ہے، اکبر کے حق میں مبالغے کی طرف معنی خیز اشارہ ہے۔ اپنے مخالفوں یا باغیوں کے خلاف اکبر یا اس کی فوج کی بیشتر جنگوں میں (اور اکبرنامہ کا بیشتر حصہ ایسے واقعات پر مشتمل ہے) ابوالفضل اکبر کی طاقت اور ارادے کو بیان کرنے میں اکثر مبالغے سے کام لیتا ہے اور اکبر کی شان و شوکت اور اس کے نمائندوں کی فتوحات کو بڑھا چڑھا کر بیان کرتا ہے۔ خود مصنف کا معاملہ بھی بڑا دلچسپ ہے۔ اکبر سے ملنے والی روشنی اور راہنمائی کے حصول کو مبالغے سے پیش کرنے میں وہ اکبر کو ملنے سے پہلے اپنی خود پسندی اور کم آمیزی کا ذکر کرتا ہے۔
بہر حال یہ ابوالفضل کے حق میں جاتا ہے کہ اس کے زمانے تک ہندوستان میں مستند تاریخ نویسی پر اکبرنامہ ایک ترقی یافتہ قدم تھا۔ خیالات کی سادگی اور مفروضوں کے غیر معتبر ہونے کے باوجود ازمنہ وسطیٰ کی تاریخ نویسی میں اکبرنامے کا بڑا اہم مقام ہے۔

حوالہ جات

1- اکبر نامہ، جلد اول، ببلوتھک انڈیکا۔ص 52۔
2- ایضاً۔جلد سوم۔ص 82۔
3- ایضاً۔جلد اول، ص 49-48۔ یہ مسئلہ اہم ہے کہ ابوالفضل اکبر کا سلسلہ نسب پیغمبر اسلام اور خلفاء کے ساتھ نہیں ملاتا بلکہ وسطی ایشیا کے حکمرانوں سے ملاتا ہے۔
4- ایضاً۔ص 62-63` 334۔
5- ایضاً۔ص 120` 323` 334` 368-369۔
6- مثال کے طور پر اکبر کے دوسرے سال جلوس کے دوران ابوالفضل مانکوٹ کے قلعے کے محاصرے سے آغاز کرتا ہے: (اکبر نامہ، جلد دوم ص 50) وہ قلعے کا مختصر سا احوال بیان کرتا ہے (ص 51) محاصرے کے دوران اکبر اپنا بیان منقطع کر کے بہادر خان کے بھائی خان زمان کا ذکر کرتا ہے ''جس کے زمینداور میں سازش برپا کی تھی'' لیکن بعد میں اکبر کی خدمت میں حاضر ہو کر تعظیم بجالایا اور اسے معافی مل گئی (صفحات 53-54) اس کے بعد مریم مکانی اور حرم کی دوسری خواتین کی کابل سے آمد کی تفصیلات بیان کرتا ہے (صفات 54-56) اس کے بعد وہ حسن خان بچکوٹی پر خان زمان کی فتح کا تذکرہ کرتا ہے (57) آخر میں عبداللہ خان مغل کی بیٹی سے اکبر کی شادی کا تذکرہ ہے (57) اس واقعہ کے ذکر کو روک کر وہ ایک ان سدھائے گھوڑے کا ذکر کرتا ہے جو اکبر کے قابو سے باہر نہیں تھا کیونکہ اسے تائید غیبی حاصل تھی (60-61) بیرم خان کے تذکرہ وہ پھر سے شروع کرتا ہے (63)۔ایک طرف پھر وہ بیرم خان کی کیونکہ بعد کے واقعات کو بیان کرنے کا ابھی وقت نہیں آتا۔
ابوالفضل صفحہ 90 سے 99 تک کے واقعات کی تفصیلات اور اکبر اور بیرم خان کی سوچ کی تفصیلات بیان کرتا ہے جو مؤخر الذکر کے زوال کا سبب بنے۔لیکن وہ اچانک ہی اس بیان کو چھوڑ کر (ص 100) ماہم انگا کے ان اقدامات کا ذکر شروع کر دیتا ہے جو اس نے

سلطنت کی خوشحالی کے لئے اٹھائے تھے۔اور یہ بیان صفحہ سو تک چلتا ہے۔اس کے بعد وہ پھر اس سے پہلے واقعہ کی طرف لوٹ جاتا ہے (ص100)۔صفحہ 101 سے 102 تک ہمیں شاہ عبدالمعالی کے لاہور سے فرار کے بعد کے واقعات کی اطلاع دیتا ہے۔ایک بار وہ پھر بیرم خان کے احوال کی طرف لوٹ آتا ہے۔

اسی طرح مان سنگھ اور دوسرے لوگوں کو رانا پرتاب سنگھ کے ساتھ آخری لڑائی (جلد سوم 162-163) کے لئے روانگی کا بیان ہے اس کے بعد وہ اس بیان کو منقطع کر کے دوسرے واقعات کا ذکر کرتا اور ایک بار پھر وہ وہیں سے آغاز کرتا ہے (ص173) جہاں سے سلسلہ منقطع ہوا تھا۔

7- ایضاً، جلد دوم ص 26`34-35`44-45`48-49`56-57`84-85۔ جلد سوم، ص 173`264 وغیرہ

8- زرین۔ص8۔

9- آئین، جلد دوم، ص56-57۔

10- اکبر نامہ۔جلد دوم، ص 111-113`124-125`134-135 :جلد سوم، ص 165-166، 425-426`430۔

11- ایضاً۔ جلد سوم ص224-227 اور 587-592 (ایران) 553-556 (وسطی ایشیا) 662-665 (ترکی) 716-717 (کوچ بہار) وغیرہ

12- ایضاً، جلد دوم، ص 21، جلد سوم، ص 553 وغیرہ۔

13- ایضاً۔جلد دوم، ص208، جلد سوم، ص432`512-513 وغیرہ۔

14- ایضاً۔جلد دوم، ص222۔

15- ایضاً۔ص2`6`7-9`345-346۔

16- ایضاً۔ص74-75۔

17- ایضاً۔ص346-347`354-355`374-375 جلد سوم، ص524 وغیرہ۔

18- ایضاً۔جلد اول، 9-10۔

19- نتیجہ میں کم از کم چار کتابیں لکھی گئیں جو ہمارے مآخذ کے طور پر استعمال کی جارہی ہیں:

بایزید بیات: تذکرہ ہمایوں واکبر
عباس سروانی: تحفہ اکبرشاہی یا تاریخ شیر شاہی
جوہر آفتابچی: تذکرہ الوقعات اور
گلبدن بیگم: ہمایوں نامہ
پہلی تین کتابوں پر ایک عمومی مطالعہ میری کتاب ہسٹوریز اینڈ ہسٹوریوگرافی کے باب پنجم میں پیش کیا گیا ہے۔

20- آئین۔ جلد دوم۔ ص255۔
21- اکبرنامہ، جلد دوم، ص153۔
22- ایضاً، ص145-146 `152 `164 `201-202 `233 وغیرہ۔
23- ایضاً، ص118 `126 `208 `215 `266 وغیرہ۔
24- آئین (ترجمہ) جلد دوم۔ ص vii۔
25- کارل جان (ایڈیٹر) رشید الدین کی ہسٹری آف انڈیا مع متن۔ دی ہیگ۔ 1965۔
26- آئین، جلد دوم۔ ص130-134۔
27- ساھشیو درپن، مع ہندی ترجمہ وتحشیہ از ملا، دہلی، 1961۔ باب سوم۔
28- آئین۔ جلد دوم۔ ص146-153۔
29- منوسمرتی، ترجمہ از بٹلر، آکسفورڈ 1886۔ باب ہشتم اور اشعار 1-420 اور باب نہم اشعار 1 تا250 و270۔
30- آئین جلد اول۔ ص590-591۔
31- اے۔ ایس۔ بیوریج، بابرنامہ (ترجمہ) جلد اول، ص310-311۔
32- اکبرنامہ، جلد اول، ص302۔
33- جوہر، تذکرۃ الواقعات، مخطوطہ برٹش میوزیم نمبر اے ڈی ڈی 16711 (روٹوگراف) ریسرچ لائبریری، شعبہ تاریخ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، فولیو 113 ب۔
34- اکبرنامہ۔ جلد اول، ص282۔
35- بایزید، تذکرہ ہمایوں واکبر، ببلیوتھک انڈیکا، ص100۔

36- اکبر نامہ، جلد سوم، ص 67، سیاق و سباق سے معلوم ہوتا ہے مصنف نے خوافی خان سے پوچھ گچھ کی اور اس کی شہادت سے نوٹس لئے یا اس نے ابوالفضل کے لئے کوئی یادداشت تیار کی۔ پھر ابوالفضل ص 301-302 پر اسی کا صیغہ واحد متکلم میں حوالہ دیتا ہے۔

37- ایضاً، جلد اول ص 206-213۔

38- محولہ بالا، ص 12`31۔ کوئی اور مصنف اس فرمان کی نقل درج نہیں کرتا۔ اگر اس کے پاس کوئی سرکاری سند نہیں تھی تو ابوالفضل نے لازمی طور پر اسے تذکرہ سے نقل کیا ہوگا۔ تاہم بایزید کا نسخہ مستند لگتا ہے اس لئے ابوالفضل کے بیان اس سے اس کا تقابل درست ہے۔

39- محذوف کرنا قابل فہم ہے۔ ہندوستان میں جنت آشیانی سے مراد ہمایوں ہے۔ سرکاری طور سے اس سے مراد ہمایوں ہی تھا اور صاحب دیو و پری کا لقب کسی مغل شہنشاہ کے شایان شان خیال نہیں کیا جاتا ہوگا۔ بیوریج، اکبر نامہ، جلد اول (ترجمہ)، ص 431۔ حاشیہ 2۔

40- اکبر نامہ۔ جلد دوم، ص 31، جلد سوم، ص 351-352۔

41- ایضاً، جلد سوم، ص 268-270۔

42- جلد دوم، ص 271-272۔

43- ایضاً، ص 345-346۔

44- بدایونی، منتخب التواریخ۔ جلد دوم، ص 271۔

45- اکبر نامہ، جلد سوم، 270۔

46- بدایونی، محولہ بالا، جلد دوم، ص 286-287۔ واضح طور پر ابوالفضل ایسا کوئی بیان تو نہیں دیتا لیکن مراد اس کی یہی ہے۔ میں اس نکتہ کے لئے اقتدار عالم کا مشکور ہوں ان کا انگریزی مقالہ

"The Nobility Under Akbar and the Development of His Religious Policy(1560-80)," J.R.A.S.1968, Parts 1 & 2.

47- بایزید، محولہ بالا، ص 291۔

48- اکبر نامہ، جلد دوم، ص 259۔

49- اصلی یادداشت کی لفظ بلفظ نقل اکبر نامے کے پہلے ڈرافٹ میں موجود ہے۔ (برٹش میوزیم، مخطوطہ اے ڈی ڈی 247`27۔ ریو، جلد 1، لندن، 1879، ص 247 ب)

فولیو 382ب۔ پہلے اور دوسرے ڈرافٹ کی نقول میں فرق ملاحظہ ہو۔ یہ دونوں ڈرافٹ ریسرچ لائبریری، شعبہ تاریخ، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں موجود ہیں۔ آخری ورشن میں بڑے ادبی اسلوب میں اس کا مکرر بیان ہے۔ اکبر نامہ، جلد سوم، 382-383۔

50- اکبر نامہ، جلد اول، ص 9-10۔

51- آئین، جلد دوم، ص 255۔

52- محولہ بالا۔

53- اکبر نامہ، جلد اول، ص 10۔

54- آئین، جلد دوم، ص 255۔

55- اکبر نامہ، جلد دوم، ص 392۔

56- آئین، جلد اول، ص 280۔

57- مثال کے طور پر وہ کہانی پیش کی جا سکتی ہے جس میں اکبر کے سلف کی 33 پشت میں ایک شعاع خاتون النقوا کے جسم میں داخل ہوگئی اور وہ حاملہ ہوگئی (اکبر نامہ، جلد اول، ص 65) ابوالفضل کی تشریح کے مطابق ایسا مظہر ان لوگوں کے لئے قابل فہم ہے جو مادی اشیاء کی پرستش سے آگے نکل گئے ہیں لیکن ان لوگوں کے لئے نا قابل فہم ہیں جو اس مرحلے سے آگے نہیں بڑھے۔

ابوالفضل مزید کہتا ہے کہ (وہ دن جلالہ ملک شہنشاہ کے ظہور کا آغاز تھا...... جب بھی اسے تکلیف دہ مظاہر کی تشریح ابوالفضل کو کرنی پڑتی ہے تو وہ اس قسم کے دلائل اس سے مخصوص ہیں۔ ملاحظہ ہو پایان 17۔

اسی طرح آدم، شیت اور انوش وغیرہ کے متعلق اساطیر کو ابوالفضل قبول کرتا ہے (اکبر نامہ، جلد اول، ص 52-53 54 بالترتیب اور وہ آدم کی تخلیق 7000 برس مقرر کرتا ہے۔ (اس کا یہ اس کے بیان کو بھی جھٹلاتا ہے کہ انسان زمین پر 7000 سال پہلے آیا۔ وہی کتاب، ص۔ 49)

حقیقت میں ابوالفضل کا بنیادی مفروضہ کہ اکبر براہ راست آدم کی 52 پشت میں سے تھا، بڑا بھونڈا ہے لیکن اس کے نزدیک یہ عیاں بالذات ہے تاریخی حقیقت ہے۔ جیسے کہ پہلے

عرض کیا جا چکا ہے، ابوالفضل کا تاریخ لکھنے کا منصوبہ 4 جلدوں پر مشتمل ہوتا تھا کیونکہ اس خیال میں اکبر کی عمر 130 برس ہوگی اور ابوالفضل بھی اس کے ساتھ ہوگا۔لیکن افسوس کہ یہ دونوں اس مفروضے کی تکذیب سے آگاہ ہونے تک زندہ نہ رہے۔

58- کئی مقامات پر یہ روشن تاریخ نظریہ پیش کرتی ہے کیونکہ ابوالفضل آغاز سے انجام تک ابوالفضل کے لئے تاریخ اکبر کے عہد حکومت میں اختتام تک کھنچی چلی آتی ہے۔لیکن اس کا طریقہ کار غائبی ہرگز نہیں وہ انسانی تاریخ کے مطالعہ کے بعد اس نتیجے پر نہیں پہنچا تھا لیکن وہ ایک نقطہ نظر کو مفروضہ بنا کر اور انسانی تاریخ کے طرف وہاں سے پیچھے یہ فرض کر کے کہ اس کی وضاحت ہی اس مفروضے کا ثبوت ہے۔

59- اکبرنامہ، جلد اول، ص120 `323-324 `369-370۔

60- شاہ طہماسپ کی 1576 میں وفات کے بعد فارس کے دربار کی چند بڑی مفصل تفصیلات ہیں۔اکبرنامہ، جلد سوم، ص224 `227۔

اس واقع کے اندراج دمدار ستارے کا نظر آتا ہے۔اس کا اثر اکبر کی وجہ سے تائید غیبی حاصل تھی، کوئی برا اثر تو نہ پڑا لیکن اس نے ایران میں بڑی تباہی مچائی۔یہ وہاں بھی نظر آتا تھا۔

عہد حکومت کے چھتیسویں سال میں ایران کے سفیر شاہ عباس کی آمد پر صفوی عہد حکومت پر کچھ روشنی پڑتی ہے۔وہی کتاب، صفحات 588-592۔

اسی طرح چوتیسویں سال جلوس میں کاشغر کے سفیر سلطان قرس کی اکبر کے دربار میں آمد کے ذکر سے وسطی ایشیا کے چنگیز خان کے بعد کے حالات کا بیان بھی شامل ہے۔وہی کتاب صفحات 553-556۔

ترکی کے شاہ مراد کی وفات اور اس کے بیٹے کا محمد کا تخت نشین ہونے پر جس نے اپنے انیس بھائیوں کا صفایا کر دیا تھا، ابوالفضل ترکی کا مختصر ذکر کرتا ہے وہی مقام، صفحات 662-665۔اس واقعہ کا کوئی تعلق اکبر اور اس عہد حکومت نہیں بنتا سوائے اس کے اس خبر سے اکبر افسردہ ہو جاتا ہے۔ابوالفضل بھی ترکی کے متعلق اس بیان کو ایک گریز ہی سمجھتا ہے۔وہی مقام ص665۔

61- آئین، جلد اول، 159۔

62- اکبرنامہ، جلد دوم، ص157۔

63- اکبرنامہ، جلد سوم، ص90۔

64- ایضاً، ص90-91۔

65- ایضاً، جلد اول، ص118۔

66- ایضاً، جلد دوم، ص285۔

67- ایضاً، ص282۔

68- ایضاً، جلد سوم، ص116۔

69- ایضاً، جلد دوم، ص30-31۔

70- ایضاً۔ ص130۔

71- ایضاً۔ ص74۔

72 ایضاً۔ صفحات128-129۔

73- ایضاً، جلد سوم، ص774، یہ فتح پینتالیسویں سال جلوس میں احمد نگر کے قلعے پر قبضہ ہے۔

74- ایضاً۔ جلد 1، ص2۔

75- اکبرنامہ، جلد اول، 365۔

76- ایضاً، جلد دوم، ص9۔

77- ایضاً، جلد سوم، ص578۔

78- ایضاً، ص14۔

79- ایضاً، ص20۔

80- ایضاً، صفحات449-450۔

81- ایضاً، ص306۔

82- ایضاً، جلد دوم، ص84۔

83- ایضاً، صفحات69`97-98`138۔

84- ایضاً، اکبرنامہ، جلد دوم، ص68`97`141`234-235۔ ایضاً، جلد سوم، ص50۔ جہاں

مصنف یہ نظریہ پیش کرتا ہے کہ تائید غیبی کے باوجود حکمران کو (یہاں اشارہ اکبر کی طرف ہے) صحیح منصوبے، عمل پرستی سوچ اور مناسب عمل پر انحصار کرنا چاہئے۔

85- ایضاً، جلد دوم، ص 63۔

86- ایضاً، ص 69-70۔

87- ایضاً، ص 137-138۔

88- ایضاً، جلد دوم، ص 381۔

89- جلد دوم ص 622۔

90- آئین، جلد دوم، ص 256۔

91- ایضاً۔

92- بیوریج، اکبر نامہ، جلد دوم (ترجمہ) دیباچہ ص x,ix۔

93- جیرٹ کا دیباچہ، آئین، جلد دوم، (ترجمہ) تحشیہ ازاں جے۔ این۔ سرکار، ببلیو انڈیکا، ص vi`vii۔

94- ملاحظہ ہو میری *Historians and Historiography* p.71, fn.3.

95- آئین، جلد اول، ص 8-9۔

96- اکبر کے 18 سال جلوس کے واقعات کا ذکر کرتے ہوئے بدایونی بتاتا ہے کہ زیادہ عقیدت کی بنا پر وہ (شہنشاہ) اجمیر کی سالانہ زیارت کو ضروری سمجھتا ہے۔ . . محولہ بالا، جلد دوم ص 173۔ ایک بار پھر 24 ویں سال جلوس کے دوران اکبر 8 ستمبر 1579 کو اجمیر کے لئے روانہ ہوا۔ اس کے بعد آج تک (یعنی بدایونی کے لکھتے وقت تک) جب 14 سال گزر چکے اس نے اپنے گھوڑے کو اس طرف نہیں موڑا، وہی کتاب ص 272۔ ابوالفضل 25 ویں سال جلوس میں شہزادہ دانیال کو بطور نائب اجمیر کی تشریح کرتے ہوئے کہتا ہے۔ صاحب دل لوگوں کے وہ (اکبر)۔ . . سطحی سمجھتا ہے۔"

اکبر نامہ، جلد سوم، ص 316-317۔

97- اکبر کے مذہبی پالیسی کے ارتقاء کی تشریح کی ایک تاندہ لیکن عارضی کوشش اقتدار عالم خان نے کی ہے۔ *The Nobility Under Akbar*

98- اکبرنامہ، جلد اول، ص48-49۔

99- آئین، جلد دوم، ص26۔

100- ایضاً، جلد اول، ص 116۔ ایک بحث کے لئے میں اس نکتے کے لئے میں محترم عرفان حبیب کا مشکور ہوں۔

101- ازمنہ وسطیٰ کے ہندوستان میں ٹیکنیکل ترقی کی رفتار کے لئے دیکھیں عرفان حبیب کا صدارتی خطبہ، پروسیڈنگز آف دی انڈین ہسٹری کانگرس، وارانسی سیشن، پٹنہ، 1969 دارانسی سیشن، پٹنہ 1970 اور دیوراج چانن میموریل لیکچر، دہلی 1970 (میموگراف)

102- بیورج کا دیباچہ اکبرنامہ (ترجمہ) جلد سوم، ص ix۔

103- اکبرنامہ، جلد اول، ص348، جلد دوم، ص114، جلد سوم، ص259۔

104- ایضاً، جلد دوم، ص388-392، جلد سوم، ص83-84` 113-114۔

تبصرہ کتب

"OFFICIAL" CHRONICLE OF MAYO SCHOOL OF ART

The Formative Years Under J L KIPLING 1874-94
Researched and introduced by Nadeem Omar Tarar
Published by RPC (NCA) 2003
Price: Rs.1295/-

1999ء میں نیشنل کالج آف آرٹس کے زیرِ سرپرستی ریسرچ اینڈ پبلیکشن سنٹر (آر پی سی) کا آغاز ہوا۔ آر پی سی کا بنیادی مقصد تحقیق و اشاعت کے ذریعے آرٹ اور کلچر کی تعلیم کو فروغ دینا ہے۔ اس کے لئے ایک طرف تو آر پی سی کے تحت مباحث، مناظروں اور لیکچرز کے انعقاد کا آغاز کیا گیا ہے اور دوسری طرف نئی اور پرانی کتابوں کی اشاعت کی جا رہی ہے۔ اس سلسلے میں اب تک تاریخ، سیاست اور کلچر کے موضوعات پر کتابیں شائع ہو چکی ہیں جن میں زیادہ تر پرانی اور نایاب کتابوں کو ہی دوبارہ سے شائع کیا گیا ہے تا کہ آرٹ اور کلچر کے طلبہ کے تاریخی تنقیدی شعور کو بہتر بنایا جا سکے۔

1875ء میں جب نیشنل کالج آف آرٹس کا سنگِ بنیاد رکھا گیا تو اس کا نام میو سکول آف آرٹ تھا اور یہاں کے پہلے پرنسپل لاک ووڈ کپلنگ تھے۔ یہ کتاب سکول کی سالانہ کارکردگی کی رپورٹوں اور آرٹ کی نمائشوں کی تفصیلات پر مشتمل ہے جن کے ذریعے سکول کے ابتدائی تشکیلی مراحل کو واضح کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ اس کے علاوہ س کتاب میں اہم خطوط کی نقول اور

آئندہ لائحہ عمل پر ہونے والی مباحث بھی شامل ہیں۔اس کتاب کی اشاعت کا مقصد آرٹ کی تعلیم کے ضمن میں اس دور کے برطانوی اقدامات اور پالیسیوں کو منظرِ عام پر لانا ہے۔

اس کتاب میں میوسکول آف آرٹ میں تیار کئے گئے دستکاری کے عمدہ نمونوں کے متعلق معلومات مہیا کی گئی ہیں جن سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس دور مین پنجاب کی دستکاری کو خاصی پذیرائی مل رہی تھی۔ یہاں تک کہ ملکہ وکٹوریہ تک نے ادسبورن (Osborne) میں واقع اپنے چیمبر کی آرائش میں پنجاب کے دستکاروں کی خدمات حاصل کرنے کی خواہش کا اظہار کیا۔

کتاب کے آخر میں دیئے گئے ضمیمہ جات میں صوبے کی ترقی میں آرٹ کی تعلیم کے کردار پر ہونے والی مباحث شامل ہیں۔جن میں ایک طرف لارڈ بیڈن پاوٗل (برطانوی مستشرق) اور جے۔ایل۔کپلنگ کا خیال تھا کہ میوسکول میں بنیادی طور پر کرافٹ کی تعلیم کو رائج کیا جانا چاہیئے جبکہ دوسری طرف سر رچرڈ ٹمپل (برطانوی بیوروکریٹ اور مستشرق) اور ایچ۔ایچ۔لاک پرنسپل کلکتہ سکول آف آرٹ، فائن آرٹ کے حق میں دلائل دیتے نظر آتے ہیں۔

کیا ہندوستان میں آرٹ کی تعلیم یورپی جمالیاتی انداز میں رائج کی جائے یا پھر برصغیر کی اپنی فنون لطیفہ کی روایات کو مزید بہتر بنایا جائے جس کا بنیادی مقصد صنعت وحرفت کو فروغ دینا ہو، اور کیا میوسکول کلکتہ، مدراس اور بمبئی میں واقع اداروں کی طرز پر کام کرے گا یا پنجاب میں، جہاں کہ ہنرمندوں کی ایک کثیر تعداد جاگیردارانہ زراعتی اقتصادیات سے منسلک ہے، کسی اور طرز کی تعلیمی حکمتِ عملی کی ضرورت ہے۔ یہ برطانوی ماہرینِ تعلیم اور انتظامیہ کے اراکین کی ان مباحث کے نتیجے میں ایسے اقدامات کئے گئے جن سے نہ صرف برصغیر میں آرٹ کی تعلیم کے میدان میں تبدیلیاں آئیں بلکہ ہنرمندوں اور دستکاروں کا کام بھی متاثر ہوا۔ یہ تبدیلیاں ابھی تک سرمایہ دارانہ نظام سے منسلک غیر مستحکم نوآبادیاتی ممالک کے آرٹسٹوں اور تعلیمی ماہرین کے لئے مقامی تاریخ وتعلیمی روایات کو سمجھنے کے اصول مرتب کرتی ہیں۔

اس لحاظ سے یہ کتاب ان آرٹسٹوں اور تاریخ دانوں کے لئے انتہائی اہم ہے جو برطانوی جدیدیت اور پنجاب میں آرٹ کی تعلیم کو صنعتی ڈیزائن اور پیداوار کے فروغ کے لئے رائج کرنے کی کوششوں میں دلچسپی رکھتے ہیں۔

☆☆☆☆☆

CABOOL
Being a Personal Narative of a Journey
to, and Residence in that City in the Years 1836,7,8
By Alexander Bunes (First published: 1842)
Published by RPC (NCA), 2003
Price: Rs.350/-

1999ء میں نیشنل کالج آف آرٹس کے زیرِ سرپرستی ریسرچ اینڈ پبلیکشن سنٹر (آر پی سی) کا آغاز ہوا۔ آر پی سی کا بنیادی مقصد تحقیق واشاعت کے ذریعے آرٹ اور کلچر کی تعلیم کوفروغ دینا ہے۔اس کے لئے ایک طرف تو آر پی سی کے تحت مباحث، مناظروں اور لیکچرز کے انعقاد کا آغاز کیا گیا ہے اور دوسری طرف نئی اور پرانی کتابوں کی اشاعت کی جارہی ہے۔اس سلسلے میں اب تک تاریخ، سیاست اور کلچر کے موضوعات پر کتابیں شائع ہو چکی ہیں جن میں زیادہ تر پرانی اور نایاب کتابوں کو ہی دوبارہ سے شائع کیا گیا ہے تا کہ آرٹ اور کلچر کے طلبہ کے تاریخی تنقیدی شعور کو بہتر بنایا جاسکے۔

پچھلے چند برسوں سے دنیا بھر کے دانشور اور تجزیہ نگار افغانستان کے سماجی وسیاسی حالات میں خاص طور سے دلچسپی لے رہے ہیں۔اس سلسلے میں لیفٹیننٹ کرنل الیگزینڈر برنیز کا سفرنامہ جو 1842ء میں شائع ہوا، افغانستان کی سماجی اور سیاسی تاریخ میں ایک سنگِ میل کی حیثیت رکھتا ہے۔

اس سفرنامے میں الیگزینڈر برنیز نے اپنے ذاتی مشاہدات کو پیش کیا ہے۔جن سے افغانستان کی کشیدہ صورت حال کے تاریخی پس منظر کو سمجھنے میں مدد ملتی ہے۔مزید برآں اس میں برطانوی سامراج کی افغان حکمتِ عملی اور گرم پانیوں تک رسائی کے روسی منصوبے کو بھی پیش کیا گیا ہے جنہیں سترہویں صدی میں ہی وضع کیا گیا تھا۔مصنف اس پوری صورتحال کا ایک اہم کردار تھا۔
کتاب میں دی گئی تفصیلات سے پتہ چلتا ہے کہ کس طرح حکومتِ برطانیہ نے سندھ کے

ساتھ متوقع جنگ کو کامیابی سے ٹالا اور دریائے سندھ کے سروے کا بہانہ بنا کر فوجی اہمیت کے علاقوں کے نقشے تیار کئے۔ اس کتاب میں قدرتی تاریخ اور سندھ طاس کا ارضیاتی اور ماحولیاتی جائزہ بھی پیش کیا گیا ہے۔ اس کے علاوہ افغان حکمران، دوست محمد کے ساتھ تجارتی معاہدوں کے لئے ہونے والے مذاکرات کی تفصیل بھی بیان کی گئی ہے۔

علاوہ ازیں رنجیت سنگھ کے زیرِ حکومت مغربی علاقوں میں افغانیوں اور پنجابیوں کے درمیان میل جول، مقامی لوگوں میں برطانوی اور روسی سامراجیت کے خلاف پھیلتی ہوئی بے زاری اور کافرستان کے مشہور لوک رقص کا ذکر بھی اس کتاب میں ملتا ہے۔ فلپ ہنسر نے 2002ء میں اپنے مشہور تاریخی ناول ''دی ملمی ایسے'' میں ان واقعات کو افسانوی رنگ میں پیش کیا ہے۔

☆☆☆☆☆

The Trial of Muhammad Bahadur Shah
(Ex. King of Delhi)

by H. L. O. Garrett (First Published: 1932)
Published by RPC (NCA), 2003
Printed by Ferozesons (Pvt.) Ltd.
Price: Rs.350/-

1999ء میں نیشنل کالج آف آرٹس کے زیرِ سرپرستی ریسرچ اینڈ پبلیکشن سنٹر (آر پی سی) کا آغاز ہوا۔ آر پی سی کا بنیادی مقصد تحقیق و اشاعت کے ذریعے آرٹ اور کلچر کی تعلیم کو فروغ دینا ہے۔ اس کے لئے ایک طرف تو آر پی سی کے تحت مباحث، مناظروں اور لیکچرز کے انعقاد کا آغاز کیا گیا ہے اور دوسری طرف نئی اور پرانی کتابوں کی اشاعت کی جا رہی ہے۔ اس سلسلے میں اب تک تاریخ، سیاست اور کلچر کے موضوعات پر کتابیں شائع ہو چکی ہیں جن میں زیادہ تر پرانی اور نایاب کتابوں کو ہی دوبارہ سے شائع کیا گیا ہے تاکہ آرٹ اور کلچر کے طلبہ کے تاریخی تنقیدی شعور کو بہتر بنایا جا سکے۔

زیر تبصرہ کتاب بھی اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے۔ اس کتاب کو پہلی مرتبہ 1895ء میں برطانوی حکومت نے ایک سرکاری دستاویز کی حیثیت سے شائع کیا گیا۔ اس کے بعد 1933ء میں گیرٹ نے، جو کہ پنجاب آرکائیوز کے ریکارڈ کیپر تھے، اسے مدون کر کے دوبارہ شائع کیا۔ اس کتاب میں آخری مغل فرماں روا بہادر شاہ ظفر کے خلاف بغاوت اور قتل کے مقدمے کی مکمل کاروائی کو قلمبند کیا گیا ہے۔

اس مقدمے کی کاروائی سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ کس طرح برطانوی حکومت نے برصغیر میں اپنے مفادات اور مقاصد کے حصول کی خاطر ریاست کی حکمرانی اور قانون کی بالادستی جیسے جدید یورپی ریاستی قوانین کو مخصوص تبدیلیوں کے ساتھ نافذ کیا۔ یہ کتاب نہ صرف برطانوی ہندوستان کے سیاسی اور تاریخی پس منظر کے حوالے سے اہم ہے۔ بلکہ اس میں تیزی سے ابھرتی ہوئی برطانوی طاقت کے خلاف برسرِ پیکار ایک بے تخت مغل بادشاہ کے غیر معمولی حالات پر مبنی حقائق عام قاری کے لئے بھی دلچسپی کے حامل ہیں۔ مقدمے کی سماعت اور شہادتوں کی تفصیل کے ذریعے مغلیہ اقتدار کے آخری ایام کی روداد اور بغاوت کے واقعات کو تفصیل سے بیان کیا گیا ہے۔

☆☆☆☆☆

LAHORE AS IT WAS

By J.L.Kipling & T.H.Thornton (First Published: 1860)

Published by RPC (NCA), 2002

Printed by Ferozesons (Pvt.) Ltd.

Price: Rs.200/-

1999ء میں نیشنل کالج آف آرٹس کے زیرِ سرپرستی ریسرچ اینڈ پبلیکیشن سنٹر (آر پی سی) کا آغاز ہوا۔ آر پی سی کا بنیادی مقصد تحقیق و اشاعت کے ذریعے آرٹ اور کلچر کی تعلیم کو فروغ دینا ہے۔ اس کے لئے ایک طرف تو آر پی سی کے تحت مباحث، مناظروں اور لیکچرز کے انعقاد کا آغاز کیا گیا ہے اور دوسری طرف نئی اور پرانی کتابوں کی اشاعت کی جارہی ہے۔ اس سلسلے میں اب

تک تاریخ، سیاست اور کلچر کے موضوعات پر کتابیں شائع ہو چکی ہیں جن میں زیادہ تر پرانی اور نایاب کتابوں کو ہی دوبارہ سے شائع کیا گیا ہے تا کہ آرٹ اور کلچر کے طلبہ کے تاریخی تنقیدی شعور کو بہتر بنایا جا سکے۔

یہ کتابچہ میو سکول آف آرٹ کے سب سے پہلے پرنسپل جے۔ایل۔ کپلنگ اور برطانوی انتظامیہ کے اہم رکن ٹی۔ ایچ۔ تھرٹن نے سرکاری افسروں اور سیاحوں کی رہنمائی کے لئے ''لاہور ہینڈ بک'' کے نام سے 1860ء میں شائع کیا۔

سرکاری طور پر شائع ہونے والے اس کتابچے میں لاہور شہر کا ایک مختصر خاکہ پیش کیا گیا ہے۔ جس میں قدیم لاہور کی تاریخی عمارات، موسمی حالات، ذرائع پیداوار، فنونِ لطیفہ کی روایات اور برطانوی حکومت کے زیرِ اثر ہونے والی تبدیلیوں کی مختصر تاریخ انتہائی دلچسپ پیرائے میں بیان کی گئی ہے۔

اس کتاب میں برطانوی حکومت کے زیرِ اثر لاہور کے ثقافتی و انتظامی ڈھانچے کا تجزیہ کیا گیا ہے۔ جو غالباً تحقیق کے زمرے میں تو نہیں آتا تاہم ایک سامراجی ذہن کو سمجھنے میں مدد ضرور دیتا ہے، جس نے آنے والے وقت میں شہر کی اقتصادی وسماجی زندگی پر گہرے اثرات مرتب کئے۔

☆☆☆☆☆

John Lawrence
As Commissioner of Jullundhur Doab (1846-1849)
by R.R.Sethi (First published: 1930)
Published by RPC (NCA), 2003
Printed by Ferozesons (Pvt.) Ltd.
Price: Rs.250/-

1999ء میں نیشنل کالج آف آرٹس کے زیرِ سرپرستی ریسرچ اینڈ پبلیکیشن سنٹر (آر پی سی) کا آغاز ہوا۔ آر پی سی کا بنیادی مقصد تحقیق واشاعت کے ذریعے آرٹ اور کلچر کی تعلیم کو فروغ دینا ہے۔ اس کے لئے ایک طرف تو آر پی سی کے تحت مباحث، مناظروں اور لیکچرز کے انعقاد کا آغاز

کیا گیا ہے اور دوسری طرف نئی اور پرانی کتابوں کی اشاعت کی جا رہی ہے۔اس سلسلے میں اب تک تاریخ، سیاست اور کلچر کے موضوعات پر کتابیں شائع ہو چکی ہیں جن میں زیادہ تر پرانی اور نایاب کتابوں کو ہی دوبارہ سے شائع کیا گیا ہے تا کہ آرٹ اور کلچر کے طلبہ کے تاریخی تنقیدی شعور کو بہتر بنایا جا سکے۔

زیرِ تبصرہ کتاب، جو پہلی مرتبہ 1930ء میں شائع ہوئی، ایک ایسے شخص کی سرگزشت ہے جس نے برطانوی راج کے دوران پنجاب کی تشکیل میں اہم کردار ادا کیا۔اس کتاب میں سر جان لارنس کی ابتدائی زندگی، سکھوں کے خلاف پہلی جنگ، جالندھر دوآب میں بحیثیت کمشنر تعیناتی، لاہور میں رہتے ہوئے سرانجام دی گئی اہم خدمات، سکھوں کے خلاف دوسری جنگ، قانونی اصلاحات کا نفاذ اور مقامی بااثر لوگوں کے ساتھ میل جول کے حالات قلمبند کئے گئے ہیں۔لارنس کی ان خدمات کی وجہ سے نہ صرف اسے حکومتِ برطانیہ کی طرف سے پذیرائی ملی بلکہ مقامی آبادی کا اعتماد بھی حاصل ہوا۔اس کتاب میں بعض انتہائی اہم دستاویزات اور معاہدات کی نقول بھی شامل کی گئی ہیں۔

یہ کتاب اس حقیقت پر روشنی ڈالتی ہے کہ کس طرح چند سربرآوردہ اور سرکردہ شخصیات نے پنجاب کی تاریخ کو مرتب کیا۔سر جان لارنس نہ صرف سکھوں کے خلاف فیصلہ کن جنگ کی کامیابی میں پیش پیش رہے بلکہ انہوں نے کثیر تعداد میں مقامی بااثر شخصیات کو تاجِ برطانیہ کا ہمنوا بنانے میں بھی اہم کردار ادا کیا۔یہ کتاب ان افراد کے لئے انتہائی اہم ہے جو پنجاب پر برطانوی تسلط اور سامراجی دور میں رکھی گئی مقامی سیاست کی بنیادوں کو سمجھنے میں دلچسپی رکھتے ہیں۔

Research and Publication Centre

National College of Arts

4- The Mall, Lahore

Ph: 7311018, 9210599 (ext.333)

E-mail:rpc@nca.edu.pk

Website:www.nca.edu.pk/rpc

تاریخ کے بنیادی مأخذ

سفر نامہ بَن گڑھ

مصنف: رای رایان آنند رام مخلصؔ

ترجمہ وحواشی: سعودالحسن خان روہیلہؔ

سہ ماہی تاریخ کے گذشتہ (انیسویں) شمارے میں تاریخ کے
بنیادی مآخذ کے طور پر آنندرام مخلص کے ''سفرنامہ بَن گڑھ''
کی پہلی قسط پیش کی گئی تھی۔ اس شمارے میں اس کی دوسری اور
آخری قسط پیش کی جاتی ہے۔ مصنف شمالی ہندوستان کے شہر
سنبھل کے حالات بیان کر رہا ہے جن کا کچھ حصہ گذشتہ قسط میں
گزر گیا ہے۔ باقی اب مطالعہ فرمایئے!

سفرنامہ بَن گڑھ

شہر کا دروازہ (227) جو بہت بلند ہے اس میں پتھر کی چکی نصب ہے جو لوہے کی (بڑی) کیل سے لٹکائی گئی ہے۔ کہتے ہیں کہ گزرے وقتوں میں ایک شعبدہ باز زمین سے ہوا میں اڑا اور پہلی بار تو اس نے لوہے کی کیل کو نصب کر دیا اور دوسری بار جب ہوا میں معلق (کھڑا) ہوا تو پتھر کی چکی کو اس میں لگا دیا۔ گویا کہ یہ پتھر کی چکی اس شعبدے باز کا سنگ زور (228) ہے۔ چنانچہ جو بازی گر ایک ہی چھلانگ میں اس پتھر کی چکی کو نیچے کھینچنے کی طاقت رکھتا ہے اس کے لئے اس دروازے سے گزرنا جائز ہے اور اگر اس کی قدرت اس میں نہ ہو تو اس (دروازے سے گزرنے) کا ارادہ کرنا بے کار ہے۔ لہٰذا شعبدے باز اور کرتب ساز (229) ابھی تک اس دروازے سے نہیں گزرتے۔

(ہم نے) شہر کو بہت ویران پایا لیکن یہ قدیم ترین شہروں میں سے ایک ہے اور اس کی عمارتیں و بازار پختہ بنے ہوئے ہیں۔ وہاں کے لوگ نفاستِ مزاج سے بے بہرہ نہیں ہیں۔ ایک بار جو (ان کے ساتھ) اٹھے بیٹھے تو (پتہ چلتا ہے کہ) ان لوگوں کی زندگانی شاہجہان آباد والوں کی طرح (بسر ہوتی) ہے۔ (230)

امین الدولہ بہادر (231) جو اس مبارک دور میں سات ہزاری ذات و سوار کے منصب پر سرفراز رہے، وہ ان ہی لوگوں میں سے ہیں۔ اس نے ایک وسیع و بلند حویلی بنائی ہے جس میں بہت سے مکانات اور ایک حمام و ایک شیش محل بھی بنے ہوئے ہیں۔ نیز حویلی کے اگلے حصے میں ایک کٹرہ و باغ و بازار بھی بنائے گئے ہیں۔ امین الدولہ بہادر مرحوم کا مزار بھی اسی جگہ ہے۔ (232) شہر کے اس جانب ایک بہت بلند گنبد ہے کہ جو قدیم دور میں بت کدہ تھا اور ''ہر منڈل'' کے نام سے مشہور تھا۔ (233) کہتے ہیں کہ یہ جو کہاوت مشہور ہے کہ:

عبارت ہندی

''بھاگ بڑے سنبھل کے کہ ہر جی ہر منڈل آویں گے۔'' (234)

وہ اسی گنبد سے نکلی ہے۔ جب بابر بادشاہ (235) ہندوستان پر مسلط ہوئے تو سنبھل جاگیر میں ہمایوں بادشاہ کو جس کا نام اس وقت ہمایوں مرزا تھا عنایت کیا۔ (236) ان کے دور میں اس قدیم عمارت کو مسجد کی طرز پر درست کر دیا گیا۔ اور اب بھی شہر میں سب سے بڑی مسجد کا گنبد یہی ہے۔ غرض کہ اس سے قبل بھی عبادت گاہ تھی اور اب بھی عبادت گاہ ہے۔ (237) اس کی محراب پر جو تاریخ تحریر ہے وہ تحریر میں لائی جاتی ہے:

جامع انبیۂ فضل و کمال
رفع الویۂ ملک و ملل
باسط اصحۂ امن و امان
بانی انبیۂ علم و عمل
شاہ جم جاہ محمد بابر
حفظ اللہ لہ عز و جل
شمع دولت چو بر افروخت بہند
روشن از پر تو آن شد سنبھل
از پئی ساختن این مسجد
کہ مصون باد زنقصان خلل
کرد فرمان بکمین بندہ خویش
کہ بود عمدۂ ارکان دول
میر باعقل وخرد ھندو بیگ
آن باخلاق نکو گشتہ مثل
چون زفرمان شہنشاہ زمان
یافت اتمام بتوفیق ازل

سال وتاریخ و مہ و روزش گشت

یکم از شہر ربیع الاول (238)

اسی گنبد کے قریب شہر کے باہر (239) ایک تالا بچہ ہے جب اس کا پانی استعمال ہو (کر ختم ہو) جاتا ہے تو اس کی خاک شرمندہ ہو کر پانی بن جاتی ہے۔ لوگ اس چشمہ کے پانی کو متبرک سمجھ کر غسل کرتے ہیں اور اگر اس میں پانی نہ ہو تو بھی اس میں پھول نکل آتے ہیں۔

بعد ازین در عوض اشک دل آید بیرون

آب چون کم شود، از چشمہ گل آید بیرون (240)

برہمن (لوگ) اور گل فروش چشمے کے اردگرد بیٹھتے ہیں اور ہر کوئی اپنی دوکان چمکاتا ہے۔ یعنی برہمن یہ چاہتے ہیں کہ زبان سے کچھ اشلوک سنائیں اور گل فروش ایک مٹھی کمہلائے ہوئے پھول (لوگوں کو) پکڑا کر کچھ رقم بٹور ہی لیتے ہیں۔

پھر حاکم (شہر) کے قلعے کی سیر کی گئی۔ (241) وہ پہلے ہی بہت شکستہ تھا اور اب بھی کمال وتمام بہت شکستہ ہے۔ اس (شہر) کے کچھ حصے مخلوط مٹی سے بنائے گئے ہیں اور اس کی آبادکاری بھی پرانی طرز پر ہے کہ ہر قوم کا اپنا علیحدہ محلہ ہے اور سب لوگ اپنے اپنے پیشوں میں اور روزی روٹی میں مشغول ہیں۔ کوئی کسی کے کام میں رکاوٹ نہیں ڈالتا۔ کہتے ہیں کہ اس ضلع میں تمباکو بہت اچھا ہوتا ہے۔ (242) چنانچہ تمباکو کے جو بھی کھیت نظر پڑے ان کے پتے بہت چوڑے اور موٹ پائے۔ میں نے دیکھا کہ ایک شخص اس (تمباکو) کا ایک سبز پتا چن رہا ہے۔ میں نے پوچھا کہ ''اس کا کیا کرے گا؟'' اس نے کہا کہ اس کو سورج سے یا پھر آگ سے تھوڑا سا خشک کر کے اور اس میں شکر ملا کر اس کے کش لوں گا۔ میں نے دل میں سوچا کہ یہ نامعلوم بات بھی معلوم ہونی چاہئے چنانچہ میں نے کہا کہ ''کچھ پتے چن کر اس طرح سے کہ اس پتے کے سے ہو جائیں کراکو (243) بنالیا جائے۔'' جب میں نے اس کا کش لگایا تو تمباکو کی اس حقیقی جگہ پر عجیب قسم کا لطف آیا۔

اس جگہ راقم حروف کا خیمہ دریائے ثوت پر لگایا گیا۔ میں نے ایک بیلچے والے (بیلدار) (244) کو خیمہ کا چبوترہ درست کرنے کی ہدایت کی۔ پھر جو دیکھا تو وہ جلد ہی فرش پر براجمان ہے اور آرام کر رہا ہے۔ اس نے (میرے سرزنش کرنے پر) بہت نا ملائم جواب دیا۔

چونکہ سورج کی گرمی، دھول و خاک کی وجہ سے کافی پریشان تھا لہٰذا مزاج قابو میں نہ رہا اور اس کو ایک تھپڑ رسید کر دیا وہ بھی اس زور کا کہ وہ خیمے میں ہی فرش پر گر پڑا۔ اس کے بعد ہوشیار ہو کر خود کو ملامت کی کہ اس دنیا اور دنیاداری پر لعنت ہو جو اس طرح کی نامناسب حرکات کی وجہ بنتی ہے۔ کیونکہ اگر کوئی چیز حاصل نہ کی جا سکے تو دوسروں کی خیر کا باعث ہو جانا چاہئے۔ لیکن اگر حاصل ہو جائے تو وہ (چیز) آدمیت سے دور (لے جاتی ہے)۔ اس لئے کہ تمام لوگ ایک ہی طرح کے انسان ہوتے ہیں۔

سن اٹھائیس مذکورہ کے ماہ ربیع الثانی کے حالات، قائم خان بہادر قائم جنگ کا حضور کے حسب الحکم دربار میں پہنچنا اور نواب صاحب وزیر الممالک بہادر کے رسالے میں اقدس اعلیٰ کی ملازمت (کرنے) پر تیار ہو جانا۔

یکم ربیع الثانی۔ (245) بادشاہ کے جلوس کا اٹھائیسواں سال شروع ہو گیا۔ بڑے بڑے امراء نے پیشکشیں گزاریں اور مبارک بادیں پیش کی۔ بادشاہ کے گروہ میں سے نواب صاحب وزیر الممالک بہادر معہ انتظام الدولہ بہادر و معین الملک بہادر و اعزالدولہ بہادر (246) و حیات اللہ خان بہادر (247) و خانجہان بہادر (248) و دیگر سرداران مغلیہ تقریباً چالیس ہاتھیوں پر سوار ہو گئے اور دس ہزار سے زیادہ سوار (سپاہی)، قائم خان بہادر قائم جنگ جو بادشاہ کے حکم کے مطابق خدمت میں پہنچ گیا تھا، کے استقبال کے لئے سوار ہو گئے۔ قائم خان بہادر اس طرح سے کہ جب ان دونوں خیموں کے درمیان فاصلہ تھا کہ جن میں سے ایک نو عدد چوبوں والا خیمہ دیوان خانہ تھا جبکہ دوسرا خیمہ خلوت خانہ تھا وہ ان دونوں خیموں کے درمیان میں خود بیٹھا انتظار کر رہا تھا۔ جیسے ہی نواب صاحب خیمے کے پاس پہنچے تو قائم جنگ نے ڈیوڑھی (249) تک آگے آ کر باقاعدہ قدمبوسی کا ارادہ ظاہر کیا نواز صاحب اسے شفقت سے گلے لگا کر بغل گیر ہو گئے اور خان مذکور کے ہاتھ میں ہاتھ ڈالے ہوئے دیوان خانے میں آ کر بیٹھ گئے۔ پہلے تو قائم خان کے بھائیوں نے جو خدا کے فضل سے پندرہ سولہ تھے (250) حاضری دی پھر ان کے سرداران شجاعت خان وغیرہ (251) آئے۔ نواب صاحب نے ہر ایک کی حیثیت کے لائق اس پر شفقت فرمائی۔ ایک گھڑی کے بعد دیوان خانے سے اٹھ کر خلوت خانے میں آ گئے۔ قائم خان نے سات جوڑی کپڑے اور

ایک تھیلی جواہرات کی اور سات گھوڑے اور دو عدد ہاتھی پیش کیئے۔ نواب صاحب نے ایک جوڑی کپڑا اور وہ بھی بڑے تکلف کے ساتھ قبول کیا۔ دو تین گھڑی وہیں پر بیٹھے رہے اور پھر کچھ احکامات جاری کر کے خیمہ گاہ میں واپس آ گئے۔

اسی روز تیسرے پہر قائم خان بہادر شاہی دربار میں حاضر ہو کر نواب صاحب کے رسالے میں (شمولیت کرنے کی) سعادت حاصل کر کے بادشاہ کی ملازمت میں آ گئے اور ایک ہزار اشرفیاں نذر گزاریں۔ بادشاہوں کے فضل و کرم کے تقاضوں کے عین مطابق بادشاہ کی قدمبوسی پر مامور کیئے گئے۔ اور (بادشاہ کی) زبان درفشاں پر یہ بات جاری آئی کہ "آپ دیر سے آئے ہیں۔" گزارش کی کہ فوج کو تنخواہ دینے اور ساز و سامان کی تیاری میں ایک طرح کی دیر ہو گئی جو اپنے اختیارات میں نہ تھی ورنہ تو یہ خانزاد فدویت نژاد (252) اسی دن سے کہ جب حضور اشرف کی جانب سے طلبی کا حکم ملا تھا حویلی سے اٹھ کر خیمہ گاہ میں جا بیٹھا ہے۔ ارشاد قدسی ہوا کہ "تمہاری خانزادگی اور فدویت میں بھلا کیا شک ہے؟" شش پارچہ خلعت و تہ نشان تلوار (252-A) کے ساتھ ایک آلۂ موسیقی جس پر جڑاؤ کا کام ہوا اور ملازمت کے لئے ایک ہاتھی بھی مرحمت ہوا اور نواب صاحب کے رسالے میں شامل ہو گئے۔

جس روز قائم جنگ نے ملازمت کی سعادت حاصل کی گلالبار دروازے کے شروع سے لیکر دیوان خاص کی جالی تک سرخ پوشوں اور توپ خانے کے منگباشیوں (253) نے شور شروع کر دیا اور (پھول کے رنگ جیسے) سرخ ابریشمی جھنڈے بڑی بندوقوں (254) پر لگا کر راستے کے دونوں جانب کھڑے کر دیئے تھے نیز دیگر طرح کے انتظامات بھی بہت زیادہ کئے گئے تھے۔ لشکر کا انتظام کرنے والے ملازمین (ڈھول پر) بے اختیار چھڑیاں مارے جاتے تھے۔ جس وقت قائم خان بادشاہ سے رخصت ہوئے تو بندگان حضرت نے میر آتش سے کہا کہ آج کے دن یہ سارا انتظام مناسب نہیں تھا۔ (255)

دوسری تاریخ (256) نواب صاحب بادشاہ کے حکم کے مطابق پیشخانہ کو آگے لے گئے اور تیسری تاریخ (257) کو حضرت دولت و اقبال نے خود کوچ کیا۔ حکم ہوا کہ قائم جنگ، عمدۃ الملک مدار المہام کا ہراول (دستہ) ہوں گے۔ کوچ کے دن تیز ہوا چلنے کی وجہ سے دھول اور مٹی اس قدر زیادہ تھی کہ آدمی کو اتنی طاقت بھی نہیں تھی کہ آنکھ کھول سکے۔ اس منزل پر اس فقیر کا خیمہ دریائے

ثوت کے کنارے تھا اور پانی کے اس جانب تھوڑے فاصلے پر آم کے درختوں کا جلوہ (نظر آرہا) تھا۔ یہاں سورج طلوع ہونے کے وقت جب آسمان کا صفحہ چاک ہوتا ہے تو ایک عجیب قسم کا نظارہ سامنے ہوتا ہے۔ گویا کہ سحر نگار مصوروں نے قضاوقدر کو سرخ تنہ چند کے صفحے پر زنگار (258) سے کھینچ دیا ہے یا پھر قدرتی طور پر چمن سجانے والوں نے میر آب (259) کو سرو کے کچھ درخت لالہ زار خیابان میں نشو و نما کے لئے دے دیئے ہیں۔ تقریباً ایک ہفتے تک اس منزل پر قیام رہا۔ ایک روز تو اس شدت سے ہوا چلی کہ لشکر والوں میں سے اکثر کے خیمے ہوا میں اڑ گئے۔ میں بھی (ڈھول میں) لت پت ہو گیا۔ اکثر خیمے گر پڑے اور ان کی زمین اکھڑ گئی اور وہ (خیمے) ختم ہو گئے۔ اس بارے میں جو رباعی کہی تھی وہ تحریر کرتا ہوں۔ مصنف عرض کرتا ہے:

سالی کی محمد شہ خاقان سعید
لشکر سمت مملکت شرق کشید
روزی از باد خیمہ ہای مردم
چون کاغذ باد (260) آسمانی گردید (261)

حادثہ

ایک روز اسی منزل پر خان مہربان حاتم علی خان (262) پسر حیات محمد خان مرحوم جو بہت دلچسپ نوجوان ہیں نے ہرن کی ایک ران اس فقیر کے لئے بھجوائی۔ رات کو خدمتگار پچھی رام (263) نے جوان دونوں اس حد تک بہرا ہو گیا ہے کہ بگل کی آواز بھی نہیں سن سکتا۔ ہمارے روبرو اس کے کباب تیار کئے۔ بہت اچھے پکے تھے۔ سب دوست ان (کبابوں) سے محظوظ ہوئے۔ مذکورہ "خانہ آباد" خان کو یہ کہلا بھیجا اور یہ بیت تحریر کیا...... میرزا جلال اسیر (264):

مزہ کباب آہو نمک خلاصی او
اگر ازمی مہروت قدحی کشیدہ باشی (265)

اور ایک رات من موہن کے ذریعے ترکاری، کریلے و پوست بادرنگ بھی تیار کرائی گئی۔ بہت لذیذ تھی۔ اور اس جگہ پر ہی نواب صاحب وزیر الممالک بہادر نے رگ سے خون نکالا۔ ایک اشرفی نذر گزاری گئی۔

پانچ تاریخ۔ (266) اسی جگہ پر عمدۃ الملک بہادر وقائم جنگ نواب صاحب وزیر الممالک بہادر کے گھر آئے اور مجلس مشورہ منعقد ہوئی۔ طے پایا کہ علی محمد کے معتبر لوگوں کو طلب کرنا چاہئے اور جو کچھ دل میں ہے اس سے انہیں آگاہ کرنا چاہئے۔ اگر صلح سے بات بنتی ممکن ہے تو ضرورت ہی نہیں ہے کہ جنگ کی جائے۔ اور اس صورت میں کہ اگر وہ حکم قبول نہ کریں تو ان لوگوں کو خبردار کر دینا چاہئے۔ نواب صاحب کی ملازمت میں موجود ایک جماعدار عاقل بیگ (267) نامی کو اور قائم جنگ کے جماعداروں میں سے بھی ایک کو علی محمد کے معتبر لوگوں کو لانے پر مامور کر دیا گیا۔

آٹھ تاریخ۔ (268) وہ لوگ علی محمد کے معتبر حضرات پائندہ خان (269) و فتح محمد خان (270) وشاہ معصوم (271) کو لے کر واپس لوٹے۔

نو تاریخ۔ (272) عمدۃ الملک بہادر اور قائم جنگ نواب صاحب کے گھر آئے روہیلہ کے معتبر لوگ پائندہ خان وغیرہ بھی حاضر ہوئے۔ حکومتی اراکین نے شاہی فرمان جو ایک کروڑ روپیہ، تمام توپخانے کے ساتھ ادا کرنے اور تعلقہ سے دست بردار ہونے اور ملازمت (شاہی) کی سعادت حاصل کرنے کے بارے میں تھے، ان کو پہنچائے گئے۔ لیکن کوئی فائدہ نہ ہوا۔ نواب صاحب نے اس (روہیلہ) کے معتبر لوگوں کو مخاطب کر کے فرمایا کہ ''ایسا معلوم ہوتا ہے کہ موت نے اس کم بخت کی جان کا گریبان پکڑ لیا ہے۔ ایسا نہیں لگتا کہ وہ اسے کچھ اور دن زندہ رہنے کو چھوڑے گی۔'' جی ہاں:

''چو تیرہ شود مرد را روزگار
همہ آن کند کش نباید بکار'' (273)

یہ وحشت آمیز الفاظ زبان پر لا کر ان کو رخصت کیا اور خود اٹھ گئے۔ الٰہی! جب میں اس معاملے سے مطلع ہوا تو میری طبیعت خراب ہوگئی۔ میں نے یہ غزل کہی۔ مصنف عرض کرتا ہے:

شب زکف زلف یار را دادیم
چقدر طول کار را دادیم
می نہ خوردیم و فصل گل بگذشت
مفت از کف بہار را دادیم

پیش تقدیر عقل مجبور است
بخدا اختیار را دادیم
دیگر از جان ماچہ می خواہید؟
دلکی بود، یار را دادیم
سر بصحرا از دیم فصل بہار
داد سیر وشکار را دادیم
شعلۂ عشق شد بلند از دل
آتشی این حصار را دادیم
پر، درین گرد و خاک، ماتصدیع
مخلص خاکسار را دادیم (274)

دوسرا روز دس تاریخ۔ (275) حکومت کے برگزیدہ اشخاص نے بادشاہ کے حضور مجرا بجا لانے کی سعادت حاصل کی اور گزشتہ روز کی مجلس کے حالات عرض کئے۔ بادشاہ کی مبارک زبان پر یہ الفاظ جاری ہوئے کہ اس بات کے پیش نظر کہ مسلمان (276) کا خون نہ بہے، یہ (بات) پوری کرنا لازم تھا۔ چونکہ (مخالف) ابھی تک خواب غفلت سے نہیں جاگے ہیں اور موت ان کے سروں پر پہنچ گئی ہے لہٰذا بادشاہی ہمت وحوصلے اور ذمہ داری کے مطابق ان بدنصیبوں کی سرکوبی کرنا لازمی ہے۔

گیارہ تاریخ کو نواب صاحب شاہی پیش خانے کے ساتھ اور بارہ تاریخ کو حضرت بدولت واقبال خود کوچ کر کے بن گڑھ جو علی محمد کا مسکن تھا سے سترہ کروہ اس جانب قیام پذیر ہوئے۔ (277)

راقم سطور کا خیمہ دریائے ثوت کے کنارے دیوان تن عبدالمجید خان (278) کے ڈیرے کے ساتھ لگا اور اس روز ہوا جو بہت ہی شدت سے چل رہی تھی شام تک کم نہیں ہوئی۔ چونکہ فقیر نے رات کو کچھ نہ کھایا تھا اور جو کچھ حاضر تھا وہ ''پوری'' (279) کی ایک قسم ہی تھا لہٰذا نورچشم کامگار رائے کرپارام منزل پر جیسے ہی پہنچا تو نندو (280) خدمتگار جو برہمن ہے کہ ذریعہ سے کھچڑی تیار کرائی۔ میں نے بڑے مزے سے کھائی اور خدا کا شکر ادا کیا۔ اس کے بعد اس بغیر لکڑی کے خیمے

میں جو دریا کے کنارے بلبلے جیسا تھا قیلولہ کیا۔

اس جگہ پر فوج کے اکثر بہادروں نے جب دیکھا کہ اب صلح ممکن نہیں ہے اور جنگ لازم ہے تو بہانہ کر کے شاہجہان آباد کی راہ پکڑ گئے۔ یعنی "اے دوستو! یہ معلوم ہونا چاہئے کہ اب اس جگہ تلوار اور تیر کا کام ہے اگر ہم زندہ رہیں گے تو نوکری بہت کچھ ہے۔ ہم سپاہی نہیں ہیں کہ نقد (یعنی روپیہ سمجھ کر) جان قربان کر دیں۔ ہم ملتوی مل اور پکوڑی داس ہیں۔(281) شہر میں جا کر بیوہار کیوں نہ کریں؟" الٰہی! بھیہ باکھمل جس کے ذمے اس سفر میں خانگی پیش کاری کا کام تھا وہ بھی ان لوگوں میں سے تھے۔

بارہ اور تیرہ تاریخ۔(282) قیام کیا گیا۔ تیرہ تاریخ کو مسودا وراق کو بخار ہو گیا اور میں نے خان مہربان حکیم عبد الشافی خان (283) کی تجویز کردہ دوا کھائی۔ سترہ تاریخ (284) کو غسل صحت کیا اور اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کیا۔ یہ بخار صفراوی (285) نوعیت کا ہوتا تھا۔ لطیفہ:

اس جگہ پر چونکہ دریائے ثوت کے اس جانب اس فقیر کے خیمے کے بالکل سامنے پشتۂ خاک پر ڈھاک کا جنگل واقع تھا، اس لئے ایک روز یاران محفل میں سے ایک نے کہا کہ نیچی سطح کے باغ اکثر ہوتے ہیں لیکن یہ اونچا باغ ہے۔ برادر عزیز القدر میر نجم الدین علی نے کہا کہ "نہیں، بلکہ (یہ تو) بلند باغ ہے۔" اور بلند باغ دراصل ان شاہی باغات میں سے ایک (باغ) کا نام ہے کہ جو شاہجہان آباد میں ہے۔

اس جگہ پر نواب صاحب وزیر الممالک بہادر نے طے کیا کہ محل کے ملازمین کو بعض بڑے امور سرانجام دینے کی غرض سے سنبھل بھیج دیں لیکن ایسا ہو نہ سکا۔

چودہ تاریخ۔(286) تین کروہ جریبی تک کوچ کیا گیا۔

پندرہ تاریخ۔(287) نواب صاحب نے بادشاہ (کے حضور) مجرا بجا لانے کی سعادت حاصل کی۔

سولہ تاریخ۔(288) تین کروہ ایک جریب مزید کوچ ہوا۔ چونکہ شاہی لشکر سے بن گڑھ کا فاصلہ کم رہ گیا تھا لہٰذا رات کو لشکر معلیٰ میں پوری احتیاط برتی گئی۔

سترہ تاریخ۔(289) نواب صاحب وزیر الممالک بہادر اور دیگر حکومتی سرکردہ اراکین نے بادشاہ کے حضور (آنے کی) سعادت حاصل کی۔ چونکہ بعض وجوہات کی بناء پر میر آتش اور

قائم جنگ کے درمیان ناراضگی تھی لہٰذا نواب صاحب نے بندگان حضرت ظل اللہ جو خدا کی مخلوق کی پشت و پناہ ہیں کے حکم کے مطابق دیوان خاص کے خیمے میں دونوں امراء کو ایک دوسرے کی (محبت کی) گرمی دلا کر بغل گیر کر دیا۔ اسی مجلس میں بن گڑھ کا نقشہ نواب صاحب عمدۃ الملک مدا المہام کی وساطت سے (بادشاہ کی) نظر انور سے گزارا گیا۔ اور اسی مجلس میں نواب صاحب وزیر الممالک بہادر کو حکم ہوا کہ اس کے بعد شاہی پیش خانے کو اپنے ساتھ لے کر چلیں اور یہ جلیل القدر حکم بھی صادر ہوا کہ آئندہ (شاہی) دولت خانے کے خیمے چھوٹے سائز کے کھڑے کئے جائیں۔

اس جگہ مسود اوراق کا خیمہ شاہی آموں کے درمیان لگایا گیا کہ یہاں پر ایک پختہ مگر چھوٹا گنبد بھی کھڑا تھا اور اغلب امکان یہ ہے کہ یہ جگہ عبادت گاہ رہی ہو گی۔ درخت سے بہت سے آم اتار کر کچھ کا اچار تیار کیا گیا اور کچھ سے پال (290) بنایا گیا۔ میں اپنی دیوانگیوں پر عاشق جاؤں کہ لشکر میں ہوتے ہوئے پال تیار کرنا تو درست ہے مگر اچار تیار کرنے کا خیال اور وہ بھی اس پکڑ دھکڑ کے وقت دردسر سے خالی نہیں تھا۔ الٰہی! پال میں سے تھوڑا سا معہ خشک گڑ کے کہ جو لشکر میں خرید لیا تھا، وہ (چیزیں) تحفتاً شہر کو روانہ کر دیں۔ اسی مقام پر مشرقی ہوا کے بہت تیز چلنے کی وجہ سے رات کا بچا ہوا پانی کہ جو قبل ازیں ٹھنڈا ہو چکا تھا، پی کر بہت مزہ آیا۔

اٹھارہ تاریخ۔ (291) کوچ ہوا اور دریائے ثوت کو لشکر فیروزی اثر کے پڑاؤ ڈالنے کی وجہ سے عزت نصیب ہوئی۔ اسی جگہ پر اس وجہ سے کہ پیش خانہ کو پہلے سے نہیں لایا گیا تھا۔ بھیڑ (291-A) اور دھکم پیل کی وجہ سے بہت تکلیف و پریشانی ہوئی۔ یہ فقیر بھی غلط راستے پر کافی آگے نکل گیا اور بہت سا فاصلہ طے کرنے کے بعد واپس لوٹ آیا۔ جب اپنی جگہ پر واپس آیا تو مجھے خیمہ لگانے کے لئے جگہ بالکل نہیں ملی۔ پھر اگاڑی (292) کی جانب آیا اور وہاں پر میر منزلی نور چشم ستودہ اطوار رائے فتح سنگھ کے ہاں دریائے ثوت کے کنارے کہ جس کے سامنے سبزہ زار تھا خیمہ لگایا اور وہ بھی اس طرح سے کہ خیمہ کے تین جانب پانی تھا۔

سانحہ

اس جگہ پر ایک بڑا بانس جو اس فقیر کے فیل بان نے علی محمد کے ایک جماعدار دوندے خان

(293) کے تعلقے سے موضع بسی (294) سے بوقت غارت وتاراج اٹھالیا تھا (295) کے بارے میں میں نے کہا کہ خلوت خانے کے صحن میں کھڑا کر کے شام کے وقت اس کے سرے پر ایک چراغ جلادیں۔ اس طرح کے چراغ کو ہندی میں ''اکاسی دیہ'' (296) نام دیتے ہیں۔

انیس تاریخ۔ (297) کوچ کیا۔ چار کروہ جریبی طے کرنے کے بعد ثوت کے کنارے قیام کیا اس جگہ پر احتیاطاً بادشاہ اور نواب صاحب کے گروہ جو ایک جگہ اکٹھے ہوئے تو اس وجہ سے بہت بھیڑ اور دھکم پیل پیدا ہوگئی۔ اور پھر دھول اور مٹی اس حد تک تھی کہ آدمی کی شکل صحیح نظر نہیں آرہی تھی۔ لوگوں کے سر و چہرے اس شکل کے ہو گئے تھے کہ جیسے نقاش گرد و خاک کے ذریعے صفحے پر لائنیں کھینچتے ہیں۔

اس جگہ پر بھی فقیر کا خیمہ اگاڑی کی طرف دریائے ثوت پر لگا ہوا تھا۔ قبل اس کے کہ خیمہ لگایا جاتا، دریا کے اس جانب ایک دیہات پر نظر پڑی جو آباد اور بہت سرسبز علاقہ دکھائی دیتا تھا۔ فقیر پانی سے گزر کر اس جانب آنکلا۔ اس دیہات کی چھپر بندی درست تھی اور بعض گھروں کے حالات بیان کرنے لائق تھے لیکن لوگ اس جگہ برائے نام نظر آتے تھے جبکہ بعض گھروں میں سامان موجود تھا۔ غرض کہ اس شہر پر وہ بات صادق آتی ہے جو افسانہ طراز کہتے ہیں کہ فلاں آبادی کو دیکھا تو آدمیوں کے علاوہ ہر چیز موجود ہے۔ بہر حال دیہات کے اس جانب آم کے درخت کے نیچے کہ جہاں پر ایک پختہ کنواں موجود تھا کچھ دیر آرام کیا اور گھر سے پلنگ منگوا کر قیلولہ کیا کہ جس کا میں بچپن سے عادی ہوں۔

عمدہ اطوار نور چشموں نے بینگن، ساگ خرفہ اور وہاں کے ایک باغیچے سے قدرے لکڑیاں لے کر انہیں آپس میں ملا کر ان کا سالن پکایا اور (میرے آگے) حاضر کیا۔ چونکہ فقیر پرہیز کرتا تھا لہٰذا میں نے نہیں کھایا۔ تیسرے پہر کو خیمے میں آ گیا۔

بیس تاریخ۔ (298) کوچ ہوا۔ ہجوم تھا اور لوگ سامان اٹھانے کی تیاری میں تھے کہ اسی وقت بارش شروع ہوگئی اور یخ ہوا چلنے لگی۔ لشکر کے لوگوں کو سخت تکلیف ہوئی۔ چونکہ راقم سطور و برادر مہربان رائے سکھپت رام و نور چشم عزیز تراز جان رائے کرپا رام رتھ میں سوار تھے اس لئے ہم بڑے مزے میں رہے۔ قرۃ العین رائے فتح سنگھ چونکہ سست مزاج ہے لہٰذا وہ پالکی میں سوار تھا۔ اللہ کا شکر ہے کہ اسی روز ان (فتح سنگھ) کی حرارتِ (بخار) بھی ختم ہوگئی۔ تو میں نے اللہ تعالیٰ کا

سجدہ شکر ادا کیا اور اسی روز ایک تو تند ہوا اور بارش کی زیادتی کے سبب اور دوسرے فریقین کے درمیان فاصلے قریب تر ہونے کی وجہ سے فوج نے آدھے کروہ سے کچھ زیادہ کوچ نہیں کیا بلکہ اس سے بھی کم (کوچ) کیا۔

بائیس تاریخ۔(299) قیام ہوا۔ تیئس تاریخ (300) کو جہاں پیا کا جھنڈا حرکت میں آیا اور ڈھائی کروہ جریبی طے کرنے کے بعد دریائے ثوت کے کنارے لشکر ظفر پیکر کا پڑاؤ پڑ گیا۔ اور اس منزل سے بن گڑھ تک کا فاصلہ چار کروہ رسمی سے بھی کم تر تھا۔ فقیر کا خیمہ اگاڑی کی مانند ثوت کے کنارے لگا ہوا تھا کہ گویا اس سے آگے کوئی دوسرا خیمہ نہیں تھا۔ عوالی منزلت سید شہامت خان بارھہ (301) کا خیمہ اس عاجز کے ڈیرے کے قریب تھا۔ شاہجہان آباد میں بھی ان کی حویلی اسی محلے میں ہے کہ جس میں یہ فقیر رہائش پذیر ہے۔(302) اسی دن سہ پہر کو خبر آئی کہ مخالف کی فوج دکھائی دینے لگی ہے۔ پہلے عمدۃ الملک بہادر اور میر آتش سوار ہوئے اور اس کے بعد نواب صاحب وزیر الممالک بہادر سوار ہوئے اور لشکر سے آگے جا کر توپخانے سے گولہ باری کی۔ (مخالف کے) جو لوگ نظر آرہے تھے انہوں نے جائے فرار اختیار کی۔ حکومت کے (یہ) سرکردہ لوگ شام کے وقت واپس لوٹ آئے اور بادشاہ کے (آگے) مجرا بجانے کی سعادت حاصل کی اور طے پایا کہ کل حکومتی اراکین اکٹھے سوار ہو کر قلعۂ بن گڑھ پر حملہ کریں گے۔

رات کے وقت رسوائے زمانہ مخالف کا لشکر ظفر پیکر فیروزی آثار کی جانب آتش فشاں تیر (راکٹ) پھینکنا (303)

چوبیس تاریخ۔(304) قیام تھا۔ سواری کی تکلیف کی وجہ سے دوسرے روز پھر حملے کو ملتوی کیا گیا اور اراکین سلطنت میں سے کوئی ایک بھی اپنے گھر سے سوار ہو کر نہیں نکلا۔

لیکن رات کو ایک عجیب حادثہ پیش آیا۔ رات کو تقریباً دوسرے پہر اچانک ہی لشکر میں شور بلند ہو گیا اور ہر جانب سے توپ اور رھکلہ (305) کی نہ بند ہونے والی آوازیں کان میں پڑنے لگیں۔

فقیر جس نے اس واقعہ سے شاید ایک گھڑی پیشتر ہی بستر خواب پکڑا تھا جاگ اٹھا اور اپنے آدمیوں کو حسب مراتب احتیاط برتنے کی تاکید کر دی۔

اسی دوران بن گڑھ کی جانب سے جنگی بان (راکٹ) (306) بڑے شور وغضب کے ساتھ ہوا میں بلند ہوئے اور جیسے آسمانی بجلی خرمن پر گرتی ہے اسی طرح سے لشکر پر گرنے لگے اور جس جگہ بھی گرتے ہنگامہ اور چیخ وپکار مچا دیتے۔ کچھ بان فقیر کے خیمے کے پاس بھی آن پڑے لیکن اللہ کا شکر ہے کہ کسی کو کوئی نقصان نہ ہوا اور یکے بعد دیگرے ایسا معلوم ہونے لگا کہ گویا مخالف کی فوج لشکر میں گھس آئی ہے یہاں تک کہ اس فقیر کے نوکروں نے خیمے میں روشن شمع کو بجھا دیا۔ یقین ہو گیا کہ مخالف کی فوج نے شب خون مارا ہے۔ (307) میں نے ساتھیوں سے کہا کہ سواریوں کو تیار کر کے اور اپنی اپنی کمر باندھ کر جگہ جگہ مستعد اور خبردار رہیں اور کوئی بھی اپنی جگہ سے حرکت نہ کرے۔ نور چشمان کامگار کہ خدا ان کو کامیاب کرے، اور (میرے) غم خوار ساتھی ہتھیار باندھ کر فقیر کے سامنے آ کر بیٹھ گئے۔ بندوقچی، ڈھال اٹھانے والے اور دیگر لوگ خیمے کے گرد و پیش جگہ سنبھال کر مستعد ہو گئے اور جنگ کے لئے تیار ہو گئے۔ میرے پاس جو کہ شاہجہان آباد میں اپنا ذہن چھوڑ آیا تھا، گل مدن بان نہیں تھا۔ (308) میں دریا کے کنارے اپنے خیمہ کے سامنے چبوترے پر بیٹھا تقدیر کی رنگ آمیزی کا نظارہ دیکھ رہا تھا اور اس محفل جنگ کی خوشبودار بتیوں سے اٹھتا ہوا دھواں دیکھ کر خوش ہو رہا تھا۔ (309)

الٰہی! مورچے کے سپاہی خبردار ہو گئے تھے۔ اب توپ اور رہکلہ اور تیر اس جانب سے بھی داغے جانے لگے تھے۔ افواج طلایہ بھی چاروں جانب سے حرکت کر کے مقابلہ کو قدم بڑھانے لگیں تھیں۔ تقریباً چار گھڑی رات باقی تھی کہ فتنے کی یہ آگ بس تھوڑی ہی سی رہ گئی اور دلوں کو ایک طرح کا آرام حاصل ہوا۔

اس رات سے اگلا دن پچیس تاریخ (311) قیام کیا گیا۔ سلطنت کے سرکردہ لوگوں اور قائم جنگ، حضور پرنور کے پاس حاضری دینے کے بعد اور کامیابی وکامرانی کی دعا حاصل کرنے کے بعد افواج کو ترتیب دے کر اور حملے کے لئے نقارۂ جنگ بجا کر سوار ہو لیے۔ اہل لشکر کو یقین ہو گیا کہ آج مخالف کا کام ختم ہو جائے گا اور بن گڑھا اگرچہ قندھار (312) کی طرح ہی ہے مگر وہ خاک سیاہ کے برابر مل جائے گا۔ اراکین سلطنت ڈیڑھ کروہ راستہ طے کر کے ایک باغ میں رک گئے اور کھانا کھانے کے بعد چھڑکاؤ شدہ مختصر (چھوٹے) خیموں میں خشک گھاس پر آرام کیا کہ گویا یہ (زمین) شروع سے ہی اس روز کے لئے موجود تھی۔ اور سچی بات تو یہ ہے کہ ہوا بہت زیادہ گرم

تھی۔ اس حد تک تیز کہ اکثر لوگوں نے یہ معلوم ہونے کے باوجود کہ آج حملہ کرنا ہے زرہ و بکتر اتار دیا تھا۔ سورج کی شدت، حرارت اور پانی کی کمی سے جان بلب ہوئے پیچ وتاب کھاتے تھے۔ اور جنگ بھی کرتے تھے۔ لیکن دو باتیں رکاوٹ بن رہی تھیں۔ ایک تو یہ کہ دوسری جانب سے کوئی بھی برآمد نہیں ہوا۔ اور دوسرے یہ کہ جنگل جو شاید ایک گولے سے ہی پورا جل جاتا کو کاٹنے میں کلہاڑیاں استعمال کرنے والوں کو جس ہوشیاری سے کام لینا چاہئے تھا وہ ہوشیاری انہوں نے نہیں دکھائی۔ (313)

الٰہی! چار گھڑی دن باقی تھا کہ نقارہ بجانے والے خیریت سے لشکر معلّٰی میں (واپس) داخل ہو گئے۔

(اگلی) صبح چھبیس تاریخ۔ (314) اراکین دولت میں سے کوئی بھی سوار نہ ہوا۔ دراصل کل کی سواری کے خیال سے سب کو ایک کوفت سی ہو گئی تھی۔ اور اسی روز پہلے تو یہ مشہور ہو گیا کہ علی محمد نے نواب ملکہ زمانی (315) کی وساطت سے تابع داری حاصل کر لی ہے۔ پھر یہ مشہور ہوا کہ میر آتش کے ملازم جماعداروں میں سے ایک جماعدار مخالف کو لانے گیا ہے۔ اس (علی محمد) کی فرمانبرداری میر آتش کی معرفت ہوگی۔

ابھی یہ خبریں پایہ تحقیق کو نہ پہنچی تھیں کہ لوگوں کی زبانوں پر یہ بات آ گئی کہ میر آتش کی زیر نظامت صوبہ اودھ کا نائب (صوبیدار) نول (316)، بادشاہ کے پاس آیا ہے۔ اُس کے اور مخالف کے درمیان جنگ شروع ہو گئی اور مخالف کا بخشی پائندہ خان مارا گیا۔ (317) اور میر آتش اس بات سے مطلع ہو کر (اپنی فوج کی) مدد کے لئے سوار ہو گیا ہے۔ نواب صاحب وزیر الممالک بہادر خود تو (برائے امداد) سوار نہ ہوئے البتہ اپنی سرکار کے بخشی اول صوفی بیگ خان (318) کو اس بات پر مامور کیا کہ آگے جا کر میر آتش کا ساتھ دیں۔ آخر ہرکاروں کی زبانی معلوم ہوا کہ جنگ نہیں ہوئی ہے۔ چونکہ نول آ رہا تھا تو اس بات کے پیش نظر کہ مبادا مخالف فریق اس کا راستہ نہ روکے، میر آتش سوار ہو گیا ہے۔ اور پھر اس حرکت سے یہ فائدہ بھی میر آتش کے پیش نظر تھا کہ چونکہ بادشاہ کی خدمت میں یہ بات پہنچا دی گئی تھی کہ نائب نظامت کی فوج اگرچہ زبردست ہے مگر ابھی تک آئی نہیں ہے۔ اس حالت میں اہل لشکر کو اس آمدہ فوج کی تعداد معلوم نہیں ہونی چاہئے اور اس ضمن میں مغالطہ باقی رہنا چاہئے۔ دراصل میر آتش کی رائے درست تھی اس وجہ

سے کہ ع

چہ خوش بود کہ برآید بیک کرشمہ دو کار (319)

مختصر یہ کہ میر آتش ،نول کو خود لے کر سہ پہر کو بڑے لشکر میں داخل ہو گئے۔

ستائیس تاریخ۔(320) اراکین خلافت نے بادشاہ کے حضور مجرا بجالانے کی سعادت سے بہرہ ور ہونے کے بعد حوضہ ہائے آہنی (321) میں کہ جو جنگ کے یوم کی لازمی (تدابیر) میں سے ہے سوار ہو کر بن گڑھ کی جانب پیش قدمی کی اور سفر کا ایک حصہ طے کرنے کے بعد ہموار میدان میں ٹھہر گئے اور مشورہ کرنے کے بعد طے پایا کہ اسی جگہ پر ڈیرہ کرنا چاہئے۔ چنانچہ چھوٹے خیمے کھڑے کئے گئے اور توپخانے کو مورچوں کی طرح سے خیمہ گاہ کے (ہر) جانب لگا کر پانی کی قلت کے پیش نظر پھاوڑے استعمال کرنے والوں (بیلداروں) کو کنویں کھودنے پر مامور کر دیا اور توپوں کو آگے لا کر بن گڑھ کی جانب گولے داغنے پر مامور کر دیا۔

بیزاری

کچھ معلوم نہ ہو پایا تھا کہ خلافت کے امراء اور حکومت کے بڑے لوگوں نے دل میں کیا ٹھانی ہے۔ اسی وجہ سے اس طرح کی نامناسب تدابیر سن گیارہ سوا کاون (322) میں ٹھہری تھیں کہ جب قزلباش (323) ہندوستان پر مسلط ہوا تھا اور یہاں کے لوگوں پر وہ سب گزرا جو کہ گزرا۔ (324) علی محمد کہ جو چند موضعات سے زیادہ کا تعلقہ دار نہیں ہے یہ سب نہیں جانتا کہ بادشاہ ہندوستان بذات خود اس کی سرزنش کے لئے متوجہ ہوا ہے اور اس کی اقامت گاہ سے تین کروہ فاصلہ ہونے کے باوجود نہ تو وہ (علی محمد) اس (بادشاہ) کی ملازمت کی سعادت حاصل کرنے آیا اور نہ اب اس کے پاس فرار ہو سکنے کا کوئی راستہ باقی بچا۔ اور عمدہ ہائے خلافت ہر روز حملے کی نیت سے سوار ہوتے ہیں اور چند قدم آگے بڑھ کر لوٹ آتے ہیں۔ اور صرف اسی پر اکتفا نہ کرتے ہوئے خداوند ولی نعمت کو بعض امراء اور مٹھی بھر خاص آدمیوں و چند خواجہ سراؤں کے ساتھ بے سرو پا وتنہا چھوڑ کر آگے جا کر خیمہ لگا لیا۔ امراء میں سے ایک جو میر آتش کے نام سے جانا جاتا ہے کیونکہ اس کو توپخانے کے انتظام کی وجہ سے لازم ہے کہ دن رات گلالبار میں رہے، ہمایوں (325) کا ہم رکاب ہو گیا ہے۔ ان حالات میں کہ جب مراتب احتیاط بھلا دیئے گئے ہیں ایک عجیب

قیامت ہے۔ اگر کوئی غریب بندہ تدبیر میں ذرا بھی غلطی کرے تو اس کا نقصان خود اس کو ہی ہوگا۔ اور بدقسمتی سے اراکین سلطنت کے مزاج میں زمانہ سرایت کر گیا تھا(326) اور روزگار کے فساد مادہ کا محرک اور دن رات طبیعت کے بوجھل پن کا سبب بن گیا۔ (327) غرض کہ ان کی حرکت کے بارے میں یہ کہنا غلط نہ ہوگا۔ یاالٰہی!

اقبال حسن کار تو از پیش برد

ورنہ صلاح کار ندانستہ کہ چیست (328)

اٹھائیس تاریخ۔ (329) اراکین (دولت) کہ جو مورچوں میں تھے سوار نہ ہوئے۔ راقم حروف جو لشکر معلیٰ میں موجود تھا مورچوں کی سیر کرنے کی غرض سے کہ اس ضمن میں نواب صاحب وزیر الممالک بہادر کے حضور مجرا بجالانے کی سعادت حاصل کرنا بھی مقصود تھی، صبح کے وقت سوار ہو گیا اور سیدھا دیوان خانہ عالی پر آ گیا۔ نواب صاحب حمام میں تھے۔ کچھ دیر انتظار کیا۔ اس وقت ہوا بہت تیز چل رہی تھی۔ دھول ومٹی اس حد تک اڑ رہی تھی کہ ہر شخص جو دیوان خانے کے دروازے سے باہر آتا وہ سنیاسیوں اور جوگیوں کی مانند ہو جاتا اس کے سر اور چہرے پر مٹی لپ جاتی تھی، سر سے لیکر ناخن تک گرد آلود ہی نظر آتا تھا۔ گویا کہ یہ لشکر نہ تھا بلکہ سنیاسیوں کا اکھاڑہ تھا۔ اسی دوران قائم جنگ کا وکیل کشن چند اور رام نارائن کن کٹا(330) جو کہ حالات زمانہ سے دوسرے کان سے بھی محتاج ہے، وارد ہوئے اور ملاقات کرنے کی خواہش کرنے لگے۔ چونکہ فیصلہ ہونے میں طوالت ہو رہی تھی اور دھول مٹی کی وجہ سے بھی طبیعت میں ناراضی تھی، میں اس وقت آسمان وزمین سے خفا اور بہت حد تک دل تنگ بیٹھا ہوا تھا۔ (ان کی جانب سے) جو کچھ بھی مجھ پر آشکار ہوا اس پر میں نے خوب عتاب ظاہر کیا اور لعن طعن کرنے کے بعد میں نے کہا کہ: ''اے خانہ خرابوں! (تمہاری) یہ اوقات کہ تم جیسے احمق سوال و جواب کر رہے ہیں۔ کیا سلطنت کی نوبت اس حد تک نہیں پہنچ سکتی ہے کہ فرمانروائی ہندوستان تعلقہ داروں میں سے ایک لاکھ سواروں کے ساتھ (مخالفین پر) تباہی لے آئے۔''

الٰہی! جس وقت نواب صاحب باہر آئے تو (میں نے) مجرا پیش کیا۔ خدا جانتا ہے کہ مجرا ہوا یا نہیں ہوا۔ بہرحال اس کے بعد مورچوں کی سیر کی۔ میں نے دیکھا کہ توپ خانہ ایسا ہے کہ اگر اس سے کام لیا جائے تو (توپوں) کے یکدم سر کرنے سے سینکڑوں مخالف اڑائے جا سکتے ہیں۔

پھر میں دو پہر کے وقت گھر آ گیا۔

انتیس تاریخ۔(331) جب نواب صاحب وزیر الممالک بہادر کا اپنا خیمہ اور محکمہ میں موجود کارخانہ جات اٹھا کر دولت خانہ بادشاہی میں لے آئے گئے تو فقیر نے اپنی جگہ سے اٹھ کر لشکر معلیٰ میں نواب صاحب کے گروہ میں دریائے ثوت کے کنارے خیمہ کرلیا۔ اس وجہ سے مورچوں میں جانے کا اتفاق نہ ہوا۔ نواب صاحب جمدۃ الملک (332) اور دیگر امرائے خلافت نے مورچوں کے خیمے سے سوار ہو کر توپخانے سے یکبارگی (گولے) داغنے پر جنگ کا انحصار کر دیا اور مورچوں کو تقریباً ایک کروہ لے جا کر قائم کر دیا اور بن گڑھ کے چاروں جانب چار (چھوٹے) قلعوں میں سے دو قلعوں کو کہ جو مورچوں کے سامنے تھے۔ توپ اور رہکلوں کے گولوں سے نشانہ بنایا۔ مخالف کی جانب سے بھی توپ ورہکلہ اور بان (راکٹ) برابر داغے جانے لگے۔ توپ کا ایک گولہ جو نواب صاحب وزیر الممالک کے ہاتھی کی سواری کے آگے گرا اس کو خود انہوں نے ایک رقعہ تحریر کر کے راجہ خوشحال چند (333) جو دیوان خاص کی داروغگی کے پیش کار ہیں کے ہمراہ بادشاہ کے حضور روانہ کر دیا۔ جب اس کا معائنہ کیا گیا تو پانچ سیر وزن (334) نکلا۔ اس سے قبل اسی جگہ نواب صاحب جمدۃ الملک بہادر کا مورچہ تھا۔ اس روز اعز الدولہ کی فوج میں بہت بے چینی نظر آتی رہی۔ مورچوں کے نقشے جو بادشاہ کے حکم کے بعد میر کلاں مصور نے اس جگہ تیار کئے تھے، گوردھن مصور کے نازک پرداز قلم سے نقش کر کے یہاں نقل کئے جاتے ہیں۔

(یہاں پر تصویر تھی)۔(335)

الٰہی! شام کے قریب اراکین دولت اپنے خیموں میں جو مورچوں کے پیچھے قائم کئے گئے تھے داخل ہوئے اور سپاہی کھانے پینے اور (گھوڑوں کے لئے) خشک گھاس کی فکر میں لگ گئے۔ اسی روز رات دو پہر کے وقت مخالف فوج شب خون مارنے کے ارادے سے مورچوں کے نزدیک پہنچ گئی۔ اس جانب سے چونکہ توپخانے سے یکبارگی (گولے) سر ہونے لگے لہٰذا ان کا کام پورا نہ ہو پایا۔ اگرچہ بادشاہی لشکر مورچوں سے ڈھائی کروہ کے فاصلے پر تھا لیکن توپخانے اور بان (راکٹوں) کے شور سے کوئی شخص بھی سو نہ سکا۔

سن اٹھائیس جمادی الاول کے حالات (336)

یکم جمادی الاول۔(337) اراکین دولت سوار نہ ہوئے۔ چونکہ علی محمد نے عجز وانکساری سے اپنے جرائم کی معافی کے بارے میں قائم جنگ کے ذریعے پیغام ارسال کیا تھا۔(338) لہٰذا نواب صاحب وزیر الممالک بہادر نے دیگر دو امراء سے مشورہ کر کے (339) ان (علی محمد) کی غلطیوں کی معافی کے بارے میں درخواست جناب عالمیان مآب کو ارسال کر دی۔ وہ (نواب صاحب) یہ عرض پرداز تھے کہ چونکہ بادشاہان، درگاہ خداوندی کی مثال ہوتے ہیں اور درگاہ الٰہی میں توبہ کی ہمیشہ اجازت ہے اور اس کے ساتھ ہی اگر اس کا کوئی حصہ قبول نہ کیا گیا تو بھی اس (عرضی) کے اکثر حصے پر راضی ہیں اور اس ضمن میں رقم بھی پیش کرتے ہیں اور جرائم کی معافی کے امیدوار ہیں۔" اس (عرض داشت) کو قبولیت کا درجہ حاصل ہو گیا اور ارشاد قدسی ہوا کہ وہ (نواب صاحب) فدوی خاص اس بات پر اختیار رکھتے ہیں کہ جو کچھ (اراکین) حکومت میں باہمی صلاح ٹھہرے اس پر عمل کیا جائے۔

دو تاریخ۔(340) اسی سوال وجواب میں دن گزر گیا اور مصالحت طے پائی۔ دونوں جانب سے توپ ودہکلہ داغنا بند ہو گیا۔

طلوع صبح وخوش قسمتی، علی محمد کا عظمت واجلال عالم پناہ کی خدمت میں آنا اور بادشاہانہ فضیلت کے ارادے سے اس شرمندہ شخص کے افعال کے جرائم کا معاف کیا جانا۔

تیسری تاریخ۔(341) جمعہ کے دن علی محمد نے نواب صاحب عمدۃ الملک مدار المہام کو پیغام ارسال کیا کہ خدشہ یہ ہے کہ جب یہ گنہگار بندہ آستان بوسی کے لئے بندھا ہوا آئے گا تو لشکر کے لوگ قلعہ میں داخل ہو کر غارت گری شروع کر دیں گے اور جو کچھ بھی پائیں گے اسے اٹھا کر لے جائیں گے لہٰذا کچھ لوگوں کو محافظت پر مامور کیا جائے تا کہ بادشاہ کے مال کو نقصان نہ پہنچے۔ نواب صاحب نے جانثار خان بہادر (342) کو اس کام پر متعین کر دیا۔ خان مذکورہ نے بھاگ کر قلعے پر قبضہ کر لیا۔ اور شاہی جھنڈے کو قلعے کے برجوں اور دیوار پر بلند کر دیا۔ فتح کے نقارہ کے شور وغل

سے شہرستان میں شوروغوغا سنا جانے لگا۔

علی محمد، تین چار ہزار سواروں اور اسی قدر پیادوں اور اپنے دولڑکوں کہ جن کے پشت لب تا حال سبز نہ ہوئے ہیں (343) اور ایک متبنّٰی جو راجہ کمایوں کے قبیلے سے ہے (344) اور پائندہ خان ودوندے خان وفتح خان سرداروں کے ساتھ خود ہاتھی پر سوار کہ جس کا حوضۂ چاندی کا بنا ہوا تھا، نے احرام حضور باندھے جو کہ نزدیک ودور سب کی ضروریات کا قبیلہ ہے۔ اسی اثناء میں گرد وخاک بلند ہوئی اور اس کے بعد بے پناہ بارش برسی۔ اس نے بہت آہستگی اور آرام سے راستہ طے کیا۔ قائم جنگ کے خیمے کے نزدیک پہنچا اور کچھ دیر وہاں رکا پھر لباس تبدیل کیا جو کہ سارا گیلا اور گردآلود ہو گیا تھا۔ پھر اپنی فوج کو اس جگہ چھوڑ کر (345) دو سو تین سو سواروں کے ساتھ نواب صاحب وزیر الممالک بہادر کی خیمہ گاہ کا ارادہ کیا۔ کہتے ہیں کہ اس وقت کہ جب اپنے اقامت کدہ سے حضور کی جانب آنے کا ارادہ کر کے سوار ہوا تھا تو اس نے ایک دیہات کے بارے میں جو کہ قلعے کے نزدیک آباد تھا کہا تھا کہ اسے جلا ڈالیں۔ اس کے بعد اپنے کارخانہ جات کی اس عمارت کی جانب حسرت بھری نگاہ ڈالی اور ایک آہ بھری۔ یعنی

عبارت ہندی

راجا چھوڑے نگری، جو چاہے سو لے

شہر و صحرا را نظیری سوخت از آہ وداع

میرود نوعی کہ پنداری ز دنیا می رود (346)

قصہ مختصر یہ کہ احمد زمان خان بہادر طالب جنگ (347) محمد عطا خان بہادر آگے بڑھ کر علی محمد کو پہلے تو انتظام الدولہ بہادر کے پاس لائے کیونکہ نواب صاحب کے آگے ان کا خیمہ مورچوں کے قریب تھا۔ اکیس اشرفیاں نذر کر کے ملاقات کی۔ اس کے بعد نواب صاحب وزیر الممالک بہادر کی خدمت سے بہرہ اندوز ہوئے۔ ایک سو ایک اشرفیاں نذر کر کے قدمبوسی پیش کی۔ بیٹھنے کی اجازت ملی۔ اور شفقت وعنایت کے تقاضے کے مطابق جو کہ اس برگزیدۂ دولت (وزیر الممالک)

کی طبیعت (میں شامل) ہے، اس (علی محمد) کے بیٹوں کو میوہ عطا کیا۔

علی محمد چالیس سالہ ایک جوان ہے۔ کسی قدر بھاری بھرکم ہے۔ درمیانہ قد ہے۔ سفید کھال ہے۔ چھوٹی پگڑی کہ جس کے باندھنے کا طریقہ روہیلوں کے (پگڑی باندھنے کے) مشابہ نہیں ہے، باندھی ہوئی ہے، کھلا ہوا چہرہ، کشادہ پیشانی اور صاحب دل وجگر (یعنی بہادر) ہے۔ اس بات کا قوی امکان ہے کہ اس کے جوہر بہت اچھے نکلیں گے۔ (348)

اس کی فوج میں عجیب طریقہ ہے۔ خواہ پیادہ ہو یا سوار ہو کوئی بھی بغیر بندوق کے نہیں اور جو کوئی دس پیادوں کا سردار ہو اور سو پیادوں کا سردار ہو ان میں سے ہر ایک نے ایک چھوٹا سا نشان جدا جدا رنگ کا لگایا ہوتا ہے۔ اور یہ سب سواری کے آگے و پہلو میں ہوتے ہیں گویا کہ ایک باغ ہے جو ساتھ جا رہا ہے۔ (349)

الٰہی! عمدۃ الملک بہادر اور ابوالمنصور خان بہادر اور قائم خان بہادر مورچوں سے سوار ہو کر دربار معلّٰی میں حاضر ہو گئے اور نواب صاحب وزیر الممالک نے تیسرے پہر علی محمد کو ساتھ لے کر مورچے سے سوار ہو کر بادشاہ (کے حضور) مجرا بجالانے کی سعادت حاصل کی۔ اس روز چونکہ گلالبار کے ہر ستون کے اوپر ایک سرخ ابریشمی جھنڈا لگا ہوا تھا اور گلالبار کے دروازے سے دیوان خاص کے پردے تک باڑ کے راستے کے دونوں جانب توپخانے کے منکباشی تھے کہ جن میں سے ہر ایک کی بڑی بندوق کے سرے پر سرخ رنگ کے جھنڈے تھے اور دیگر بھی بہت سا انتظام تھا، اس وجہ سے بادشاہ کے دولت خانہ میں ایک عجیب دبدبہ قائم تھا۔ نواب صاحب گلالبار کے دروازے کے پاس ہاتھی کی سواری سے اتر کر پالکی میں سوار ہو گئے اور جالی کے دروازے کے پاس پہنچ گئے اور پالکی سے نیچے آ گئے۔ چونکہ حضرت گیہان خدیو تا حال محل کے اندر موجود تھے اس لئے دیوان خاص کی رانوٹی (350) میں کچھ دیر کے رہے۔

اسی اثناء میں حضرت بدولت دیوان خاص میں تشریف لا کر مسند پر جو زمین پر بچھایا ہوا تھا بیٹھ گئے اور کامیابی کا نقارہ اونچی آواز سے بجنے لگا۔ پہلے نواب صاحب جمدۃ الملک مدار المہام نے اور اس کے بعد دیگر اراکین (دولت) نے حاضر ہو کر مجرا بجالانے کی سعادت حاصل کی۔ اور ہر ایک نے اپنے رتبے کے مطابق نذر پیش کر کے فتح پر مبارک باد کا سلام پیش کیا۔ اس کے بعد انتظام الدولہ بہادر کے حکم کے مطابق علی محمد کے دونوں ہاتھ رومال سے باندھ کر مجلس میں حاضر کیا

گیا۔ بادشاہ کی زبان پر (یہ الفاظ) جاری ہوئے کہ ''ہم اس کو آزاد اور اس کی غلطیوں کو معاف کرتے ہیں۔ اس کے ہاتھ کھول دیئے جائیں۔'' علی محمد نے آداب پیش کیا اور اس کے بعد ایک ہزار اشرفیاں نذر گزاریں جو کہ منظور کرلی گئیں۔ چونکہ دکھائی نہیں دیتا تھا کہ غلطی معاف ہوگئی ہے اور نہ ہی اشرفیاں نذر (کی قبول ہوئی ہیں) اس لئے مصرع:

از بدقمار ہرچہ ستانی شغل بود (351)

علی محمد کو جانے کی اجازت مل گئی اور شام کے قریب بندگان حضرت قدر قدرت دیوان خاص کے خیمے سے اٹھ کر اپنے شاندار محل میں تشریف لے گئے۔ اور امراء اپنے گھروں کو آگئے اور طے پایا کہ علی محمد قائم جنگ کے سپرد رہے گا۔

اور چونکہ دریائے گنگا عبور کرنے کے بعد ایک منزل طے کر کے یا (یوں کہئے کہ) بن گڑھ سے پانچ کروہ اس جانب ہر منزل پر جاہ وجلال کے خیمے آب ثوت کے کنارے ہی لگے تھے لہٰذا اس دریا کو دربار خلافت سے ''یار وفادار وہم دل تہمتن'' (352) کا خطاب ملا۔

اعلام جہان کشائی گیتی منقاد کی دارالخلافہ کی جانب واپسی، اللہ تعالیٰ اس کو تمام آفات ومصائب سے اپنی حفاظت میں رکھے۔

چار تاریخ۔(353) خلافت کے بڑے اراکین صبح کے وقت دربار معلیٰ میں حاضر ہوئے۔ نواب صاحب وزیر الممالک بہادر نے عرض کیا کہ روشن ضمیر جو کہ لوح تقدیر کا نسخہ ہے پر بالکل صاف اور واضح ہے کہ برسات کے دن قریب آگئے ہیں کیونکہ اہل ہند کے حساب سے جیٹھ کے مہینے کا تقاضا بھی یہی ہے اور شاہی کارخانہ جات کی حالت بھی خراب ہے اور دو دریاؤں کہ جن کے نام گنگا اور جمنا ہیں سے لشکر معلیٰ کو گزرنا ہے اور پھر جو کام پیش نظر تھا وہ بھی انجام کو پہنچ گیا ہے لہٰذا دولت ابدمدت کی صلاح یہ ہے کہ جہانکشا جھنڈے کو دارالخلافہ شاہجہان آباد کی جانب واپس لے جائے جانا ہے۔

نجومیوں اور اہل تقویم کو بادشاہ کے حضور بلا کر حکم ہوا کہ نیک گھڑی کا انتخاب کریں۔ انہوں نے اس فن کی دیگر مشکلات کو جانچا اور درست حالات اور بہت اچھی خبر پر پہنچ کر یہ عرض کیا کہ پیش خانہ ہمایوں کو آگے بھیجنے کے نیک اوقات میں آج سے بہتر دن کوئی نہیں ہے۔ اور اسی طرح سے کل

کا وقت (بھی نیک) ہے کہ جو پانچ تاریخ اور یکشنبہ کا دن ہے۔ اس جانب کوچ کرنے کو تمام برکت حاصل ہے لہٰذا توجہ مبذول کی گئی۔ سعد الدین خان بہادخان سامان کو حکم ہوا کہ پیش خانہ والا کو شاہ جہان آباد کی جانب روانہ کریں۔

چنانچہ گیتی منقاد (بادشاہ) کے حکم پر انتظام الدولہ بہادر اور نعمت اللہ خان قراول بیگی نے پیش خانہ ہمایوں کو بڑی خوشی و کامیابی و کامرانی کے ساتھ اپنے ہمراہ لے کر دو کروہ جریبی طے کر کے دارالخلافہ کی جانب لگا دیا۔ اس سے اگلے روز پانچ تاریخ یوم یکشنبہ (354) کو چھ گھڑی دن بلند ہوا تھا کہ گیتی خداوند نے اپنی تخت رواں شکاری سواری پر مسافت طے کرنے پر توجہ فرمائی اور طے پایا کہ نواب صاحب جمدۃ الملک بہادر لشکر کے عقب میں بغرض حفاظت ہوں گے اور قائم جنگ ان کے ہمراہ ہوں گے۔

چھٹے تاریخ۔ (355) قیام کیا گیا اور امراء نے بادشاہ کے حضور حاضر ہونے کی سعادت حاصل کی۔ یہ حکم، خیر جاری ہوا کہ ایک ہزار بیلدار اور ایک ہزار تبر دار (356) ہمراہ فرید الدین خان (357) پسر عظمت اللہ خان مراد آبادی (358) جن کو علی محمد کی تبدیلی پر اس کے تعلقہ کے بندوبست پر مامور کیا گیا ہے جا کر قلعہ بن گڑھ کو مسمار کر دیں۔ اور سعد الدین خان کو حکم ہوا کہ اس جگہ پر جو بھی توپ و رہکلہ و گولہ و بارود ہے وہ بحق سرکار ضبط کر لیں۔ اور بازار کے سربراہ (359) کو حکم ہوا کہ قلعہ میں غلہ و روغن وغیرہ کا جو بھی ذخیرہ ہو وہ اس قافلے کے ہمراہ بنجاروں (360) کو قیمتاً فروخت کر کے رقم وصول کر لیں اور وصول شدہ رقم سرکاری خزانے میں داخل کر دیں۔ (361) اور یہ بھی حکم جاری ہوا کہ علی محمد کو ایک سو سواروں اور اسی قدر پیادہ کے ساتھ جمدۃ الملک بہادر (362) کے گروہ میں لے آیا جائے اور قائم خان بہادر قائم جنگ کو قائم الدولہ کے خطاب سے سرفراز کیا گیا۔ (363)

سات تاریخ۔ (364) قیام کیا گیا۔ رات کو راقم حروف اپنے خیمے کے صحن میں کہ جو دریائے ثوت کے کنارے تھا بیٹھا ہوا تھا اور چاند کی سیر کر رہا تھا اور اس کراہت کی وجہ سے، کہ جو اس روز بعض ان دوستوں کی حرکت سے ظاہر ہوئی جو دراصل دشمن تھے، میرے مزاج میں چڑچڑا پن تھا۔ اسی اثناء میں سرخ کاغذ پر چند چراغ سطح آب پر خیمے کے آگے سے گزرے۔ ظاہر ہے کہ کسی شخص نے سرخ رنگ کے کاغذوں پر باقاعدہ طور پر، جیسا کہ ہندوستانی دوستوں میں سے بعض

جوانوں کے نزدیک یہ چیز کھیل ہوتی ہے، چراغ رکھ کر اور اس میں بتی جلا کر یکے بعد دیگرے دریا میں ڈال دیا ہے اور اس کھیل کو درست خیال کرتے ہیں۔ چونکہ یہ بات خالی از بیان نہ تھی لہٰذا اس کی جانب متوجہ ہو گیا۔ ایک بات دل میں گزری۔ اپنا سر جیب کی جانب گھمایا اور یہ رباعی کہی۔ مصنف عرض کرتا ہے کہ:

دور از تو طپشہای دل خانہ خراب
دارد سری غریب، ای گل، بشتاب
لخت جگر سوختہ، در چشم برم
ماند بچراغی کہ گزار ند درآب (365)

سانحہ

اسی دن تیسرے پہر چتر بھوج (366) دیوان راجہ جگل کشور (367) جو ناظم بنگال کے وکیل ہیں درمیانی (طرز) کی سواری پر جو کہ سو جگہ سے ٹوٹی ہوئی تھی اور خاص گھوڑے پر مگر اس کی کمر پر پرانی زین باندھے ہوئے وارد ہوئے۔ "اف! یہ کیا قیامت ہے اور یہ ناگہانی بلا کہاں سے نازل ہوئی گئی ہے۔ میرے پاس کوئی فوج نہیں ہے کہ بھیہ جیو کی خاطر شاہی منصب داروں کے ساتھ، کہ جو اس کی جاگیر پر قابض ہیں اور ایک پیسہ بھی (بطور قیمت) ادا نہیں کرتے، جنگ کر سکوں۔ میرے پاس کوئی پیسہ بھی نہیں ہے کہ دیوان جیو حیلے بازی سے سب کچھ لے گئے ہیں۔" الٰہی! میں نے اس کو طلب کیا اور اس سے آنے کا سبب پوچھا۔ اس نے کہا کہ: "راجہ جیو جاگیرداروں کے ہنگامے کی وجہ سے لشکر سے نکل کر قصبہ سنبھل چلے گئے ہیں اور مجھے ضمانت کے طور پر جاگیرداروں کی دلجمعی کے لئے لشکر میں چھوڑ گئے ہیں۔ مجھے فکر لگ رہی ہے۔ مجھے اس جگہ رات گزارنے دیجئے اور صبح کے وقت میں خود یہاں سے چلا جاؤں گا۔" میں نے کہا کہ "خوش آمدید وخلوص کے ساتھ تشریف لائیے۔ اس فقیر کا گھر کچھ خاص مہمان خانہ نہیں ہے۔ جس قدر دن چاہے حسب منشاء رہئے۔"

میں نے اس کے لئے الگ خیمہ کھڑا کر دیا اور مراتب مہمانداری سرانجام دینے لگا اور بعض حالات پوچھے کہ "تمہارے ذمے کتنے آدمیوں کا کتنا خرچہ ہے؟" کہنے لگا "بارہ ہزار روپیہ جس

میں سے سات ہزار روپیہ خدمت گاروں کا ہے اور پانچ ہزار روپیہ گھروں وغیرہ کے لئے ہے۔"
میں نے کہا "یا الٰہی! اتنا خرچہ۔ یہ بتایئے کہ آمدنی خرچے کے برابر ہے یا کم وبیش ہے؟ اس نے کہا "اس سے قبل دو چند (آمدنی) تھی اور اب ان چیزوں کی نسبت ذرا کم ہے۔" بہر حال، اس عزیز نے رات گزاری اور روانہ ہو گیا۔

آٹھ تاریخ۔ (368) قیام کیا گیا۔ اراکین سلطنت دربار میں حاضر ہوئے۔ نواب صاحب جمدۃ الملک بہادر کو شاہی حکم ہوا "(ہماری) خدمت میں عرض کیا گیا ہے کہ انوپ شہر (369) بہترین راستہ ہے۔ کیونکہ ایک تو خشک گھاس کی قلت نہیں ہے اور دوسرے یہ کہ معلوم شدہ راستے کی نسبت زیادہ قریب ہے۔ پہریداروں کو روانہ کیجئے کہ راہ مذکور کے حالات معلوم کر کے (ہمارے سامنے) پیش کریں۔" جب چوکیداروں نے شاہی حکم کے مطابق تحقیق کی تو عرض کیا کہ یہ راستہ لشکر معلّٰی کے عبور کرنے کے قابل نہیں ہے اس لئے کہ ناہموار ہے اور پانی کی قلت بھی ہے۔ لہٰذا وہی گڑھ مکتیشر کا راستہ طے پا گیا۔ سارا لشکر راستے سے ہٹ گیا تھا۔ اللہ تعالیٰ پہریداروں کو جزائے خیر دے کہ انہوں نے "مصلحت آمیز جھوٹ، فتنہ انگیز سچ کی نسبت بہتر ہے۔" کے مطابق ایسی تدبیر نکالی کہ راہ سے بھٹک نہ سکے۔

بے پناہ بارش و ہوا کی وجہ سے راقم سطور کا خیمہ اکھڑ اجانا اور ہر جانب سے بے گنتی وشمار سانپوں کا باہر نکل آنا۔

نو تاریخ یوم پنجشنبہ۔ (370) ایک پہر دن باقی رہ گیا تھا کہ ہوا بہت تیز ہو گئی اور سرِ شام سے بارش کے آثار وعلامات ظاہر ہو گئے کیونکہ گہرے گھنے سیاہ بادل ہیں اور آسمان کے ہر جانب بجلی چمک رہی ہے۔ اور پھر بوندیں پڑنا شروع ہو گئیں۔ رات کو دو پہر گزرنے کے بعد اس قدر تیز بارش ہوئی کہ اس کے ظالم ہاتھوں سے خیمے جڑوں سے اکھڑ گئے اور پھٹ گئے اور پھر خیمے والوں نے یہ کہنے کو زبان کھولی کہ "اے بادل! (ہم) پہاڑوں وصحرا میں پھرنے والے آوارہ گردوں کے حال پر رحم کر۔" بارش کا پانی زانو تک آ گیا اور گھٹنے کی چپنی اہل خیمہ کی آنکھوں کے پانی سے تال کٹورہ (371) ہو گئی۔

چونکہ اس روز حیات اللہ خان بہادر کے کچھ سونے کے ورق اس فقیر کے گودام میں تھے لہٰذا

اس کی احتیاط برتنا لازم ہوگئی کہ کہیں اس کو نقصان پہنچے تو عظیم نقصان بھی ہو جائے اور پڑوسیوں کو طعنہ دینے کا موقع بھی مل جائے۔ اس راستے پر چند بکسریئے اپنی چوکی، کہ جن میں چند پرانے خدمت گزار ومحمد اعظم وکچھ ڈھال بردار بھی تھے، کے ساتھ ساری رات کمر بستہ عین بارش میں گودام اور اصطبل کے قریب کھڑے رہے اور آنکھوں میں نیند بالکل نہیں آنے دی۔ چھ گھڑی رات باقی تھی کہ بارش کی کثرت اور ہوا کے زور سے چوکی داروں کی آواز نہیں پہنچتی تھی۔ اس خیال سے کہیں وہ لوگ سو گئے ہوں گے یہ ضروری ہوگیا کہ خود ہی احتیاط رکھوں۔ میں نیند سے اٹھا اور پلنگ پر کہ جو لکڑی کے دونوں خیموں کے درمیان پڑا تھا بیٹھ گیا اور ارادہ کرنے لگا کہ حقے منگواؤں۔

اسی اثناء میں اسی رانوٹی (372) وقلندری (373) خیمے کی رسیاں اچانک کھل گئیں اور خیمہ سرکشوں کی طرح سے نیچے آن گرا، اگر فقیر نیند سے اٹھ کر پلنگ پر نہیں بیٹھا ہوتا تو پورا خطرہ تھا کہ خیمے کی لکڑی سے چوٹ لگ جاتی۔ بہر تقدیر عبداللہ خدمتگار اور رامداس جو وہاں موجود تھے نے کمبل پکڑ کر سایہ کردیا۔ ہونہار (373-A) کہ جو اسی جگہ سو رہا تھا، بچہ تھا اس لئے رونے لگا اور اس فقیر کا حال پوچھا۔ میں نے کہا کہ ''بیٹا خیریت ہے۔ بددل نہ ہو لیکن میری کتب وتحریروں کو، نہ کہ میری جان کو، بغل میں پکڑ کر خیمے کے پردے کے نیچے بیٹھ جا اور احتیاط رکھ کہ پانی سے گیلی نہ ہوں۔'' اور یہ جو دو خدمتگار حاضر تھے انہوں نے لوگوں کو بلایا اور کونوں کو درمیان سے اٹھا کر خیمہ لگانے لگے۔ اس کام میں بہت زور لگا مگر وہ کوششوں میں مصروف رہے یہاں تک کہ اس کالی رات میں اور بارش کے اوقات میں گرا ہوا خیمہ کھڑا کر ہی دیا۔ پانی کو خیمے کے اندر سے دور کر کے تخت پوشوں کو بچھایا اور بیٹھنے کے قابل جگہ بنائی۔ اسی اثناء میں صبح کی سفیدی دکھائی دی اور پریشان لوگ جمع ہوگئے۔ لوگ پردے لگانے اور خیمے کھڑے کرنے کی فکر میں لگ گئے۔ اب ہر خیمے میں ہزاروں سانپ جو شاید دریائے ثوت کی طغیانی کی وجہ سے اپنی جگہوں سے آوارہ نکل پڑے تھے پھن پھیلائے دیکھنے والوں کی حیرت میں اضافہ کر رہے تھے اور ان کی تعداد اتنی زیادہ تھی کہ تقریباً بیس تیس آدمی ہاتھ میں لاٹھی لئے ہوئے تھے اور ان کے سر کچل رہے تھے۔ اور دریائے ثوت کا پانی بھی جو بارش کی کثرت کی وجہ سے طغیانی پر آگیا تھا، خیمے کے نزدیک پہنچ گیا تھا اور لوگوں کے دل اس وجہ سے کہ زمینی وآسمانی آفات دونوں ہی اس جگہ موجود تھیں، موج کی طرح سے تھرتھرا رہے تھے۔

خدائے عزوجل کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ اس سارے طوفان کے باوجود کسی شخص کو نقصان نہیں پہنچا۔
الٰہی! جب ایک پہر دن چڑھا تو بارش کم ہوگئی اور دوپہر کے قریب سورج نکل آیا۔ بادشاہ کا پیش خانہ روانہ ہوگیا۔ نواب صاحب وزیر الممالک نے اس وجہ سے کہ خیمہ گاہ کی زمین پر زانو تک پانی کھڑا ہوا تھا۔ پیش خانہ کے ساتھ کوچ کیا۔ مسودا وراق نے بھی شام کے قریب کوچ کیا اور چاند کی روشنی میں کہ جو بادلوں کی وجہ سے بالکل نہ ہونے کے برابر تھی، ایک پہر و چار گھڑی رات گزرتے منزل پر پہنچ گیا۔ اور توپخانہ جنسی کے قریب خیمہ لگایا۔
بارہ تاریخ۔(374) بادشاہ تشریف لائے اور حکم ہوا کہ پیش خانہ کو آگے روانہ کیا جائے۔
تیرہ تاریخ۔(375) اسی جگہ پر قیام کیا گیا کیونکہ اکثر کارخانے پہنچ نہیں پائے تھے۔

فقیر مخلص یک رنگ کا دریائے گنگا کے پل پر سے گزرنے کے ارادے سے کوچ کرنا

اس فقیر نے تاریخ صدر یعنی جسے تیرہ کہیں گے کو اس بات کے پیش نظر کہ دریائے گنگا کے پل پر سے لشکر معلیٰ سے قبل گزر جانا آسان رہے گا کوچ کیا اور بائیس کروہ راستہ طے کر کے چار گھڑی دن باقی تھا کہ قصبہ سنبھل پہنچ گیا اور مضافات شہر میں اتر آیا۔ چونکہ پہاڑ و جنگل چاندی جیسے سبزے سے (چمک رہے) تھے اور ہر طرف پانی بہہ رہا تھا اور ہر جانب کوئلیں اور پپیہے گا رہے تھے اور مور و فاختہ اڑ رہے تھے لہٰذا بادلوں کے نیچے راستہ طے کرنے میں بہت مزہ اور آرام میسر آیا۔

لطیفہ

مضافات سنبھل کے قریب لشکر کے آدمیوں میں سے ایک نے بینگن توڑنے کے لئے ہاتھ بڑھایا۔ مالک بیچارہ دور کھڑا فریاد کر رہا تھا۔ اس فقیر کی سواری دیکھ کر اپنے ظالم ہاتھ آستین میں کر لئے اور توڑے ہوئے بینگن اپنے دامن میں سمیٹ لئے۔ بکسریوں میں سے ایک سوار نے اس کے پاس پہنچ کر چاہا کہ کچھ بینگن لے لے۔ اس نے اس بارے میں اعتراض کیا۔ جب بکسریئے نے اصرار کیا تو اس کو گالی دی۔ جھگڑا طول پکڑ گیا اور دونوں جانب سے ہاتھوں اور لاتوں کا استعمال

ہونے لگا۔ برادر عزیز میر نجم الدین علی کہ جو اس راستے سے گزر رہا تھا نے جب یہ معاملہ دیکھا تو اس پیارے بینگن توڑنے والے کو کوڑہ مارا۔ آخر کار انہوں نے صلح کر لی اور آپس میں آدھے آدھے بینگن تقسیم کرنے پر راضی ہو گئے۔ رات کو ایک دوست نے فقیر کے سامنے یہ قصہ بیان کیا۔ میں نے کہا کہ ''وہ ایک طرح کا 'مارو' (376) بینگن تھا۔''

اب میں مطلب پر آتا ہوں۔ تیرہ تاریخ کو سنبھل میں قیام کیا اور راہ کی کوفت کی وجہ سے غسل کیا۔ شیخ احسان اللہ ساکن سنبھل نے کہ جو وہاں کے روساء میں سے ہیں اور منصب دار ہیں برادر عزیز لالہ لجیا رام سے متعارف ہونے کی بناء پر اس فقیر کے لئے ایک دسترخوان آم کا اور تھوڑا سا تمباکو روانہ کیا۔ چونکہ آم میٹھا اور بے ریشہ تھا لہٰذا بہت لذیذ تھا۔ زیادہ سامان اور چھکڑے کو بھی کہ جس کی ایک گائے ناکارہ ہو گئی تھی شیخ امان اللہ مذکور کے گھر میں چھوڑ دیا اور سونا بھی اس کے حوالے کر دیا اور اس سے کہا کہ فرصت ملتے ہی دوسری گائے خرید کر سامان اور چھکڑے کو منگوا لوں گا۔

چودہ تاریخ۔ (377) کوچ کیا اور موضع نگلی (378) جو سنبھل سے آٹھ کروہ کے فاصلے پر ہے تک بالکل نہیں رکا اور اس جگہ سامان اٹھانے والے اونٹوں کے انتظار میں کچھ دیر رک کر آگے روانہ ہو گیا اور دو دن میں قصبہ حسن پور پہنچ کر شاہی آموں کے درمیان غریبوں کے انداز میں کہ اس پر ہزار امرائی شوکتیں قربان جائیں تمباکو کی زمین پر خیمہ لگا لیا۔ اس روز اکثر لوگ گرم ہوا کی وجہ سے بے ہوش ہو گئے۔ چوبدار محمد اعظم بھی ان لوگوں میں تھا کہ اس کا معاملہ تو اس کے حلق میں پانی ڈالنے تک جا پہنچا۔ میں نے سنا تھا کہ بادشاہی گروہ میں سے دو تین لوگ تو فوت ہو گئے۔ کتنی عجیب بات ہے کہ یہاں پر یہ بھی ہونا تھا کیونکہ اس منزل پر سورج کی گرمی اور پانی کی قلت دونوں ہی تھیں۔ اس فقیر کو بھی ایک طرح کا بخار ہو گیا۔ چنانچہ جب قیلولے سے اٹھا تو طبیعت بوجھل محسوس کی۔ طبیعت بے اختیار تربوز کھانے کی جانب مائل ہو گئی۔ اسی دوران ایک شخص ہاتھ میں تربوز لئے خیمے کے آگے سے گزرا۔ اس نے اس کی جو بھی قیمت مانگی وہ ایسے دے کر (تربوز) خرید لیا اور میں نے نور چشم رائے فتح سنگھ سے کہا کہ اس کا شیرہ نکال کر گلاب، بید مشک اور تھوڑی سی مصری اس میں ڈال کر لے آؤ۔ جیسے ہی اس کے چند چمچے کھائے تو طبیعت میں تازگی آ گئی۔ جناب حکیم صاحب نے درست کہا ہے۔

پندرہ تاریخ۔ (379) قیام کیا گیا۔ اس روز رائے صاحب مجلس رائے(380) پیشکار خالصۂ شریفہ اور نور چشم لالہ نین سکھ رائے نے بادشاہی لشکر سے حسن پور پہنچ کر تھوڑے فاصلے پر خیمہ لگایا۔ بہت سے آم درختوں سے توڑ کر پال ترتیب دیئے اور یہ پال حویلی میں داخل ہونے کے بعد بھی کام آئے۔

چونکہ اس روز طے تھا کہ جیسے ہی چاند طلوع ہوگا تو کوچ کر دیں گے لہٰذا شام شروع ہوتے ہی راقم سطور اور اس کے مشہور مخلص دوست خیمہ کے صحن میں چبوترے پر بیٹھ گئے ہم چاند کے طلوع ہونے کا انتظار کرنے لگے اور ان متمنی آنکھوں پر شوق کی دوربین، نرگس کی طرح سے لگا کر آسمان کی جانب دیکھنے لگے۔ بغیر سوچے سمجھے یہ مصرع فقیر کی زبان پر آ گیا ع

ای ماہ، برآ، در انتظاریم (381)

تھوڑی سی دیر کے بعد دوستوں کے آگے غزل کہنا مناسب ہو گیا، چنانچہ وہ (غزل) تحریر کی جاتی ہے۔

مصنف عرض کرتا ہے کہ:

ای سرو، بیا، در انتظاریم
استادہ بیا، در انتظاریم
امشب سربام جلوۂ کن
ای ماہ برآ در انتظاریم
ای گل، بخواب نامہ بنواز
دیر است کہ ما، در انتظاریم
بی ابر، قدح نمی توان زد
یافیض ہوا! در انتظاریم
بی روی تو، سیر باغ کفر است
زود آ، بخدا، در انتظاریم
ابر و شب و بیم موج، یا رب!
فضلی بنما، در انتظاریم

مخلص، سخت پر است از ذوق

دیوان یکشا، در انتظاریم (382)

مختصر بات یہ کہ جب چھ گھڑی رات گزر گئی تو چاند نے چہرے سے نقاب اٹھایا، سامان باندھنے کا کہا گیا۔ چار گھڑی رات باقی تھی کہ اونٹوں پر بوجھ لاد دیا گیا۔ کوچ کا ارادہ کیا۔ ایک اونٹ کہ جس پر خدمتگار کے سامان کا شلیطہ لادا ہوا تھا، ہر طرح سے کوشش کی کہ اپنی جگہ سے اٹھ جائے لیکن وہ اپنی جگہ سے نہ اٹھا اور چیخنے لگا۔ اور اس کی یہ حرکت کسی اور وجہ سے نہ تھی بلکہ شیطانی وشرارت سے تھی۔ مجبور ہو کر اس کا بوجھ کھولا اور اس میں کمی کی مگر اپنی جگہ سے نہ اٹھا اور پہلے سے زیادہ شور وغوغا کرنے لگا۔ اور عجیب بات تو یہ ہے کہ جب اس کا سارا بوجھ زمین پر اتار دیا تو وہ جلدی سے اپنی جگہ سے اٹھا اور بہت خوش خرامی دکھانے لگا۔ اور نا مناسب حرکات کرنے لگا۔ میں نے کہا کہ اس کا علاج یہ ہے کہ ہاتھی کی طرح سے اس بہانے باز کو اٹھا کر کے اس پر بوجھ لادا جائے جب ایسا کیا تو پھر وہ اونٹوں کی قطار کے ساتھ روانہ ہو گیا۔ اس (سامان کے) باندھنے اور کھولنے میں چار گھڑی کی دیر ہو گئی۔

بہر تقدیر صبح کے قریب کوچ کیا اور دو گھڑی دن بلند ہوا تھا کہ موضع شہباز پور پہنچ گیا کہ جس کے حالات گزشتہ اوراق میں تحریر کیئے گئے ہیں۔ اور جس وقت شاہی آموں میں اس درخت جس کے سائے میں جاتے وقت خیمہ لگایا تھا کے پاس پہنچا تو خیمے لگانے کی تمام علامات یعنی چبوترہ وغیرہ کو کچھ دیر دیکھ کر اللہ کا شکر ادا کیا۔ اس (جاتے) وقت مذکورہ درخت میں چنے کے دانے کے برابر پھل لگے ہوئے تھے۔ اگر چہ پہلے دیکھ چکا تھا مگر اب وہ پک چکے تھے اور ان کے وزن سے اس کی شاخیں زمین کے قریب پہنچ گئی تھیں۔ چونکہ اس دن ہاتھی پر سوار تھا لہٰذا اپنے ہاتھ سے بہت سے آم وہاں سے توڑ لئے۔ دو گھڑی رکنے کے بعد اس جگہ سے آگے روانہ ہوا۔ ایک پہر دن بلند ہو گیا ہو گا کہ دریائے گنگا کے کنار پہنچ گیا۔

پل اور کشتی اور میر بحر کی حالت

اس جگہ عجیب طرح کا تماشا تھا۔ میر بحر خانہ خراب نے بدقسمتی سے لالچ میں آ کر دریا کی تمام کشتیوں کو اپنے قابو میں کر کے زمین و دریا کے بادشاہ کے حکم کے باوجود پل درست نہ کیا ہے۔ جو

کوئی پل عبور کرنا چاہتا ہے اس کے ضمن میں ملاح کو اجازت دے دیتا ہے کہ اس (شخص) کو کشتی میں دریا عبور کرائے۔ اس وجہ سے دریا کے کنارے لوگوں کا بہت مجمع بلکہ عام ہجوم لگ گیا۔ بہت کوشش کی کہ ایک دو کشتیاں کسی طرح سے مل جائیں مگر موقع ہی نہیں لگا۔ درست تو یہ ہے کہ طبیعت بھی یہ گوارا نہیں کرتی کہ اتنے سے کام کے لئے خود کو اس کی منت وسماجت کرنے پر مجبور کروں۔ اس سے زیادہ تو کچھ نہیں ہوگا کہ اگر آج دریا عبور نہ ہو سکا تو کل عبور ہو جائے گا۔

پالکی کو دریا کے کنارے اتار کر اس کے سائے میں بیٹھ گیا اور دریا کا نظارہ کرنے لگا اور بے وقوف میر بحر کی کارگزاری کو دیکھنے لگا۔ اس ظالم نے اپنے خیمے کو کہ جو ایک مہتابی (383) اور دو چادروں والا ہے دریا کے اس جانب لگایا ہوا ہے اور کشتیوں کو اپنے قبضے میں لے کر پل کی فکر میں لگا ہوا ہے۔ جیسے جیسے کشتیاں دریا کے اس جانب جاتیں تو خوب صورت آنکھیں اس کا نظارہ کرتیں رہتیں لیکن یہ کہ (کشتیاں) دریا کے اس جانب آجائیں ممکن نہیں ہے۔ مرزا صائب علیہ الرحمہ کا یہ مشہور شعر دل میں آیا۔ اس کی تضمین پر دوسرا شعر میں نے کہا ہے۔ چنانچہ تحریر کرتا ہوں کہ:

کشتی، ای قبلہ حاجات بیابان گردان

گاہ گاہ آن سر دریا بنظر می آئی

بچہ تقریب کسی از تو برو مند شود

نہ بزور و نہ بہ زاری نہ بزر می آئی (384)

مختصر یہ کہ ایک رقعہ کشتی منگوانے کی غرض سے میر بحر کو تحریر کیا کہ جسے اس بیت پر ختم کیا۔

صفحۂ سادہ فلک مفت است

سخنی چند یاد گار نویس (385)

محمد اعظم چوبدار نے جب رقعہ میر بحر کو پہنچایا تو اس نے کہا کہ "اس جگہ کہ جہاں بادشاہی غلام، میر آتش کے قزلباش ملازمین پل کی تیاری کے نگران ہیں، اس وقت تو میرا بھی اختیار نہیں ہے کشتی دے دوں۔ رات کو جس وقت چاند طلوع ہو جائے گا تو کشتی دے دی جائے گی۔ خدا اس کی خیر کرے کہ اس نے وعدہ پورا کر دیا۔ محمد اعظم رات کے تیسرے پہر ایک کشتی کے ساتھ آگیا۔ یہ بھی اسے "کشتی" (386) کے بعد ملی تھی۔

چونکہ میرے نزدیک معقول بات یہ تھی کہ دوستوں کے عبور دریا کے بعد اور سامان گزارنے

اوران کی اشیاء پار گزارنے کے بعد خود دریا عبور کروں گا لہٰذا میں نے کہا پہلے تو برادر مہربان رائے سکھپت رام کا خیمہ و سامان گزرے چنانچہ ایسا ہی کیا گیا۔ پھر لالہ بسنت رائے و لالہ چین سکھ بھی کچھ خیموں و راقم حروف کے سامان کے ساتھ دریا سے گزرے۔ غالباً چار دفعہ کشتی آئی گئی ہوگی۔ پانچویں بار کہ سامان سے بھری کشتی جب دریا کے اس جانب کہ جسے پار کہتے ہیں گئی تو چند قزلباش لوگ کے جن سروں پر چار برکی ٹوپیاں تھیں اچانک گھات سے باہر نکل آئے اور کشتی پر قبضہ کرلیا۔ اور یہ حالت اس مشہور کبت (387) کے مطابق ہے جو زبانوں پر رائج ہو چکی ہے۔ چونکہ مزے سے خالی نہیں ہے لہٰذا درج کی جاتی ہے۔

کبت ہندی

ہاہا، کرت، اودھو، آوت ہے ہیور۔ وندھو سیام جو ہون کھیو جائے تہاتن میرے کی۔
گوکل تو تج، دیئی، متھر اسدکلب کینی، بندرابن سونہہ، لینی بھولے سدھ کھیرے کی۔
کہت کب دیبندھر، رہت اچاٹ ہم، جب سدھ آوت برہ کے بسیرے کی
پیت کی چڑھائے ناو، کاٹ دیئی مانجھ دھار کتنی برجناتھ، کدھو تھل کی نہ تیرے؟ کی (385)

الٰہی! عجیب حالت ہے۔ آدھے لوگ اور سامان دریا کے اس جانب ہیں اور آدھے سے زیادہ اس جانب۔ دوستوں کو ایک طرح کی پریشانی شروع ہوگئی۔ میں نے کہا کہ ''یہ وہ بات ہے کہ جس میں کوئی اختیار نہیں ہوتا۔ اس کے علاوہ اور کوئی علاج نہیں ہے کہ اس (خدا) کی رضا پر راضی رہیں اور قسمت کی نیرنگی کے تماشے دیکھیں کیونکہ:

درین ورطہ کشتی فروشد ہزار
کہ پیدا نشد تختۂ بر کنار (389)

اور اسی طرح دو روز میں پل بھی تیار ہو جائے گا۔ خواہ مخواہ اس کا دردِ سر مول لینا ہوگا۔ اب جبکہ ایسا ہو گیا ہے تو کھانے اور خشک گھاس اور سواری کی فکر کرنی چاہیے۔''

چھوٹا خیمہ کہ جو احتیاطاً ابھی تک کھڑا ہوا تھا کے بارے میں کہا کہ پورے کو صاف کر دیں۔
اس کا موی کپڑے کا ایک کونہ برادر مہربان عزیز تر از جان رائے سکھپت رام کے رہنے کے لئے
اور دوسرا نور چشمان سعادت مندوں کے رہنے کے لئے مقرر کر کے دو موی کپڑوں کو سارے
کپڑوں کی جگہ تان کر مکان کو رہنے کے قابل بنایا۔ کھانے کے لئے بڑی مشکل سے کھچڑی ملی۔
پکانے کے برتن اور اچار لالہ دیوالی سنگھ کے ہاں سے منگوائے گئے۔ وہ اور یہ فقیر شاہجہان آباد میں
ہم محلہ ہیں۔(390) ہر طرح سے گزری اور خوب گزری۔

اٹھارہ تاریخ۔(391) مجبوراً قیام کرنا پڑا۔ مجھے خبر ملی کہ پل میں کسی قدر کام باقی ہے معلوم
ہوا کہ محمد علی جارچی میر آتش کی جانب سے نگران مقرر ہے چنانچہ پل تیار ہونے ہی والا ہے۔ اور
اسی روز شاہجہان آباد سے برادر گرامی قدر ارشد ارجمند مہربان لالہ سکھرام صاحب کا بھیجا ہوا پھل
سردہ(391-A) اور اناناس پہنچا۔ چونکہ محبت میں اثر ہوتا ہے اس لئے جو بھی سردہ کاٹا گیا وہ میٹھا ہی
نکلا۔

اور اسی روز شاہی لشکر سے مشفق مہربان خواجہ بادشاہ اور خان مہربان خیر اللہ خان پہنچے اور
اسی روز صبح کے وقت دوندے سنگھ وغیرہ سواروں کو چند اونٹوں کے ساتھ گھریلو سامان لئے موضع
گجرولہ(392) روانہ کیا۔

قصہ مختصر یہ کہ ابھی کوئی چیز کھائی نہ تھی اور جن لوگوں کو میں نے موضع گجرولہ روانہ کیا تھا وہ
واپس نہ لوٹے تھے کہ چوبدار رائے صاحب مجلس رائے (392-A) نے پیغام پہنچایا کہ پل تیار
ہونے والا ہے اور شاہی حکم یوں ہے کہ پہلے رہکلے اور اشیاء بردار چھکڑے پل سے گزریں گے۔
میر مرزا قاسم بیگ جو توپخانہ کے کروڑہ(393) ہیں اور ان کے ساتھ بہت خلوص قائم ہے، کے
ساتھ وعدہ ٹھہرا کہ تمام سامان و چیزوں کے ساتھ تمہیں بھی گزار دوں گا۔ اس صورت میں اگر چھکڑہ
اور سامان لدے ہوئے اونٹ بھیجے جائیں تو وہ ایک ساتھ دریا سے گزر جائیں۔

فقیر نے صرف اس پیغام پر اکتفا نہیں کیا تھا۔ نور چشم کامگار رائے کرپا رام سے میں نے کہا
کہ تم خود جا کر مرزا قاسم بیگ سے ملاقات کر کے (ہماری جانب) بھیجے گئے پیغام کو پکا کر لو۔ اس
وقت کوچ کرنا ترک کر دیا جائے گا۔ نور چشم نے قدم بڑھا کر مرزا اندکور کہ جو داڑھی اور مونچھیں
مونڈے ہوا ہندوستانی نژاد جوان (بلکہ) ہندی تھا(394) سے ملاقات کی۔ وہ اور مسرور خواجہ

سرای امیر الامرا (395) کہ جس کا مرزا متبنی ہے بہت انسانیت اور مروت سے پیش آئے اور انہوں نے کہا کہ جلدی سے سامان والوں کو بھیجنا چاہئے کہ پہلے ان کو اور اس کے بعد دیگر اشیاء کو پل سے گزارا جائے گا۔ جب یہ پیغام پہنچا تو میں کوچ کرے پل کے کنارے پہنچ گیا لیکن کیا دیکھتا ہوں کہ پل تیار نہ ہوا ہے اور اس میں ابھی کافی کام ہونا باقی ہے آج رات شاید ہی درست ہو۔ غرضیکہ شام تک انتظار کیا مگر پل تیار نہ ہوا۔

اس دن کی کیفیت کہ باوجود بہت انتظار کے پل سے دریا عبور کرنا نہ ہو سکا اور رات بغیر خیمے و سامان کے صحرا میں گزری۔

فقیر جو کہ تیسرے پہر سے پل کے کنارے تھا نے خود سے کہا کہ اس طرح سے ساری رات بسر نہیں ہو سکتی۔ ابھی مصلحت اس میں ہے کہ خیمہ لگا لیا جائے اور رات جیسی بھی گزرے گزار لی جائے۔ کل اپنی بولیں گے اور دوسروں کی سنیں گے۔ پل پر دوستوں سے خدا حافظ کہہ کر اس جگہ پہنچا کہ جہاں پر خیمہ تھا۔ دیکھا کہ اس جگہ میر جملہ بہادر مرحوم مغفور کے داماد خان ذیشان سید جمیل الدین خان (396) کے سامان لدے چھکڑے کھڑے ہیں اور سامان کھول رہے ہیں۔ اس کے قریب تھوڑی سی جگہ تھی۔ (غلطی سے) خواجہ بادشاہ اور خیر اللہ خان کا (سامان) خیال کر کے میں نے کہا: ''ٹھیک ہے! اسی جگہ خیمہ لگایا جائے۔'' جب اونٹوں کا سامان کھولا گیا تو اس فقیر کے ملازموں اور سید جمیل الدین خان کے ملازموں میں جگہ کے معاملے پر بیجا تکرار شروع ہو گئی۔ اور قریب تھا کہ خانہ جنگی شروع ہو جائے۔ ایک تو یہ کہ خان معزالیہ جاننے والے ہیں اور دوسرے یہ کہ اگر جنت (آرام) چاہئے تو اس دردسر کی قیمت پر نہیں چاہئے۔ میرے دماغ میں جنون آ گیا اور میں نے دل میں طے کیا کہ رات صحرا میں بے کسی اور غربت میں بسر کرنا اس سے ہزار مرتبہ بہتر ہے کہ لشکر میں اس طرح کی کشمکش اور ہنگامہ آرائی پیدا کی جائے میں نے اپنے خادموں سے کہا کہ خیمہ کھڑا نہ کریں اور خود چونکہ سامان کھول لیا ہے لہٰذا اسی جگہ رات گزاریں۔ میں جاتا ہوں۔ جو جگہ پسند آئے گی رات گزار لوں گا۔ کل جس وقت کہہ کر روانہ ہو جاؤں تو سامان کو اٹھا کر چلے آنا۔ اور خان ذیشان سید جمیل الدین خان کے مدار علیہ نیاز بیگ سے کہا کہ ''پیارے دوست، مصرع:

''تو بنشین، با حریفان گرم کن صحبت کہ من رفتم'' (397)

میں نے جنگل کی راہ پکڑی، چونکہ نواب صاحب وزیر الممالک بہادر کی سواری اور ان کے گروہ و مجمع کی آمد درمیان میں تھی کیونکہ وہ اسی روز حسن پور سے کوچ کر گئے تھے، اس لئے ہجوم اور دھکم پیل کی وجہ سے لشکر سے بڑی مشکل اور دقت سے باہر نکلا۔ الٰہی! جنگل پہنچ کر میں نے لگام کھینچی اور کہا۔ ''بسم اللہ! دوستو، آج کی رات زمین کے اسی ٹکڑے پر گزارنی ہوگی۔ کل کوئی اچھی جگہ دیکھ کر خیمہ لگائیں گے۔ ایک طرح سے وہیں سکونت کی۔ ملازم چونکہ میرا سونے (نیند) کا پلنگ احتیاطاً ساتھ لے آئے تھے لہٰذا وہ بچھا دیا۔ قہوہ پینے کے بعد اس پر لمبا پڑ گیا۔ دوستوں نے رانوٹی چادروں میں سے ایک چادر کہ جو اتفاق سے ساتھ تھی زمین پر بچھا کر، ہر دوست اس کے ایک ایک حصے پر کسی طرح سے سو گیا اور کوچوانوں نے سواری کے گھوڑوں کو ہاتھ میں پکڑے رات گزارتے ہوئے دن کر دیا۔ مرزا مومن بیگ اس رات صبح ہونے تک بیدار تھے اور انہوں نے کوئی لمحہ احتیاط برتنے سے جانے نہ دیا۔ غرض کہ عجیب طرح کی غریبانہ اور قلندرانہ رات گزری اور اس روز چند عدد سردہ (398) کے علاوہ کہ جو دوست پل کے کنارے سے توڑ لائے تھے کوئی چیز کھانے کو میسر نہیں آئی۔

شنیدۂ تو کہ محمود غزنوی شب دی
نشاط کرد و شبش جملہ در سمور گزشت
یکی فقیر در آن شب لب تنور گزید
شب تنور بر آن مستمند عور گذشت
صباح نعرہ برآورد وگفت ''ای محمود!
شب سمور گزشت و شب تنور گزشت'' (399)

اس رات سے دوسرے روز انیس تاریخ (400) کو اس جگہ سے حرکت کر کے موضع تکری (401) پہنچا کہ جو شاید لشکر سے ایک کروہ ہوگا۔ اور اس ارادے سے کہ اس جگہ ڈیرہ کروں گا، ملازموں کو خیمے والے اونٹ لانے کے لئے دوڑایا۔ اسی دوران میں خیر اللہ خان آ گئے اور کہنے لگے کہ رات کو عجیب بات ہوئی۔ سید جمیل الدین خان جب اس جگہ پہنچے اور انہیں اس ماجرے کی خبر ہوئی تو اپنے ملازموں کو خوب پیٹا اور خود بھی اس جگہ خیمہ نہیں لگایا۔ اب جگہ خالی ہے۔ خدا کے لئے اسی جگہ خیمہ لگا لیا جائے۔ ابھی اسی خیال میں تھا کہ کیا کرنا چاہئے کہ کسان خان ذیشان سید جمیل

الدین بھی وہاں پہنچ کر معافی مانگنے لگےاور غلطی پر حد سے زیادہ (معذرت) کرنے لگے۔مجبور ہو کر پھراسی جگہ آ گیااور خیمہ کو وہاں کھڑے پایا۔ نیچے اتر آیااور چونکہ دوروز سے کچھ نہیں کھایا تھااس لئے میں نے تاکید کی کہ جیسی بھی روٹی پکی ہو دے دیں۔اس روز دوپہر کے وقت جو کچھ پکا تھا بڑی رغبت سے کھالیا۔اور تیسرے پہر خان ذیشان سید جمیل الدین خان نے فقیر کے خیمے میں آکراس حرکت کی معافی جوکہ گزشتہ کل ان کے ملازمین سے ہوگئی تھی چاہی۔غرض کہ خان معزالیہ میں چند خوبیاں ہیں کہ جو دوسروں میں نہیں ملتیں۔وہ اپنے وقت کے خوبصورت لوگوں میں سے ہیں اور شکار کرنے کے بہت شوقین ہیں اس جگہ بھی ان کا دل شکار کرنے سے غافل نہیں ہے۔الٰہی! مجھے معلوم ہوا کہ پل کے کنارے سرکار نواب صاحب وزیرالممالک بہادر کے لوگوں کا انتظام ہو گیا ہےاور گروہ بڑی سہولت کے ساتھ گزرسکتا ہے۔میں نے خیمہ اور اسباب اونٹوں پر لاد کر چاہا کہ پل کے کنارے چلوں کہ اسی دوران خدمہ عالیہ بیگم صاحب محل نواب سیف الدولہ بہادر (402) کی عنایت کردہ کشتی پہنچ گئی اور اس سے دل کو بہت راحت نصیب ہوئی کیونکہ پل پر ہجوم اور دھکم پیل بہت زیادہ تھی۔سامان اور چیزیں کشتی پر عبور کرنا شروع کیں۔اس دوران بارش بھی ہوگئی۔بعض دوست عزیزوں کے خیمے میں اور یہ فقیر اپنے رتھ میں سوار ہو گیا۔قصہ مختصر یہ کہ اس کے بعد تمام سامان بلکہ ہاتھی بھی کشتی پر سے گزر گئے۔پانچ گھڑی رات باقی تھی۔راقم حروف نے چاند کی روشنی میں دریا عبور کیا۔اس جگہ کہ جہاں پر دریا میں طغیانی تھی،اس وقت کہ جب کشتی بیچ دریا میں پہنچی تو ہوا کے زور سے ہر موج بلند ہو جاتی۔چاند کے بڑھنے کی وجہ سے (موجیں) صاف شفاف ٹیلے کی طرح محسوس ہوتی تھیں۔سامان اور چیزیں اور لوگ سب خیریت سے دریا سے گزر گئے سوائے ایک اونٹ کے کہ جو پل کے کنارے دھکم پیل میں ضائع ہو گیا۔

بیس تاریخ۔(403) دریا کے اس جانب قیام کیا۔

سانحہ

دو کشمیری پنڈت خاص طور پر وہ کم بخت نمک حرام نندو کہ جو داڑھی مونچھ کو نمایاں کر کے عجیب خرکلہ (404) لگتا ہے،کھانا پکانے کے لئے نوکر رکھا گیا تھا۔یہ خانہ خراب از خود کھانا پکانے کے تمام تر لوازمات پہلے ہی دن کہ جب کشتی ملی تھی دریا سے گزار کر لے گئے اور پھر اس جانب مڑ

کر بھی نہ دیکھا۔اب جو میں نے دریا عبور کیا تو آ کر حاضر ہوئے۔چونکہ میرا دل ان کے ہاتھوں (جل کر) کباب بن گیا تھا لہٰذا میں نے کہا کہ "اے کم بختو! یہ کیا بے غیرتی ہے جو تم نے کی ہے۔ اگر چہ لکڑی سے پیٹنا معقول معلوم ہوتا ہے لیکن ابھی تمہاری سزا یہی ہے کہ میری نظروں سے دور ہو جاؤ اور دفع ہو جاؤ۔" غرض کہ نوکری سے برطرف کر دیا۔اور دراصل یہ بھڑوے (405) نوکری کے قابل نہ تھے۔کونسی مصیبت ہے کہ جو اس سفر میں میں نے ان سے نہیں اٹھائی ہے اور کونسی تکلیف ہے جو ان کی غلط حرکات میں مجھے نہ پہنچی ہو۔واقعی سفر آدمی کے تجربے کی کسوٹی ہے۔

مختصر یہ کہ زیادہ خیمے کو گڑھ مکتیسر میں چھوڑ کر اور ایک چھکڑا سامان والے کا کرایہ دے کر اکیس تاریخ کو روانہ ہوا اور تیسرے پہر ہاپوڑ پہنچ کر آم کے درختوں میں خیمہ لگایا کہ جس کے اس جانب آبادی ہے۔

بائیس تاریخ۔(406) کوچ کر کے سرائے لال خان پر پہنچا اور انہی درختوں کے سائے میں کہ جہاں جاتے وقت خیمہ لگایا تھا کچھ دیر رک کر قہوہ پیا اور جو کچھ موجود تھا وہ کھایا اور دن کا ڈیڑھ پہر باقی تھا کہ اس جگہ سے سوار ہو گیا اور غازی نگر (407) کے بیچ میں گزرا۔اور دریائے ہیندن (408) کو عبور کر کے سرائے بسنت (409) کہ جو محض ویران ہے قیام کیا۔جب خبر ملی کہ سرائے بسنت آباد نہیں ہے تو اپنے ملازموں سے کہا کہ جب تک غازی الدین نگر (410) پہنچیں تب تک کے لئے ضرورت کی چیزیں اسی جگہ سے خرید لیں اور یہ بات آرام کا سبب ہوئی۔اور یہ سرائے بقال کی ایک دوکان سے زیادہ اور کسی شے کی حامل نہ تھی۔رات کو کوئی چیز نہ کھائی اور چونکہ طویل سفر کی وجہ سے طبیعت خراب تھی لہٰذا شام ہوتے ہی سو گیا۔رات کا ایک پہر باقی تھا کہ اٹھ گیا اور ملازموں کو سامان باندھنے کی تاکید کی۔اور خود غسل کیا۔ابھی چار گھڑی رات باقی تھی کہ سوار ہو گیا، تئیس تاریخ یوم پنجشنبہ (411) سفیدہ صبح کے نمودار ہوتے گنج (412) پہنچ گیا۔دو گھڑی دن چڑھا تھا کہ دریائے جمنا کے پل پر سے بہت آسانی کے ساتھ گزر گیا۔چونکہ دریا طغیانی پر نہیں تھا اس لئے اس کا پل پینتیس کشتیوں سے تیار کیا ہوا تھا برخلاف دریا گنگا کے کہ جس کا پل پچانوے کشتیوں والا تھا۔الٰہی! پھر میں نے گھر کی راہ لی اور پانچ گھڑی دن چڑھا ہوا تھا کہ حویلی پہنچ گیا۔ برادر عزیز القدر کشمیری مل اور دیگر دوست (413) استقبال کے ارادے سے نکلے ہوئے تھے۔ان کو اتنی فرصت ہی نہیں ملی کہ پل کے کنارے پر پہنچ پاتے۔محلہ کے بازار کے دروازے کے شروع

پر ہی اچانک ملاقات ہوگئی۔حویلی پہنچنے کے بعد میں نے گرامی برادر ارشد ارجمند مہربان لالہ سکھرام صاحب سے ملاقات کی اور کس کر بغل میں بھینچ کر داد دی اور دل اپنے مشتاق تک پہنچ گیا۔ ان دو ماہ میں میں نے چونکہ شورہ اور ٹھنڈک ہونے کی وجہ سے عہد کیا ہوا تھا کہ اس سفر میں ٹھنڈا پانی نہیں پیئوں گا لہٰذا جیسے ہی حویلی میں داخل ہوا تو شگون کی رسمیں پوری کرنے کے بعد کنویں کا پانی کہ جو نہر کا پانی داخل کر دینے سے بہت ٹھنڈا اور میٹھا ہو جاتا ہے پیا اور خدا تعالیٰ کے حضور سجدہ شکر بجالایا۔اس تین ماہ کے سفر میں چودہ اشرفیاں اور چھ ہزار دو سے انچاس روپیہ بارہ آنے خرچ ہوئے۔جن کی تفصیل روزنامچے میں درج ہے۔ بندگان حضرت قدر قدرت اسی مہینے کی یعنی جمادی اول کی آخری تاریخ یوم پنجشنبہ (414) کو ایک گھڑی دن چڑھنے پر بدولت و اقبال بسواری تخت رواں شکاری پر دہلی دروازے کی راہ سے دولت خانہ شاہجہان آباد میں داخل ہوئے۔ امرائے عظام میں سے ہر ایک نے اپنی حیثیت کے مطابق نذر پیش کی اور آداب مبارکباد بجا لائے۔الحمد للہ والمنۃ۔آج کہ بارہ رمضان المبارک سن گیارہ سو اٹھاون ہجری اور سن اٹھائیس جلوس محمد شاہی ہے اور دن یکشنبہ (415) ہے، یہ چند اجزاء کہ جن کا موضوع بن گڑھ کے سفر کے حالات کے بارے میں ہے رات کی چار گھڑیاں گزرنے پر موسم خزاں کی آمد کے آغاز پر فقیر آنند رام مخلص کے ہاتھ سے اختتام پر پہنچے۔فقط۔

واضح ہو

کہ نو رمضان المبارک سن گیارہ سو اٹھاون ہجری و سن اٹھائیس جلوس محمد شاہی روز چہار شنبہ (416) کو طلوع آفتاب سے قبل اور دسہرہ سے ایک دن بعد نور چشم کامگار رائے فتح سنگھ کے گھر سعادت مند بیٹا پیدا ہوا، اللہ اسے طبعی عمر تک پہنچائے۔اس کا نام گلاب سنگھ رکھا گیا اور تین چار روز تک محفل خوشی اور بزم عشرت بہت خوبی اور آرائش سے منعقد رہی۔ میں اس (خدا) تعالیٰ شانہ کے فضل کا امیدوار ہوں کہ نور چشم گلاب رائے و کرپارام کو بھی نیک بیٹا بنائے اور ان کو سلامت رکھے۔اور اتفاق سے (ہمارے) باغ کے اس نئے پھول کی ولادت مبارک اس نسخہ کے ختم ہونے سے چار دن قبل ہوئی۔

حوالہ جات

227- قدیم شہر سنبھل کے دو دروازے ہیں اول دہلی دروازہ دوم بدایوں دروازہ۔ چونکہ آنند رام مخلص دہلی کی جانب سے آکر اور بدایوں کی جانب نکل چکا تھا اس لئے اس دروازے سے مراد بدایوں دروازہ ہے۔

228- مخلص نے مراۃ میں تحریر کیا ہے کہ سنگ زور ایک ایسا پتھر ہوتا ہے کہ جس پر پہلوان اور کشتی باز زور لگاتے ہیں۔

229- مخلص نے یہاں پر لفظ ''معلق زنان'' استعمال کیا ہے۔اس کے دو معنی ہوتے ہیں اول بازیگر دوم رقاص۔ یہاں پر پہلے معنی ہی مراد ہیں۔

230- یعنی ان لوگوں کا طرز رہائش دہلی والوں کی طرح سے شاہانہ ہے۔

231- امین الدولہ بہادر کا اصل نام شیخ محمد امین تھا۔ بہادر شاہ اول کی وفات کے بعد شہزادوں کی خانہ جنگی میں عظیم الشان کا طرفدار تھا۔ ''انشائے یار محمد'' کا مصنف یار محمد اسی کا منشی تھا۔ عظیم الشان کی شکست کے بعد قید ہوا اور فرخ سیر کے حکم سے قتل ہونے سے بال بال بچا۔ داروغہ کے عرض مکرر کے عہدے پر فائز رہا۔ محمد شاہ بادشاہ کے دور میں پہلے وقائع خواں مقرر ہوا۔ اس کے بعد میر توزک اول مقرر ہوا۔ چار ہزاری منصب سے شش ہزاری سوار کے عہدے پر ترقی پائی۔ نادر شاہ کے ہندوستان سے کوچ کرنے کے کچھ عرصے کے بعد وفات پائی۔ (مآثر الامراء جلد اول 8-357)۔ مخلص کے بیان سے ظاہر ہے کہ سات ہزاری ذات وسوار کا منصب بھی پایا جو بہت اعلیٰ منصب ہوتا ہے۔

232- نواب امین الدولہ کی اولاد بیسویں صدی تک وہیں پر آباد رہی۔ امین الدولہ مذکور نے اسی جگہ پر ایک چبوترہ بھی بنوایا تھا جسے لکھی چبوترہ کہتے ہیں۔ جب بادشاہ محمد شاہ اس جگہ آیا تھا تو امین الدولہ نے اس چبوترے پر ایک لاکھ روپیہ خیرات کیا تھا۔ اسی وجہ سے یہ

لکھی چبوترہ کہلاتا ہے (مراد آباد گزیٹیر ص 256)۔نواب امین الدولہ کی اولاد میں سے عاشق حسین سنبھلی نامی شخص اس جائیداد کا وارث تھا (ایضاً ص 100)۔ یہ جائیداد جو بشکل قلعہ تھی محلہ میاں سرائے میں تھی۔

-233 ہنود کی روایت کے مطابق کلنکی اوتار کا ظہور یہیں ہوگا (ڈاکٹر اظہر ص 47 حاشیہ 2) منڈل سے مراد مندر ہے اور ہر سے مراد بھگوان ہے۔

-234 ''سنبھل بہت خوش نصیب ہے کیونکہ بھگوان ہر منڈل میں ظاہر ہوں گے''۔

-235 بابر بادشاہ ہندوستان میں خاندان مغلیہ کا پہلا حکمران تھا۔ وہ 888ھ/1483ء کو پیدا ہوا اور 937ھ/1530ء کو فوت ہوا۔ اس نے 1526ء میں تخت دہلی پر قبضہ کیا۔

-236 ہمایوں بادشاہ، بابر کا لڑکا تھا۔ وہ 1530ء میں تخت دہلی پر بیٹھا۔ عیاشی کے سبب حکومت سنبھال نہ سکا اور شیر شاہ سوری نے اسے ہندوستان سے بیدخل کر دیا۔ شیر شاہ کے جانشینوں نے جب حکومت کمزور کر دی تو پھر آ کر ہندوستان پر قبضہ کر لیا اور چھ ماہ بعد ہی فوت ہو گیا۔ اس کی وفات 963ھ/1556ء میں ہوئی۔ اکبر بادشاہ اسی کا لڑکا تھا۔

-237 کہتے ہیں کہ اس مسجد کی جگہ پر پہلے مندر تھا۔ اس بارے میں سنبھل کے ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان مقدمہ بازی بھی ہوئی تھی مگر فیصلہ مسلمانوں کے حق میں ہوا۔ 1874ء میں مسٹر کارلائل نے مسجد پر تحقیق کی اور کہا کہ گنبد ہندو عمارت کا ہے مگر اس کے علاوہ باقی تمام عمارت مسلمانوں کی چھوٹی اینٹ کی بنی ہوئی ہے۔ اس کا خیال تھا کہ حال ہی میں مندر کو مسجد بنایا گیا ہے۔ اس کی دلیل یہ تھی کہ ہندوؤں کے مطابق مسجد کی دیواروں پر موجود قدیم کتبات جعل سازی ہیں۔ البتہ سول کورٹ میں کارلائل کا دعویٰ غلط ثابت ہو گیا کیونکہ اس نے وہ دستاویزات نہیں دیکھیں تھیں جو کہ جہانگیر کے دور کی تھیں اور مسجد کے متولیوں کے پاس تھیں۔ جنرل کننگھم کے مطابق یہ کتبات درست ہیں جن میں اہم کتبہ وہ ہے جس میں 1526ء میں بابر کے حکم سے ہندو بیگ نامی گورنر کا یہ مسجد تعمیر کرنا ہے۔ سنبھل بابر کی آمد کے وقت صدیوں سے مسلمانوں کا گڑھ تھا اور سکندر لودھی کا عارضی دارالحکومت بھی تھا۔ اس تمام عرصے میں مندر کا قائم رہ جانا حیران کن بات ہے۔ خیال ہے کہ یہ مسجد بابر سے بھی پرانی ہوگی کیونکہ اس کا طرز تعمیر پٹھانوں کی

عمارات کے مشابہہ ہے جیسے کہ بدایوں کی مسجد ہے۔صرف سیڑھیوں کے دو پتھر ہندو ملبے کا اشارہ دیتے ہیں جس کے بارے میں یہ کہا جاسکتا ہے کہ کسی ہندو عبادت گاہ کا ملبہ یہاں پر استعمال ہوا ہوگا۔آئین اکبری میں سنبھل میں ہندوؤں کے مندر کا تذکرہ ہے مگر اس سے مراد یہ نہیں کہ وہ مندر یہی ہوگا۔اس مسجد کے جنوب میں ایک کتبہ اور بھی ہے کہ جس پر رستم خان دکھنی کے دور میں ہونے والی مرمت کا تذکرہ ہے۔سال 1657ء تھا۔1626ء میں بھی اسی مسجد میں سید قطب نے ایک کتبہ لگایا تھا۔دو اور کتبے اس بات کی جانب نشاندہی کرتے ہیں کہ 1845ء میں مسلمانوں نے یہ جگہ پھر سے آباد کی تھی۔ مسجد کے جنوب مشرق میں مسجد کے مجتہدوں کے مزارات ہیں جن کے قبضے میں تین سو سال سے یہ مسجد تھی۔اس خاندان کے ریکارڈ کے مطابق 1689ء میں یہاں کے نائب گورنر دیاناتھ سنگھ نے محمد افضل کے مسجد کا امام ہونے کی توثیق کر کے شہر کے جاگیرداروں پر ٹیکس عائد کیا تھا۔اسی طرح سے بعد میں ذوالفقار خاں بہادر،امیر الامراء نصرت جنگ بہادر نے 1707ء میں،قمرالدین خان اعتمادالدولہ نے 1723ء میں اور رائے دولت سنگھ نے 1777ء میں کیا تھا۔(مرادآباد گزیٹیر)۔

238- جامع مسجد انبیہ فضل و کمال جہاں پر ملک و ملت کا جھنڈا بلند ہوتا ہے باسط اصحہ امن و امان اور علم و عمل کی بنیاد،بادشاہ بابر جو شاہ جمشید کی مانند ہے،اللہ تعالیٰ عز و جل اس کی حفاظت کرے۔جب اس کی حکومت کا چراغ ہندوستان میں روشن ہوا تو سنبھل اس کے پرتو سے روشن ہو گیا۔اس مسجد کی بنیاد رکھ کہ جو نقصان و ریخت سے محفوظ رہے،اس نے اپنے اس کم تر غلام کو فرمان دیا کہ عمدہ ارکان دولت میں صاحب عقل و ذہانت میر ہندو بیگ بھی تھا وہ اخلاق میں لاثانی ہو گیا کہ جب شہنشاہ زمان کے فرمان سے اس نے مسجد مکمل کرنے کی یہ توفیق حاصل کی کہ شروع سے اب تک جو سال اور تاریخ اور مہینے اور دن گزرے ہیں وہ ربیع الاول کی پہلی تاریخ ہے۔

239- دراصل یہ گنبد قدیم آبادی کے عین وسط میں تھا۔مخلص جس کو ''شہر سے باہر'' کہہ رہا ہے وہ آج شہر میں ہی شامل ہو چکا ہے۔

240- اس کے بعد عوضانے میں دل کے آنسو باہر آ گئے

پانی جب کم ہو گیا تو چشمے سے پھول باہر آ گئے

241- قلعہ سنبھل سرخ اینٹوں کا بنا ہوا ہے۔ یہ قلعہ رستم خان دکھنی کے نائب سید سعید فیروز نے بنایا تھا۔ مراد آباد کے قیام کے وقت سنبھل ہی صوبائی دارالحکومت تھا۔ یہ قلعہ بہت دلچسپ ہے۔ لیکن اس میں قلعہ کے بانی سید سعید فیروز اور اس کے گھرانے کی کوئی نشانی باقی نہ بچی ہے۔ بیسویں صدی تک یہاں پر فیروز کی اولاد آباد رہی جس کے پاس شاہجہان، فرخ سیر اور دیگر بادشاہوں کی عطا کی گئی اسناد اور فرامین موجود تھے۔ قدیم شہر سنبھل اس کے اندر اور ملحقہ علاقوں میں آباد ہے جس میں مشہور محلے دہلی دروازہ، بدایوں دروازہ، نالا، سورج گنج آباد ہیں۔ اس قلعے کے مشرق میں بریلی سرائے اور منو کامنا نامی محلے ہیں۔ قلعے کے شمال میں دیپا سرائے اور تیمار داس سرائے نامی محلے ہیں۔ شمال مشرق میں میاں سرائے، نواب پورہ، کٹرہ موسیٰ خان، ہلالی سرائے، پنجو سرائے، ڈونگر سرائے، کوٹلہ، پھلوار، تشت پور نامی محلوں کے علاوہ بیگم سرائے کا بھی کچھ حصہ ہے۔ اس کے ملحقہ حصے میں ٹھر، پکی سرائے، چمن سرائے، لودھی سرائے، نکاشا محمود خان کی سرائے، امام الدین کی سرائے، اعظم گنج اور اکبر پور منڈی نامی محلے ہیں۔ شمال مغرب میں حاتم سرائے، شہباز پورہ، خواص خان کی سرائے، حوض بھادیسرا، خاگو سرائے، دارا سرائے، میٹھی سرائے اور نبی سرائے ہیں۔ قلعے کے وسط میں قدیم جامع مسجد ہے مگر قلعہ بہت شکستہ و ریختہ ہے جیسا کہ مخلص نے بھی بیان کیا ہے بہت سی پرانی عمارتیں گر چکی ہیں۔

242- اس علاقے میں اب بھی تمباکو بہت پیدا ہوتا ہے۔ گزیٹیر آف مراد آباد میں بھی اس بات کا ذکر ہے کہ سنبھل تمباکو کے لئے بہت مشہور ہے۔ (ص 34) اور اس کے علاوہ سرسی میں بھی تمباکو بہت ہوتا ہے (ص 266)۔

243- کراکو بھی تمباکو کی ایک قسم ہوتی ہے مگر بہت سخت تمباکو ہوتا ہے (ڈاکٹر اظہر ص 49 حاشیہ 4)۔

244- مخلص نے لفظ بیلدار ہی استعمال کیا ہے۔

245- یکم ربیع الثانی 1158ھ بمطابق 4 مئی 1745ء بروز جمعہ

246- اعزالدولہ بہادر کا اصل نام یحییٰ خان تھا یہ لاہور وملتان کے گورنر زکریا خان ابن عبدالصمد خان کا بڑا بیٹا تھا اور وزیر اعظم قمرالدین خان کا بھانجا تھا۔ (مآثر الامراء تذکرہ زکریا خان ولد عبدالصمد خان)۔

247- حیات اللہ خان بہادر ابن زکریا خان ابن عبدالصمد خان۔ یہ متذکرہ بالا کا چھوٹا بھائی اور قمرالدین خان کا بھانجا تھا۔ دوآبہ جالندھر کا فوجدار تھا۔ نادر شاہ نے اسے شاہنواز خان کا خطاب دیا تھا۔ محمد شاہ نے زکریا خان کی وفات کے بعد لاہور وملتان کی گورنری حیات اللہ خان کو دے دی تھی۔ (مراۃ الاصطلاح + مآثرالامراء تذکرہ زکریا خان)۔

248- خان جہاں بہادر کا اصل نام سربلند خان تھا۔ یہ اور محمد خان بنگش، شاہ خوب اللہ کے معتقدین میں سے تھے (ڈاکٹر اظہر ص 51 حاشیہ 1)۔

249- مخلص کے ایک ملازم نے اس کے لئے فارسی لفظ ''یک وئیمی'' استعمال کیا ہے۔ مراۃ کے مطابق ڈیوڑھی وہ دیوار ہوتی ہے جو گھر کے آگے کے حصے میں پردے کی غرض سے بنا دیتے ہیں۔ مخلص کی مراۃ میں بیان کردہ یہ تعریف نوادر اللغات کے مطابق ہے۔ نوادر میں ہے کہ سلاطین وامراء کے ہاں ڈیوڑھی کے طور پر کوئی مکان ہونا چاہئے۔ کیونکہ محض دیوار لگانا غریب لوگوں کی استعداد ہوتی ہے۔ بادشاہوں اور امراء کے خیمے کے آگے بطور ڈیوڑھی کے خیمہ نصب کیا جاتا ہے جسے ''کندلہ'' کہتے تھے۔ (ڈاکٹر اظہر ص 51 حاشیہ 3)۔

250- قائم خان کے بھائیوں کے نام درج ذیل ہیں:

(1) احمد خان
(2) امام خان
(3) خدابندہ خان
(4) اکبر خان
(5) عطاء اللہ خان
(6) اعظم خان
(7) مرتضیٰ خان
(9) عبدالنبی خان
(10) صلابت خان
(11) حسین خان
(12) فخرالدین خان
(13) منور خان
(14) محمد امین خان
(15) اسمعیل خان
(17) کریم داد خان
(18) شائستہ خان
(19) منصور علی خان
(20) شادی خان
(21) ہادی داد خان

(8)مرید خان (16)بہادر خان

قائم خان کی 18 بہنیں تھیں جن کے نام یہ تھے:

(1)رحمت النساء

(2) کریم النساء

(3) بیگم صاحبہ

(4)بی بی کافیہ

(5)بی بی دولت خاتون

(6)اصالت خاتون

(7) کاملہ خانم

(8)عابدہ خانم

(9)صاحب خاتون

باقی بہنوں کے نام معلوم نہ ہوسکے۔ بعض کے نزدیک ان کی تعداد 22 تھی۔

(عہد بنگش از مفتی ولی اللہ فرخ آبادی مرتبہ ایوب قادری ص 87-80)

251- شجاعت خان قوم کا غلوئی پٹھان تھا۔ اس کے پاس علی محمد وغیرہ کے بال بچے تھے۔ وہ روہیلوں کا خیر خواہ تھا۔ قائم خان اور روہیلوں کے درمیان جنگ میں اس کی شرکت صرف قائم خان کی ملازمت کی وجہ سے تھی۔ اس جنگ میں وہ ایک جانب کھڑا رہا اور خود کو روہیلوں کے حوالے کر دیا۔ مگر ایک عجلت باز روہیلے نے اس کو گولی مار کر ہلاک کر دیا۔

(اخبار الصنادید جلد اول ص 15-214)۔

252- یعنی سردار کا بیٹا، قربان ہونے والے کی نسل (اس میں اشارہ اپنے والد محمد خان بنگش کی جانب ہے جسے مغلوں سے جاگیر ملی تھی)۔

252A-تہ نشان سے مراد یہ ہے کہ بادشاہوں کے ہاں تلوار کے قبضے (کور) پر کوئی نشان کندہ کیا جاتا اور پھر اس میں جواہرات یا سونا بھر دیا جاتا تھا۔ اس کو تہ (بمعنی نیچے) نشان کہتے تھے۔

253- منکباشی۔ منگ ترکی میں ہزار کو کہتے ہیں اور باش سے مراد سردار ہے۔ منگ باشی سے

مراد ''ہزار مردوں کا سردار'' ہے۔(ڈاکٹر اظہر: دیباچہ سفرنامہ ص 111-109)۔

254- بڑی بندوقوں کے لئے یہاں پر مخلص نے لفظ ''جزایر'' استعمال کیا ہے۔

255- یہ سارا انتظام قائم خان پر رعب ڈالنے کے لئے تھا۔ کیونکہ گمان تھا کہ قائم خان یا اس کے فوجی ہم قومی (پٹھان ہونے) کی بنا پر روہیلوں سے مل سکتے ہیں۔ رعب ڈال کر یہ واضح کرنا چاہا کہ تم اتنے کثیر لشکر کا مقابلہ نہیں کر پاؤ گے۔

256- دو ربیع الثانی 1158ھ بمطابق 5 مئی 1745ء بروز بدھ۔

257- تین ربیع الثانی 1158ھ بمطابق 6 مئی 1745ء بروز جمعرات۔

258- یعنی ایسے رنگ سے جو لوہے میں لگنے والے زنگ کا سا ہوتا ہے۔

259- مراۃ میں مخلص نے تحریر کیا ہے کہ یہ لفظ پانی کا اہتمام کرنے والے کے لئے استعمال ہوتا ہے۔ ایران سے آیا ہے۔ ہندوستانی فارسی میں ''داروغہ نہر آب'' استعمال ہوتا ہے۔

260 کاغذ باد کے معنی ہوا میں اڑنے والا کاغذ یعنی پتنگ کے ہیں۔ مراۃ میں درج ہے کہ اس دور میں دہلی میں پتنگ بازی کا بہت رواج تھا۔ لوگ طرح طرح کی جدتیں دکھاتے تھے مثلاً رات کے وقت ڈور میں بارود باندھ کر آتش بازی کا سماں پیدا کرتے تھے۔

261- جس سال مبارک بادشاہ محمد شاہ
لشکر کو مشرقی ملک کی جانب لے گیا
تو ایک دن ہوا سے خیموں والے لوگ
پتنگ کی طرح سے آسمان پر اڑ گئے۔

262- حاتم علی خان کے حالات معلوم نہیں ہو سکے۔

263- اورینٹل کالج میگزین نومبر 1941ء صفحہ 119 پر اس کا اصل نام لچھ رام درج ہے جو مخلص کا بہت پرانا خدمت گزار تھا۔

264- میرزا جلال اسیر ایران سے ہندوستان آیا تھا۔ وہ مضامین کی باریکی کے لئے مشہور ہے۔ (ڈاکٹر اظہر ص 54 حاشیہ 4)۔

265- ہرن کے گوشت کے کباب کا مزہ نمک سے آزاد ہوتا ہے۔

266- پانچ ربیع الثانی 1158ھ بمطابق 8 مئی 1745ء بروز ہفتہ۔

-267 عاقل بیگ کا ذکر مخلص کے ایک خط میں بھی ہے۔

-268 آٹھ ربیع الثانی 1158ھ بمطابق 11 مئی 1745ء بروز جمعہ۔

-269 پائندہ خان ولد میرک خان ولد پائی خان ولد شیخ شہاب الدین خان۔ یہ رشتے میں حافظ رحمت خان کا چچازاد بھائی ہوتا تھا۔ روہیلوں کے ابتدائی عہد میں اس نے بہت خدمات سرانجام دیں۔ سفرنامے میں اس کا کئی جگہ تذکرہ آیا ہے جس سے اس بات کی نشان دہی ہوتی ہے کہ وہ بہت اہم شخصیت تھا۔ روہیلوں کو بددل کرنے کے لئے ایک بار اس کے مرنے کی افواہ بھی اڑائی گئی تھی۔ الموڑہ میں فوج کشی میں بھی یہ شریک تھا۔ منتخب العلوم میں ہے کہ پائندہ خان نے بن گڑھ کی جنگ کے بعد قائم خان کی ملازمت کر لی تھی (اخبار الصناوید جلد اول) اس کے بعد پائندہ خان کے حالات نہیں ملتے۔ وہ یا تو قائم جنگ کے پاس ہی فوت ہو گیا ہوگا یا پھر روہیلوں سے واپس آن ملا ہوگا۔ البتہ روہیلوں کی تاریخوں میں نواب علی محمد کی وفات کے وقت ارکان دولت میں اس کا نام نہیں لیا جاتا جس سے ظاہر ہے کہ اس نے 1162ھ/ 1749ء سے قبل وفات پائی تھی۔

-270 فتح محمد خان: یہ نام مخلص نے تحریر کیا ہے۔ عرف عام میں فتح خان خانساماں کر کے مشہور تھے۔ روہیلہ قوم کی روایات کے مطابق یہ بچپن میں مسلمان ہوئے۔ ذات کے برہمن تھے۔ داؤد خان نے پرورش کی۔ علی محمد خان نے خانسامانی پر مقرر کیا۔ بہت نیک نام، دیندار اور وفادار تھے۔ حافظ رحمت خان کے خاص آدمی تھے۔ علی محمد خان کے پسران اللہ یار خان و مرتضیٰ خان و محمد یار خان کی پرورش انہوں نے ہی کی۔ تقسیم ملک کے وقت ان کو اوست، بدایوں، وکہر کنواں وغیرہ پرگنے ملے۔ اکثر مساجد و کنویں و مہمان سرائے بنائے جو تا حال موجود ہیں۔ 1177ھ میں آنولے میں انتقال کیا۔ احمد خان و عظمت خان و معظم خان و عظیم خان و محمد دلیر خان و محمد ذوالفقار خان ان کے بیٹے تھے۔ (نقش سلیمان ص 183)۔

-271 شاہ معصوم قوم کے سید تھے اور صاحب باطن بزرگ تھے۔ حافظ رحمت خان کے بہت قریبی ساتھی تھے۔ صلح کن تھے چنانچہ روہیلوں اور قائم جنگ کے درمیان جنگ میں صلح کی انہوں نے بہت کوشش کی تھی۔ حافظ رحمت خان نے اس کے ہاتھ پر بیعت بھی کی ہوئی

تھی۔ سعید معصوم بریلی میں قلعہ نومحلہ میں رہتے تھے۔ اب یہ قلعہ ختم ہو چکا ہے۔ البتہ اس کی عظیم الشان مسجد موجود ہے جس میں سید معصوم شاہ اور ان کے والد کے مزارات ہیں۔ (حیات حافظ رحمت خان ص 280)۔ سید احمد شاہ انہی سید معصوم کے والد تھے۔

272- نو ربیع الثانی 1158ھ بمطابق 12 مئی 1745ء بروز بدھ۔

273- جب آدمی کے لئے دنیا سیاہ ہو جائے۔
تو جو کچھ بھی (تدبیر) وہ کرے اس کے کام نہیں آ سکتی۔

274- رات کو ہم نے اس وقت ہاتھ سے یار کی زلف چھوڑ دی
جب امر کی انجام دہی میں طوالت دیکھی
ہم نے شراب نہیں پی اور بہار کا موسم گزر گیا
ہمارے ہاتھ سے بہار مفت میں ہی نکل گئی
تقدیر کے آگے عقل کی کچھ نہیں چلتی
خدا کی قسم! ہم نے اپنا اختیار ہی چھوڑ دیا
ہم زندگی سے اب اور کیا چاہیں
دلگی تھی اور یار چھوٹ گیا
صحرا کے کنارے فصل بہار دیکھ کر
ہم نے سیر و شکار کو داد دنیا چھوڑ دیا
دل سے عشق کا شعلہء بلند ہوا
ہم نے اس کے حصار کی ایک آگ چھوڑ دی
لیکن اس گرد خاک میں کیا فائدہ
کہ اس خاکسار مخلص کو چھوڑ دیا

275- دس ربیع الثانی 1158ھ بمطابق 13 مئی 1745ء بروز اتوار۔

276- اصل نسخے میں لفظ ''مسلمان'' ہے۔ ڈاکٹر اظہر نے متن میں ''مسلمانان'' درج کیا ہے اور ساتھ ہی اصل لفظ کی وضاحت کر دی ہے۔

277- بن گڑھ ایک قدیم قصبہ تھا جس کے اب بھی آثار باقی ہیں۔ یہ یوسف نگر گاؤں کے

قریب ہے۔ یہاں پر علی محمد خان نے اپنی حفاظت کی غرض سے قلعہ تعمیر کرایا تھا۔ بلکہ آنند رام کے بیان سے ظاہر ہے کہ یہاں پر چار قلعے تھے جو بعدازاں جنگ کے دوران اور کچھ جنگ کے بعد بادشاہ کے حکم سے مسمار کردیئے گئے۔ اس کے اردگرد گھنا جنگل تھا جو کہ حفاظت کا کام دیتا تھا۔ یہ بدایوں سے آنولے جانے والی سڑک کے پاس آباد ہے۔ (مرادآباد گزیٹیر ص 47-146 ڈاکٹر اظہر ص 57 حاشیہ 1)۔

278- عبدالمجید خان کو بارہ مئی 1739ء کو دیوان خالصہ شریفہ مقرر کیا گیا۔ پھر 15 فروری 1744ء کو اسے دیوان تن بھی مقرر کیا گیا۔ 2-1751ء بمطابق 1165ھ میں فوت ہوئے (سیر المتاخرین جلد دوم ص 3) (مآثر الامراء جلد سوم ص 708-707) اس کے لڑکے کا نام عبدالاحد خان تھا۔ اس کا ایک بھائی ابوالبرکات نامی بھی تھا۔

279- ''پوری'' روٹی کی طرح سے کھانے کی ہوتی ہے۔ ہندوؤں میں اس کے کھانے کا کثرت سے رواج تھا اور آج تک ہے۔ یہ ''حلوہ پوری'' کی پوری کی طرز کی ہوتی ہے مگر سائز میں دو یا تین نوالوں کے برابر ہوتی ہے اور گول ہوتی ہے۔

280- بعد میں مخلص نے اس نند و کو نکال دیا تھا۔

281- یعنی ارادہ ملتوی کردینے والے اور بہانہ تراشنے والے۔

282- بارہ ربیع الثانی 1158ھ بمطابق 15 مئی 1745ء بروز ہفتہ۔

تیرہ ربیع الثانی 1158ھ بمطابق 16 مئی 1745ء بروز اتوار۔

283- حکیم محمد یوسف عبدالشافی خان، صاحب علم وفضل تھے۔ طب اور نجوم میں بھی ماہر تھے۔ مخلص کے بہت گہرے دوست تھے۔ دربار میں بھی اثر ورسوخ رکھتے تھے (ڈاکٹر اظہر ص 58 حاشیہ 1)۔

284- سترہ ربیع الثانی 1158ھ بمطابق 20 مئی 1745ء بروز جمعرات۔

285- صفراوی یعنی پت کا بخار۔

286- چودہ ربیع الثانی 1158ھ بمطابق 17 مئی 1745ء بروز پیر۔

287- پندرہ ربیع الثانی 1158ھ بمطابق 18 مئی 1745ء بروز منگل۔

288- سولہ ربیع الثانی 1158ھ بمطابق 19 مئی 1745ء بروز بدھ۔

289- سترہ ربیع الثانی 1158ھ بمطابق 20 مئی 1745ء بروز جمعرات۔

290- پال کہتے ہیں "آم کو پکا کرنا" یعنی آم کو پکانا جو مٹی میں رکھ کر کیا جاتا ہے۔

291- اٹھارہ ربیع الثانی 1158ھ بمطابق 21 مئی 1745ء بروز جمعہ۔

291A- بھیر کا لفظی مطلب ہجوم ہے مگر یہاں پر مراد سرکاری محکمہ جات اور اس کے ملازمین سے ہے۔

292- یعنی لشکر کا اگلا حصہ۔

293- دوندے خان ابن حسن خان ابن محمود خان ابن شہاب الدین قوم بڑیچ پٹھان۔ دوندے خان حافظ رحمت کا چچا زاد بھائی تھا۔ 1117ھ/1705ء میں پیدا ہوا اور 3 محرم 1184ء میں 67 سال کی عمر میں قصبہ بسولی میں فوت ہوا اور وہیں دفن ہوئے۔ محب اللہ خان و فتح اللہ خان و عظیم اللہ خان تین لڑکے چھوڑے جو صاحب اولاد ہوئے۔ دوندے خان ایک تعلیم یافتہ شخص تھا اور حافظ رحمت خان کا زور بازو تھا۔ روہیلہ تاریخ میں اس نے زبردست کردار ادا کیا جیسا کہ آنند رام کے سفرنامے سے بھی ظاہر ہے۔ چونکہ اس کی اولاد نے تاریخ نویسی پر کوئی توجہ نہیں دی اور حافظ رحمت خان کی اولاد نے تاریخ نویسی پر توجہ دی۔ لہٰذا تاریخ میں دوندے خان کا کردار نظروں سے اوجھل ہو گیا جبکہ حافظ رحمت کا نمایاں ہو گیا۔ اگرچہ دوندے خان کا کردار حافظ رحمت خان سے زیادہ نہیں تھا مگر اس سے کم بھی نہیں تھا۔ تاریخ میں اس کے کردار پر بہت کچھ تحریر کرنے کی ضرورت ہے۔ دوندے خان مراد آباد کا گورنر (عہد روہیلہ میں) بھی رہا تھا۔ اس کی اولاد مراد آباد میں آج بھی آباد ہے۔

294- موضع بسی دراصل موضع بسولی ہے۔ یہ ضلع بدایوں میں شامل ہے۔ روہیلوں کا مضبوط مرکز رہا ہے۔ دوندے خان کی جاگیر تھی اور وہیں پر دوندے خان دفن ہے۔

295- اس سے ظاہر ہے کہ فوج نے لوٹ مار بھی راستے میں کی تھی۔

296- "اکاسی دیہ" میں آکاش (آسمان) سے اکاس بنا اور دیہ سے مراد دیا (چراغ) ہے یوں "اکاسی دیہ" سے مراد "آسمانی چراغ" ہے۔ یہ بانس شاید بہت زیادہ طویل ہوگا۔ آئین اکبری کے مطابق چالیس گز سے بھی طویل ہوتا ہے اور سولہ رسیوں سے باندھ کر

کھڑا کیا جاتا ہے (ڈاکٹر اظہر ص 61 حاشیہ 3)۔

297- انیس ربیع الثانی 1158ھ بمطابق 22 مئی 1745ء بروز ہفتہ۔

298- بیس ربیع الثانی 1158ھ بمطابق 23 مئی 1745ء بروز اتوار۔

299- بائیس ربیع الثانی 1158ھ بمطابق 25 مئی 1745ء بروز منگل۔

300- تئیس ربیع الثانی 1158ھ بمطابق 26 مئی 1745ء بروز بدھ۔

301- سید شہادت خان بارھہ کے حالات معلوم نہ ہو سکے۔ ڈاکٹر اظہر کا خیال ہے کہ اس کے نام کے ساتھ مخلص نے جو ''عوالی منزلت'' کا فقرہ استعمال کیا ہے۔ اس سے مراد یہ ہے کہ یہ کوئی خاص آدمی ہوں گے۔

302- منشات مخلص میں اس محلے کا نام وکیل پورہ لکھا تھا۔

303- راکٹ یا آتش فشاں بان ہندوستان کی ایجاد ہیں جہانگیر اور شاہجہان کے دور میں بھی بڑے ''بان'' استعمال ہوتے تھے۔ اغلب امکان ہے کہ موجودہ شکل میں ''بانہائی آتشین'' افغانوں کی ایجاد ہیں۔ افغانوں نے یہ مرہٹوں کے خلاف بھی 1761ء میں استعمال کئے تھے۔ جدید راکٹ کا سب سے پہلا تذکرہ روہیلوں کی جنگ بن گڑھ میں ملتا ہے۔ ٹیپو سلطان نے انگریزوں کے خلاف استعمال کر کے انہیں سخت نقصان پہنچایا۔ جس کے بعد انگریز وہی راکٹ یورپ لے گئے اور ان میں اصلاحات کر کے بنانا شروع کر دیا۔ یہی راکٹ آگے چل کر میزائل کی بنیاد بنے۔

(ڈاکٹر اظہر: مقدمہ: ص 106 و 107؛ انسائیکلو پیڈیا برٹانیکا مضمون ''راکٹ'')

304- چوبیس ربیع الثانی 1158ھ بمطابق 27 مئی 1745ء بروز جمعرات۔

305- رہکلہ چھوٹی توپ کو کہتے ہیں۔

306- ''بانہائے آتش فشاں'' کے علاوہ مخلص نے اس جگہ پر دوسرا لفظ ''بانہائی جنگی'' استعمال کیا ہے۔

307- اروِن، اول، نے صفحہ 197 پر درج کیا ہے کہ ''مرزا مقیم عبدالمنصور صفدر جنگ ہراول پر حاکم تھا۔ ایک رات پٹھانوں نے شب خون مارا اور صفدر جنگ کے مورچے پر آن پڑے اور بہتوں کو تہ تیغ کیا۔'' اس جملے میں عبدالمنصور کی جگہ ابوالمنصور ہونا چاہئے۔

308- مدن بان: مدن ایک پھول کا نام ہے۔ اس سے مراد ہے وہ تیر (مدن بان) ہے جو عشق کا دیوتا چھ، سات پھولوں سے ملا کر بناتا ہے اور معشوق پر چلا کر اسے عشق میں مبتلا کر دیتا ہے۔ (ڈاکٹر اظہر ص 65 حاشیہ 1)۔

309- یعنی چراغ بجھانے کے بعد اس کی لَو اٹھ رہی تھی۔

310- طلایہ اس فوج یا دستہ کو کہتے ہیں جو رات کو لشکر میں پہریداری کرتی ہیں۔

311- پچیس ربیع الثانی 1158ھ بمطابق 28 مئی 1745ء بروز جمعہ۔

312- قندھار جنوبی افغانستان کا ایک مشہور شہر ہے۔ احمد شاہ ابدالی کا دارالحکومت تھا۔ یہاں پر پٹھان کثرت سے ہیں۔ مغلوں نے کئی بار اس پر قبضے کی کوشش کی۔ کبھی کامیاب ہوئے اور کبھی ناکام۔ شاہجہان کے دور میں مغلوں کے ہاتھ سے نکل گیا اور پھر کبھی واپس نہ آیا۔ یہ شہر ہندوستانیوں اور ایرانیوں کے درمیان ہمیشہ باعث نزاع رہا۔ اس کا قلعہ بہت مضبوط تھا اور بہت ہی مشکل سے سر ہوتا تھا۔ جس کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ قندھار کے پاس دور دور تک کوئی شہر وغیرہ نہ تھا جس سے حملہ آور کو خوراک و رسد کی قلت رہتی تھی اور اسے محاصرہ اٹھانا پڑتا تھا۔ بن گڑھ میں بھی چونکہ پٹھان تھے لہٰذا اسے قندھار سے تشبیہ دی گئی کیونکہ وہ بھی بہت مضبوط پناہ گاہ تھی۔

313- عمادالسعادت میں ہے کہ یہ جنگل کسی فولادی قلعے سے کم نہیں تھا اور توپ کا گولہ بھی اس میں کام نہیں آتا تھا۔

314- چھبیس ربیع الثانی 1158ھ بمطابق 29 مئی 1745ء بروز ہفتہ۔

315- ملکہ زمانی فرخ سیر کی بیٹی اور محمد شاہ بادشاہ کی پہلی بیوی تھی۔ 9 دسمبر 1721ء کو اس کی بادشاہ سے شادی ہوئی تھی۔ اس کی خالہ زاد بہن صفیہ کی بیٹی صاحبہ محل بھی محمد شاہ کی بیوی تھی۔ ان کے بھی افغانوں سے تعلقات تھے۔ یہ دونوں بیگمات ہندوستانی حالات سے بددل ہو کر احمد شاہ ابدالی کے ہمراہ چلی گئیں تھیں مگر بعدازاں واپس آ گئیں۔ ان کا سیاست میں بڑا اثر و رسوخ تھا۔ (سیدالمتاخرین جلد دوم ص 55، نادرات شاہی، مطبوعات رام پور، دیباچہ ص 6)۔

316- نائب صوبیدار نول رائے، قوم سکسینہ کائستھ، حکود خاندان سے تھے۔ اٹاوہ کے موروثی

قانون گو تھے۔ پہلے نواب برہان الملک صوبہ دار اودھ کے منشی رہے۔ صفدر جنگ نے قابلیت کی وجہ سے مہاراجہ کا خطاب دیا۔ اودھ کا سارا نظم ونسق سنبھالتے تھے۔ قیام و مکان قنوج میں تھا۔ بہت مالدار تھے۔ (سیر المتاخرین جلد دوم ص 11 و 29، عماد السعادت ص 43، آرون جلد دوم) نول رائے احمد خان بنگش کی مہم میں 13۔اگست 1755ء کو مارے گئے۔ (مآثر الامراء جلد سوم ص 3-772)۔
اس کے قتل پر ایک بھاٹ مسمی بھولے نے احمد خان بنگش کو ایک گیت سنایا تھا جو درج ذیل ہے:

عجب وہ صاحب قدرت ہے جس نے جگ سنوارا ہے
خدائے پاک مولا ہے وہی پروردگارا ہے
کھڑا باندھا کمر کس کر غنیم اوپر لئے لشکر
لگے اس کے عجب چکر غروری کا خمارا ہے
نول سے مرد غازی کو، نہ پوچھے بات پاجی کو
نول سے مرد غازی کو، پہنچ گولی سے مارا ہے
نول ہودے سے مکھ موڑا، کہیں ہاتھی کہیں گھوڑا
قبائل بھی کہیں چھوڑا، نہ سر چیرہ سنبھارا ہے
چلیں توپیں دھڑا دھڑ سے، رھکلے بھی بڑا بڑ سے
شتر نالیں پڑا پڑ سے، تہور کا پہاڑا ہے
چلیں تیریں سنا سن سے، چلیں گولی منا من سے
کٹیں بکر جھنا جھن سے، پڑی تلوار دھارا ہے
بھبوتی نام ہے میرا، عطائی پور میں ڈیرا
یہی ہے مئو کا کھیڑا، تلے گنگا کنارا ہے

(آرون جلد دوم ص 23)

317- یہ محض افواہ نکلی۔

318- اس کے حالات معلوم نہ ہو سکے۔ ہر امیر اپنے محکمے کا انتظام بھی ایسے ہی کیا کرتا تھا جس

طرح سے سلطنت کا انتظام ہوتا تھا۔اس کے ماتحت افسراوران کے ماتحت مزید افسرہوا کرتے تھے۔

319- ''کیا ہی اچھا ہو کہ ایک کرشمے سے دو کام ہو جائیں۔''

320- ستائیس ربیع الثانی 1158ھ بمطابق 30 مئی 1745ء بروز اتوار۔

321- حوضہ ہائے آہنی سے مراد زرہ بکتر ہے جس پر تیر و تلوار کا اثر نہیں ہوتا۔یعنی امراء نے خود کو زرہ بکتر سے اچھی طرح ڈھانپ لیا ہوگا۔

322- سن 1151ھ بمطابق 39-1738ء۔

323- قزلباش سے مراد نادر شاہ درانی ہے جو ایران کا بادشاہ تھا۔

324- یعنی نادر شاہ نے ہندوستان کو خوب لوٹا اور دہلی کا قتل عام تو مشہور ہے۔

325- ہمایوں یعنی بادشاہ کے ساتھ بیٹھا ہے۔حالانکہ اس کو میدان جنگ میں ہونا چاہئے۔

326- یعنی زمانے کی ہوا لگ گئی۔

327- یعنی عیش پسند ہو گئے۔

328- تو اپنے اچھے کام کی بلندی سامنے سے لے جا ورنہ نادانستہ کام مشورہ تو یہ ہے کہ کیا کریں؟

329- اٹھائیس ربیع الثانی 1158ھ بمطابق 31 مئی 1745ء بروز پیر۔

330- رام نارائن کن کٹا کا باپ آتما رام تھا جو ھنڈون و بیانہ کا فوجدار تھا۔ذات کا مہتہ کھشتری تھا اور بھیروں وال کا ساکن تھا۔وہ نواب برہان الملک کا دیوان مقرر ہوا۔اس کے تین لڑکے تھے۔اول ہر نارائن دوم رام نارائن جو صفدر جنگ کا دیوان تھا۔سوم پرتاپ نارائن جو پرتاپ سنگھ کر کے مشہور تھا۔رام نارائن کے دو لڑکے تھے ایک مہاراجہ نارائن جو جنگ بکسر سے قبل شجاع الدولہ کا دیوان تھا۔دوسرا ہردے نارائن۔رام نارائن کا ایک کان کٹا ہوا ہوگا جو مخلص نے اسے ''بریدہ گوش'' تحریر کیا ہے (ڈاکٹر اظہر ص 71 حاشیہ 2)۔

331- انتیس ربیع الثانی 1158ھ بمطابق یکم جون 1745ء بروز منگل۔

332- جمدۃ کے معنی وزیر کے ہیں اور جمدۃ الملک سے مراد وزیر اعظم ہے۔اگرچہ جمدۃ الملک کا خطاب وزیر الممالک کو نہیں ملا تھا اور نہ ہی کبھی کسی اور کو اس سے قبل ملا تھا۔مگر مخلص نے

351- ''جوئے باز سے جو کچھ چھینا وہ حاضرین جوا خانہ کو بطور انعام دیا جاتا تھا۔''

352- ''وفادار دوست اور ہم دل شجاع۔''

353- چار جمادی الاول 1158ھ بمطابق 5 جون 1745ء بروز ہفتہ۔

354- پانچ جمادی الاول 1158ھ بمطابق 6 جون 1745ء بروز یک شنبہ یعنی اتوار۔

355- چھ جمادی الاول 1158ھ بمطابق 7 جون 1745ء بروز پیر۔

356- تبر دار یعنی کلہاڑا اچلانے والے یا لکڑ ہارے۔

357- فرید الدین خان، سابق گورنر مراد آباد عظمت اللہ خان مراد آبادی کا بیٹا تھا۔

358- عظمت اللہ خان مراد آبادی ابن عصمت اللہ خان، لکھنو کے شیخ فاروقی خاندان سے تعلق رکھتا تھا۔ وہ بہت عرصہ مراد آباد کا گورنر رہا۔ اس کا باپ عصمت اللہ بھی اورنگ زیب کے دور میں یہاں کا گورنر رہا تھا۔ عظمت اللہ کے داؤد خان روہیلہ سے گہرے تعلقات تھے۔ داؤد خان ایک بار اپنے مالک کے ایماء پر عظمت اللہ کے مقابلے پر آیا مگر عظمت اللہ سے درون خانہ سازش پر اسے مضبوط کیا نتیجتاً اس کے مالک نے داؤد خان کو قتل کرا دیا۔ علی محمد خان اور باقی ماندہ روہیلے بعد ازاں عظمت اللہ خان کی ملازمت میں آ گئے اور کافی عرصے اس کے ساتھ رہے۔ عظمت اللہ خان نے ان کی حوصلہ افزائی کی اور جاگیریں عطا کیں تھیں۔

359- عہد اکبری میں ایک کروڑ دام وصول کرنے والا کروڑی کہلاتا تھا۔ بعد ازاں یہ ''کروڑہ'' ہو گیا۔ ''بازار کے سربراہ'' کے لئے مخلص نے فارسی میں لفظ ''کروڑہ گنج'' استعمال کیا ہے۔

360- بنجارے اکثر لشکروں کے ساتھ رہتے تھے۔ نرخ گھٹانے بڑھانے میں انہیں بہت دخل حاصل تھا۔ یہ سراغ رسانی و خبر رسانی کا کام بہت تیزی اور خوش اسلوبی سے کیا کرتے تھے۔ عبدالرحیم خان خاناں کی فتح کی خبر بادشاہ اکبر کو انہی کے ذریعے سے معلوم ہوئی تھی۔

361- سیر المتاخرین سے ثابت ہے کہ ''ملازمین کو قلعے میں مال و اسباب کی ضبطی پر مقرر کیا گیا۔ خوراک کا ذخیرہ...... بہت زیادہ ہاتھ آیا۔ کچھ چھوٹی توپیں اور اشیاء تھیں...... اس کے

علاوہ اور کچھ نہیں تھا۔ تھوڑا بہت جو قائم خان کے پاس رکھایا گیا تھا وہ ظاہر ہو گیا اور شاہی خزانے میں داخل کر لیا گیا۔

362- یعنی وزیر المما لک۔

363- قائم خان سے علی محمد خان کو اس بناء پر الگ کر دیا گیا کہ دونوں ہم قومی کی بناء پر کوئی نئی مشکل نہ کھڑی کر دیں اور تسلی کے لئے قائم خان کو ''قائم الدولہ'' کا خطاب دیا گیا۔

364- سات جمادی الاول 1158ھ بمطابق 8 جون 1745ء بروز منگل۔

365- تجھ سے دور ہو کر دل خانہ خراب کی جلن
میں عجیب کیفیت ہے، اے پھول، جلدی کر
میرا جگر جل رہا ہے اور میری آنکھوں سے
چراغ کی مانند پانی بہہ رہا ہے۔

366- چتر بھوج سے مراد دیوان ہے۔ یہ شخص راجہ جگل کشور کا دیوان ہوگا۔

367- جگل کشور قوم کا بھاٹ تھا اور دہلی میں مہابت جنگ صوبیدار بنگال کی جانب سے وکیل تھا۔ قائم جنگ کے مارے جانے کے بعد صفدر جنگ کی طرف فرخ آباد کا علاقہ لینے لگا مگر احمد خان بنگش کی سازش سے اپنے ہی ہاتھی تلے آ کر مارا گیا۔ (آرون، دوم ص 97) کنور پریم کشور فراقی جو خطاطی میں یکتا تھے ان ہی کے پوتے تھے۔ (ڈاکٹر اظہر ص 83 حاشیہ 2+3)۔

368- آٹھ جمادی الاول 1158ھ بمطابق 9 جون 1745ء بروز بدھ۔

369- ''انوپ شہر'' دریائے گنگا کے مشرقی کنارے پر بلند شہر سے 25 میل مشرق میں ہے۔ ضلع بلند شہر لگتا ہے۔ یہ بہت مشہور تجارتی منڈی رہی ہے۔ 1901ء میں اس کی آبادی 8601 افراد پر مشتمل تھی۔ انوپ شہر جہانگیر کے دور میں بارگوجر قوم کے راجہ انوپ رائے نے بسایا تھا۔ تزک جہانگیری میں جہانگیر نے س راجہ کی بہادری کا تذکرہ کیا ہے۔ اس کی اولاد تا حال وہاں پر موجود ہے۔ احمد شاہ ابدالی نے 1757ء میں اسے چھاؤنی مقرر کیا تھا۔ اور پانی پت کی جنگ کے لئے مسلمانوں کی صف بندی اسی جگہ طے پائی تھی۔

(بلند شہر گزیٹیر ص 183-179)۔

370- نو جمادی الاول 1158ھ بمطابق 10 جون 1745ء بروز جمعرات۔

371- تال سے مراد تالاب ہے۔ کٹورہ وہ برتن ہوتا ہے کہ جس میں پانی پیتے ہیں۔ یہاں پر تال کٹورے سے مراد ایسے موزوں و متناسب تالاب سے ہے جو کٹورے کی طرح سے لبالب بلکہ قدرے بلندی پر ہو۔ نئی دہلی میں ایک علاقہ ایسا بھی ہے جہاں محمد شاہ بادشاہ شکار کیا کرتا تھا اور اس علاقے کا نام تال کٹورہ تھا۔

372- رانوٹی یا راوٹی چوکور شکل کے چھوٹے خیمے کو کہتے ہیں۔

373- ''قلندری'' ایک مومی کپڑا ہوتا ہے جس کو خیمے کے اوپر ڈال دیتے ہیں جس کی وجہ سے خیمہ بارش کے پانی اور سورج کی تپش سے محفوظ رہتا ہے۔

373A- مخلص کے پوتے کا نام ہے۔

374- بارہ جمادی الاول 1158ھ بمطابق 13 جون 1745ء بروز اتوار۔

375- تیرہ جمادی لاول 1158ھ بمطابق 14 جون 1745ء بروز پیر۔

376- مخلص نے لفظ ''مارو'' ہی استعمال کیا ہے یعنی ایسا بینگن جس نے جھگڑا کھڑا کر دیا اور نوبت مار پیٹ پر آ گئی۔

377- چودہ جمادی الاول 1158ھ بمطابق 15 جون 1745ء بروز منگل۔

378- موضع نگلی کا قابل ذکر شہر غالباً جدید دور میں ''ناگلہ بل'' نامی دیہات ہے۔ یہاں پر پٹھان بہت آباد ہیں۔ (بلند شہر گزیٹر ص 272)۔

379- پندرہ جمادی الاول 1158ھ بمطابق 16 جون 1745ء بروز بدھ۔

380- رائے صاحب مجلس کے باپ نواب قمر الدین وزیر الممالک کے بخشی تھے۔ ان کا نام بھی مجلس رائے ہی تھا۔ نادر شاہ نے ان نے زر کثیر طلب کیا۔ نہ دے سکنے کے باعث خودکشی کر لی۔ (ڈاکٹر اظہر ص 93 حاشیہ 1)۔

381- اے چاند، نکل آ، ہم انتظار میں ہیں۔

382- اے سرو، آ جا، ہم انتظار میں ہیں
کھڑے ہو کر آ جا، ہم انتظار میں ہیں
آج کی رات چھت (آسمان) کے کنارے جلوہ ظاہر کر

اے چاند، آ جا، ہم انتظار میں ہیں
اے پھول، خواب نامے سے نواز
ابھی دیر ہے، ہم انتظار میں ہیں
بادل نہیں ہے، کوئی رکاوٹ نہیں ہو سکتی
اے فیض ہوا، ہم انتظار میں ہیں
تیرا چہرہ (دیکھے) بغیر، باغ کی تفریح کرنا کفر ہے
جلد آ جا، خدا کی قسم، ہم انتظار میں ہیں
بادل اور رات اور موج کا خطرہ، اے خدا!
اپنا فضل دکھا کہ ہم انتظار میں ہیں
مخلص، تیری بات ذوق والی ہے
اپنا دیوان (شاعری کا) کھول دے، ہم انتظار میں ہیں

-383 ماہتابی سے مراد وہ چھوٹی سی عمارت ہے یا بارہ دری ہے جو کسی حوض یا نہر کے کنارے چاندنی کی سیر کے لئے بناتے ہیں۔ یہاں یہ خیمے کے لئے استعمال ہوا ہے۔ (فیض اللغات فارسی ص509)۔

-384 صحرا میں پھرنے والوں کی ضروریات کے مالک، کشتی
کبھی کبھی دریا کے اس کنارے نظر آتی ہے
کس طرح سے تو کامیاب ہو یا جا سکتا ہے
کیونکہ نہ تو طاقت اور نہ ہی آہ و زار اور نہ ہی پیسے (کے لالچ) سے (کشتی) ادھر آتی ہے۔

-385 صاف آسمان کا صفحہ بالکل بے قیمت ہے
اس پر کوئی یادگار بات تحریر کر دے۔

-386 ''کشتی''، یعنی پہلوان زور آزمائی کرتے ہیں جسے کُشتی (ک پر پیش کے ساتھ) کہتے ہیں۔ یہاں مراد بحث و تکرار اور دھکم پیل ہے۔

-387 کبت، ہندی زبان میں شاعری کو کہتے ہیں۔

کئی جگہ اس لفظ کو استعمال کیا ہے جس سے ظاہر ہے کہ وزیر الممالک اس نام سے مشہور بھی تھا۔

333- راجہ خوشحال چند قوم کا کائیستھ تھا۔ نادر شاہ درانی نے اس سے پونے تین لاکھ روپیہ وصول کیا تھا۔ اس کا لڑکا گلاب رائے تھا۔

334- شاہی گولے ایک من آٹھ سیر اور ایک من سولہ سیر کے ہوتے تھے (آئین اکبری; بدائع وقائع سال بست وششم) اس سے ظاہر ہے کہ روہیلوں کے گولے دور تک مار نہیں کرتے تھے کیونکہ وہ، شاید زیادہ سے زیادہ پانچ سیر کے ہوتے تھے۔

335- اس جگہ ایک تصویر تھی جو مخلص کے ایک ملازم گووردھن نے بنائی تھی وہ بہت اچھا مصور تھا۔ رام پور کے نسخے سے یہ تصویر کسی شخص نے پھاڑ لی تھی۔ پنجاب یونیورسٹی کے نسخے میں بھی یہ تصویر نہیں ہے۔ خیال ہے کہ اس تصویر میں بہت سی تفصیلات دکھائی گئی تھیں۔

336- یعنی بادشاہ کی حکمرانی کے اٹھائیسویں سال کے جمادی الاول بمطابق جون 1745ء کے حالات۔

337- یکم جمادی الاول 1158ھ بمطابق 2 جون 1745ء بروز بدھ۔

338- قائم خان اور علی محمد کے تعلقات بہت قدیم اور گہرے تھے۔ دونوں کا تعلق روہیلہ گروہ سے تھا البتہ قائم خان روہیلہ کی جگہ بنگش لفظ زیادہ استعمال کرتے تھے۔ خیال ہے کہ قائم خان نے علی محمد سے اندرونی سازش بھی کی تھی اور وزیر الممالک کا جھکاؤ بھی اس کی جانب تھا۔ علی محمد کے اہل خانہ قائم خان کے رسالدار شجاعت خان کے پاس مئو میں تھے۔

339- دیگر امراء (عمدہ دیگر) کا نام حذف کر کے مخلص نے وزیر الممالک کی کارگزاری نمایاں کرنے کی کوشش کی ہے۔

340- دو جمادی الاول 1158ھ بمطابق 3 جون 1745ء بروز جمعرات۔

341- تین جمادی الاول 1158ھ بمطابق 4 جون 1745ء بروز جمعہ۔

342- جانثار خان بہادر کا اصل نام سید عباس خان تھا۔ وہ سید علی عرف نجیب علی خان ولد ابن میر ابوالخیر علی خان الکابلی حسینی کا بیٹا تھا۔ 1161ھ میں فوت ہوا۔ اس کے نانا کا نام شجاعت خان ابن جانثار بہادر تھا۔ جو 1069ھ میں فوت ہو گیا تھا۔ اپنے وقت کے شجاعوں میں

شامل تھا۔ یہ وزیر الممالک کے ساتھ احمد شاہ ابدالی کے حملے میں مارا گیا۔ اس وقت اس کی عمر 70 سال سے زیادہ تھی۔ (ڈاکٹر اظہر ص 75-76 حاشیہ 3)۔

343- یعنی بالغ نہ ہوئے تھے۔

344- متبنیٰ لڑکے کا تذکرہ قابل غور ہے۔ داؤد خان گو کے پٹھان تھا مگر وہ شاہ عالم خان کا متبنیٰ تھا۔ داؤد خان کے دو متبنیٰ تھے اول فتح محمد خان ذات برہمن جسے بچپن میں داؤد خان نے مسلمان کر کے اس کی پرورش کی۔ دوم علی محمد خان جسے بھی بچپن میں پال کر مسلمان کیا۔ اس کی قوم جاٹ تھی۔ علی محمد خان نے بھی راجہ کمایوں کے قبیلے کے ایک لڑکے کو متبنیٰ کیا جیسا کہ آنند رام کے بیان سے ظاہر ہے۔ اس کو بھی مسلمان کر لیا ہوگا۔ دیگر تاریخوں میں البتہ اس کا ذکر نہیں ملتا۔ اس بات پر تحقیق مزید کی ضرورت ہے کہ یہ متبنیٰ جس کا مخلص نے خصوصیت سے ذکر دیا ہے کون تھا۔ آیا وہ علی محمد کے 6 بیٹوں میں سے ہی ایک تھا یا پھر کوئی اور تھا جو مرور زمانہ سے گم نام ہو گیا۔

345- قائم جنگ اور روہیلوں کے درمیان ہم قومیت پر اتحاد قائم ہونے کا ایک اور ثبوت اس بات سے بھی ملتا ہے۔

346- شہر اور میدان کو حسرت بھری نگاہ سے آہ (کہتے ہوئے) وداع کیا۔
وہ اس طرح سے جاتا ہے کہ جیسی کوئی ناصح دنیا سے جاتا ہے۔

347- احمد زمان خان بہادر طالب جنگ سے مراد قائم جنگ کا بھائی احمد خان بنگش ہے۔ اور محمد عطاء خان سے مراد عطا اللہ خان برادر قائم جنگ ہے۔ کیونکہ ابھی علی محمد قائم جنگ کے ڈیرے سے نکلا ہی ہے جہاں پر قائم جنگ کے بھائی وغیرہ تھے۔

348- حدیقۃ الاقالیم میں حلیہ یوں درج ہے کہ:

> ''سفید رنگ کا آدمی ہے، قد درست ہے اور جسامت متوسط ہے۔ اس کی داڑھی تین انگلیاں لمبی ہے اور مونچھیں ہونٹ تک تراشی ہوئی ہیں۔ آنکھوں میں سرمہ لگایا ہوا اور سفید لباس پہنا ہوا ہے۔''

349- اللہ یار بلگرامی نے بھی کچھ ایسا ہی حال حدیقۃ الاقالیم میں درج کیا ہے۔

350- راوٹی، مربع طرز کے چھوٹے سائز کے خیمے کو کہتے ہیں۔

388- پنڈت کیلاش چندر رام پوری کے مطابق مخلص سے اس کبت میں سہو ہوا ہے۔ ان کے نزدیک کبت یوں ہونا چاہئے۔

''ہاہا کرت، اودھو، آوت ہے ھیو، بندھو اجھون کہو جائے تہاتن میرے کی
گوکل توتج دینی، متھر اسنکلپ کینی، بندرابن سونہہ، یعنی بھولے سُدھ کھیرے کی
کہت کوی دیبندر، رہت اچاٹ ہم جب سودھے آوت برہ کے بسیرے کی
پیت کی چڑھائے ناؤ، کاٹی دینی منجھار کتنی برج ناتھ، کدھون تھلکی نہ تیرے کی۔
(ڈاکٹر اظہر صفحہ 97 حاشیہ 2)۔

389- اس پانی کے گرداب میں ہزار کشتی بیچنا چاہیں
مگر کنارے پر کوئی تختہ بھی نہیں ملتا

390- مخلص کے محلے کا نام وکیل پورہ تھا۔

391- اٹھارہ جمادی الاول 1158ھ بمطابق 19 جون 1745ء بروز ہفتہ۔

391A- خربوزے کی طرح کا ایک میٹھا پھل ہوتا ہے۔

392- گجرولہ ایک دیہات ہے جو مراد آباد شہر سے 33 میل دور ہے۔ یہ تحصیل حسن پور ضلع مراد آباد میں ہے اور تجارتی منڈی رہی ہے۔

392A- یعنی نگران یا افسر۔

393- کٹرہ مخلدار خان کے پاس ان مجلس رائے کا ایک باغ تھا۔ (اورینٹل کالج میگزین نومبر 1941ء صفحہ 121)۔

394- اصل فارسی یوں ہے کہ:

''نور چشم قدم رنجہ نمودہ میرزای مذکورہ کہ ریش و بروت تراشیدہ جوان ہندوستان زای بک ہندی بودہ، ملاقات نمودند۔''

395- خواجہ مسرور، امیر الامراء خان دوران کا خواجہ سرا تھا۔ جیسا کہ سیاق سے ظاہر ہے۔ خان دوران اس دور کا امیر الامراء تھا۔ جس کی بیٹی کا نکاح یکم رمضان 1153ھ/20 نومبر 1740ء بروز دو شنبہ۔ اعتمادالدولہ وزیر کے بڑے بیٹے انتظام الدولہ سے ہوا (سیر المتاخرین، جلد دوم ص 4)۔

396- سید جمیل الدین خان، فرخ سیر کے عہد کے میر جملہ نواب معظم خان خانخاناں کا داماد تھا۔ اور سیاست میں کافی اثر و رسوخ رکھتا تھا (مآثر الامراء، جلد دوم ص 107 اور 52-851، جلد سوم ص 890)۔

397- ''تو بیٹھ، دشمنوں کے ساتھ مجلس گرم کر کیونکہ میں تو چلا۔''

398- پھل کا نام۔

399- تو سن لے ایک محمود غزنوی نے ایک رات
عیش کیا اور اس کی ساری رات پوستین (نرم ریشمی کپڑا) میں گزری۔
ایک فقیر نے وہ رات تنور کے کنارے گزاری۔
تنور کی رات اس ضرورت مند نے برہنہ گزاری۔
صبح اس نے نعرہ بلند کیا اور کہا کہ ''اے محمود!
پوستین کی رات بھی گزر گئی اور تنور کی رات بھی گزر گئی۔''

400- انیس جمادی الاول 1158ھ بمطابق 20 جون 1745ء بروز اتوار۔

401- تکری یا تگری تحصیل حسن پور ضلع مراد آباد میں ایک گاؤں ہے اور مراد آباد شہر سے 38 میل دور ہے۔ یہ عہد اکبری میں پرگنہ تگری کا صدر مقام تھا۔ یہاں پر تگا قوم کی آبادی تھی جس کے نام پر دیہات کا نام پڑ گیا۔

402- عبدالصمد خان یعنی زکریا خان جو سابق گورنر کا بیٹا تھا اور خود بھی گورنر تھا اور اعز الدولہ و حیات اللہ خان کا باپ تھا۔ زکریا خان وزیر الممالک کی بہن کا شوہر تھا۔ اس کے حالات اس سفرنامے کی ابتداء میں ایک حاشیے میں بیان ہو گئے ہیں۔ بیگم صاحب محل سے مراد غالباً زکریا خان کی بیگم اور وزیر الممالک کی بہن مراد ہے۔

403- بیس جمادی لاول 1158ھ بمطابق 21 جون 1745ء بروز پیر۔

404- خرک فارسی میں گدھے کو کہتے ہیں۔ خرکلہ سے مراد غالباً چھوٹا گدھا ہے۔ (فیض اللغات فارسی ص 181)۔

405- ''بھڑوے'' گالی ہے جس کے معنی ''بہن کو کرائے پر چلانے والا'' ہیں۔ فارسی میں اس کے لئے لفظ ''مردکہ ها'' استعمال ہوا ہے۔

406- بائیس جمادی الاول 1158ھ بمطابق 23 جون 1745ء بروز بدھ۔

407- غازی نگر اس سے مراد آج کا غازی آباد ہے۔ غازی آباد کو پہلے غازی نگر بھی کہتے تھے اور غازی الدین نگر بھی کہتے تھے۔ مخلص نے دونوں نام استعمال کر دیئے ہیں۔
غازی آباد 1740ء میں وزیر غازی الدین نے بسایا جو آصف جاہ کا بیٹا تھا اور حاکم دکن صلابت جنگ کا بھائی تھا۔ پہلے اسے غازی الدین نگر کہتے تھے مگر ریلوے شروع ہوئی تو اس کا نام مختصر کر کے "غازی آباد" کر دیا گیا۔ غازی الدین کی تعمیر کردہ ایک سرائے بھی یہاں پر موجود ہے۔ (میرٹھ گزیٹیر)

408- دریائے ہیندن ایک بڑا دریا ہے جو میرٹھ، بلند شہر اضلاع کو سیراب کرتا ہے اور بعد ازاں دریائے جمنا میں مل جاتا ہے۔ اس کو کالی ندی بھی کہتے ہیں۔

409- سرائے بسنت کے نام سے ظاہر ہے کہ کسی بسنت نامی شخص کی سرائے ہوگی۔

410- غازی الدین نگر یعنی آج کا غازی آباد دیکھئے حاشیہ نمبر 407۔

411- تیئس جمادی الاول 1158ھ بمطابق 24 جون 1745ء بروز پنج شنبہ (جمعرات)۔

412- قیاس ہے کہ اس سے "گنج شاہدرہ" یا "دلی شاہدرہ" مراد ہے۔

413- اورینٹل کالج میگزین نومبر 1941ء صفحہ 121 پر درج ہے کہ "میں نے رائے کرپا رام اور...... رائے فتح سنگھ و برادر مہربان لالہ لچھی رام اور عزیز القدر کشمیری مل وغیرہ دوستوں کو روانہ کر دیا۔"

414- سلخ (30) جمادی الاول 1158ھ بمطابق یکم جولائی 1745ء بروز پنج شنبہ (جمعرات)

415- بارہ رمضان المبارک 1158ھ بمطابق 10-اکتوبر 1745ء بروز یک شنبہ (اتوار) یہاں مخلص سے سہو ہوا ہے اور اتوار کی جگہ شنبہ یعنی ہفتہ پڑھنا چاہئے۔

416- 9 رمضان المبارک 1158ھ بمطابق 6-اکتوبر 1745ء بروز چہار شنبہ (بدھ)۔

❁❁❁❁❁

پانچویں تاریخ کانفرنس کے شرکاء
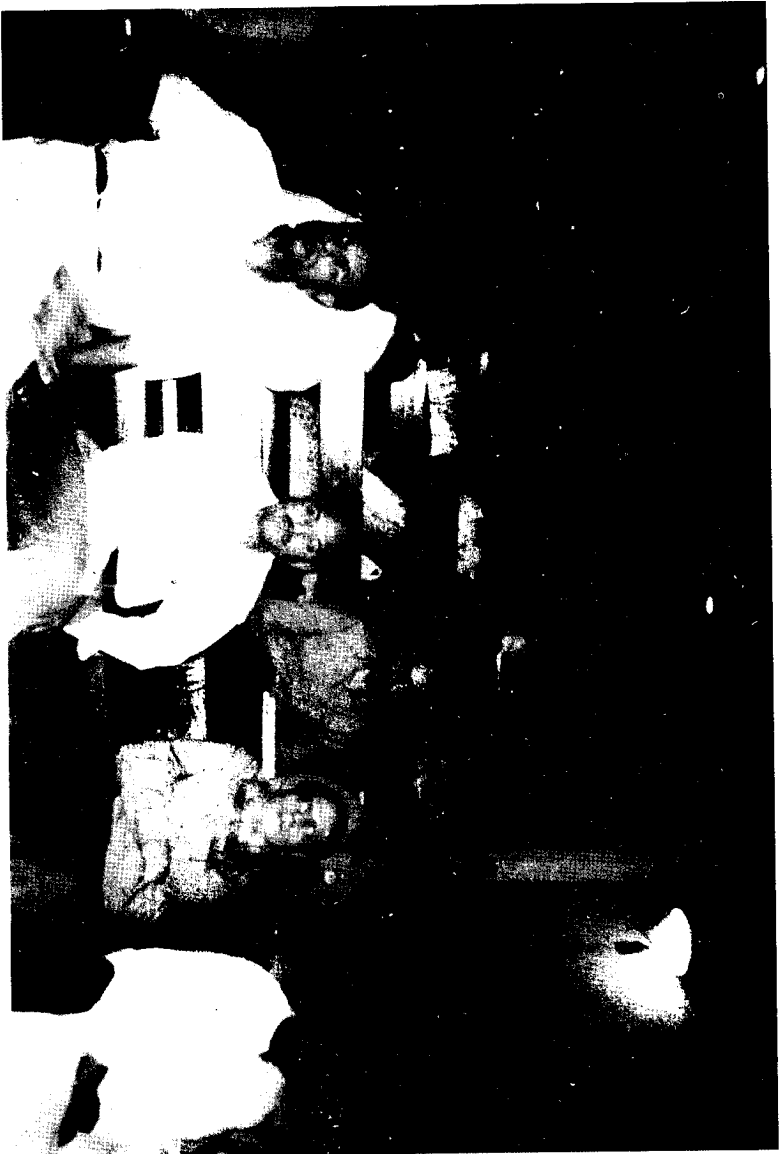
پانچویں تاریخ کانفرنس کے شرکاء

پانچویں تاریخ کانفرنس کے شرکاء

سوانح عمری

کورش اعظم	ہیرلڈلیم	200/-
صلاح الدین ایوبی	ہیرلڈلیم	300/-
عمر خیام	ہیرلڈلیم	200/-
منگول اور ان کا سردار	ہیرلڈلیم	100/-
سلیمان عالی شان	ہیرلڈلیم	250/-
ہنی بال	ہیرلڈلیم	170/-
بابر	ہیرلڈلیم	160/-
نور محل	ہیرلڈلیم	160/-
چنگیز خان	ہیرلڈلیم	100/-
سکندر اعظم	ہیرلڈلیم	240/-
امیر تیمور	ہیرلڈلیم	180/-
تاتاریوں کی یلغار	ہیرلڈلیم	200/-
قسطنطنیہ	ہیرلڈلیم	160/-
تین عظیم فاتح	ہیرلڈلیم	500/-
تین عظیم جنگجو سپہ سالار	ہیرلڈلیم	500/-
شاہ عبداللطیف بھٹائیؒ	ایچ۔ ٹی۔ سورلے	250/-
تین عظیم ڈکٹیٹر	مرتب: اسلم کھوکھر	500/-
اتاترک	مرزا محمد دہلوی	130/-
وہائٹ ہاؤس کے مکین	سویدا حنا	250/-
دنیا کی نامور شخصیات	ایلین بلیک ووڈ	250/-
تاریخ ٹیپو سلطان	سید میر علی کرمانی	300/-
اورنگ زیب عالمگیر	شبلی نعمانی/ ڈاکٹر اوم پرکاش پرشاد	160/-
باطو خان	وائی یان	250/-
ابراہام لنکن	ڈیل کارنیگی	130/-

آپ بیتیاں

رسل کی آپ بیتی	برٹرینڈ رسل/ قاضی جاوید	240/-
میرے ماہ وسال	جاوید شاہین	100/-
آپ بیتی ول ڈیورانٹ اور ایریل ڈیورانٹ	ول ڈیورانٹ/ ایریل ڈیورانٹ	350/-
اس آباد خرابے میں	اختر الایمان	130/-
دردر ٹھوکر کھائے	ڈاکٹر مبارک علی	100\-
باتیں لاہور کی	سوم آنند	130/-
تلاش حق	مہاتما گاندھی	250/-
اپنی کہانی	راجندر پرشاد	450/-
مشرق کی بیٹی	بے نظیر بھٹو	600/-
خانہ بدوش	اجیت کور	100/-
خواب باقی ہیں	آل احمد سرور	170/-
یادوں کی دنیا	یوسف حسین خان	180/-
اعمال نامہ	سر رضا علی	230/-
میری جدوجہد	ہرایڈولف ہٹلر	150/-
تزک ہٹلری	ہرایڈولف ہٹلر	450/-
داستان مسولینی	بینٹو مسولینی	150/-
گورکی کی آپ بیتی	میکسم گورکی	350/-
ٹالسٹائی کی آپ بیتی	لیو ٹالسٹائی	200/-
گیان سنگھ شاطر کی آپ بیتی	گیان سنگھ شاطر	350/-
خود گذشت	ڈاکٹر احمد محی الدین	120/-
لطف اللہ کی آپ بیتی	لطف اللہ	150/-
پنجاب کے سو سال	پرکاش ٹنڈن	150/-
بیرون پنجاب	پرکاش ٹنڈن	150/-
میری داستان	فرحت اللہ بیگ	200/-
غبار زندگی	حسن نواز گردیزی	180/-